فروری 2026 قیمت ₹25

قومی اردو کونسل کا بین الاقوامی جریدہ

www.urducouncil.nic.in

ماہنامہ

اردو دنیا

نئی دہلی

Monthly **URDU DUNIYA**, New Delhi

عالمی کتاب میلہ، نئی دہلی میں قومی اردو کونسل کے اسٹال پر منعقد ہونے والے پروگرام کے شرکا

ماہنامہ اردو دنیا دہلی

Monthly URDU DUNIYA, New Delhi

قومی اردو کونسل کا بین الاقوامی جریدہ

جلد:28، شمارہ:2، فروری 2026

مدیر : ڈاکٹر شمس اقبال

مدیر منتظم: ڈاکٹر شمع کوثر یزدانی

نائب مدیر : نہاں

معاون مدیر : ڈاکٹر فیضان الحق

معاونین : ڈاکٹر جاوید عالم، محمد فرقان عالم

ناشر اور طابع

ڈائرکٹر،قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان

وزارت تعلیم،محکمۂ اعلیٰ تعلیم،حکومت ہند

مطبع:

سالاسار امیجنگ سسٹمس

A-97، سیکٹر 58، نوئیڈا۔ 201301 (یوپی)

مقام اشاعت: دفتر قومی اردو کونسل

کمپوزنگ: محمد امتیاز حسن

ڈیزائننگ: محمد زید

قیمت-/25 روپے سالانہ -/240 روپے

Total Pages:100

- اس شمارے کے قلم کاروں کی آراسے قومی اردو کونسل NCPUL اور اس کے مدیر کا متفق ہونا ضروری نہیں
- ڈرافٹ NCPUL,New Delhi کے نام ارسال کریں

صدر دفتر

فروغ اردو بھون، ایف سی 33/9، انسٹی ٹیوشنل ایریا جسولہ، نئی دہلی-110025

فون:35151993 شعبۂ ادارت: 35152009

ویب سائٹ

http://www.urducouncil.nic.in

E-mail: editor@ncpul.in

urduduniyancpul@yahoo.co.in

شعبۂ فروخت

ویسٹ بلاک-8، ونگ-7 آر کے پورم،نئی دہلی۔110066

فون: 26109746، فیکس:26108159

ای میل: sales@ncpul.in

شاخ:110-7-22،تھرڈ فلور، ساجد یار جنگ کمپلیکس

بلاک نمبر 5-1 پتھر گٹی، حیدرآباد۔500002

فون:040-24415194

مشمولات

اداریہ

- ہماری بات 4

خطوط

- آپ کی بات — قارئین کے تاثرات 5

رپورٹ

- عالمی کتاب میلہ، نئی دہلی — ادارہ 7

گوشۂ خوشونت سنگھ

- سوانحی خاکہ — ادارہ 17
- خوشونت سنگھ کی فکری وادبی معنویت — مسعود احمد 18
- خوشونت سنگھ اور ان کی فکشن نگاری — نوشاد کامران 21
- خوشونت سنگھ کی ادبی خدمات — پرواز احمد 24
- میں کیسے لکھتا ہوں — خوشونت سنگھ، مترجم: جاوید عالم 27

قومی تعلیمی پالیسی 2020

- قومی تعلیمی پالیسی 2020 اور اردو تدریس کے امکانات — سہیل ندوی 34

زبان و تعلیم

- اردو کی تدریس اور ٹیکنالوجی کا استعمال — محمد مشہور احمد 38
- زبان کی تدریس میں پہیلیوں کی اہمیت — بی بی رضا خاتون 41

ادب: زاویے اور جہات

- نظم جدید میں عورت کا تصور — سائرہ خاتون 44

- بنگال کی لوک کہانیوں میں بھوت اور فنتاسی کی جھلکیاں — سلمان فارسی 50
- مصنوعی ذہانت اور تخلیقی ادب — جاوید احمد شاہ 54

شخصیات

- عشق اورنگ آبادی کی شعری جہات — کلیم احمد 56
- سید نقی احمد ارشاد کی شاد شناسی — ناہید نظامی 60
- جوگندر پال کی افسانہ نگاری — مجیب احمد خان 65

بیان تہذیب

- مثنوی 'عکس کوکن': ایک ادبی اور تاریخی کارنامہ — محمد دانش غنی 70

لغت نویسی

- مستشرق اردو لغت نویس — مزمل سرکھوت 73

کتابوں کی دنیا

- تعارف و تبصرہ — ادارہ 76

جہان آگہی

- خبر نامہ — ادارہ 87

ہماری بات

معزز قارئین!

گذشتہ شمارے میں میں نے کتابوں سے متعلق کچھ باتیں عرض کی تھیں۔ اسی سلسلے کو آگے بڑھاتے ہوئے آج کتاب میلے کے تعلق سے کچھ کہنا چاہتا ہوں۔ کتابوں کی اہمیت تسلیم کرنے کے بعد یہ سمجھنا مشکل نہیں کہ کتاب میلوں کا انعقاد ہماری علمی اور تہذیبی ترقی کے لیے کتنا اہم ہے۔ کتاب میلے محض کتابوں کے اسٹال کی سجاوٹ نہیں، بلکہ ایک ہی شہر اور ایک ہی مقام پر بیک وقت علوم و فنون کی مختلف کتابوں کو یکجا کر دینا ہے۔ جب مختلف موضوعات (زبان، ادب، سائنس، جغرافیہ، نفسیات، سماجیات وسیاسیات وغیرہ) پر ایک جگہ کتابیں موجود ہوں تو مختلف میدانوں کے قارئین بھی جمع ہوں گے۔ اس طرح کتاب میلے علمی وفکری اتحاد، ہم آہنگی اور اجتماعیت کا بھی وسیلہ بن جاتے ہیں۔ جہاں زبان کی قید وبند سے آزاد ہوکر لوگ ایک دوسرے سے اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہیں۔

عالمی سطح پر کتاب میلے کی روایت بہت قدیم ہے۔ اس کی ابتدا قریب چھ سو سال قبل (1485) فرینکفرٹ، جرمنی میں ہوئی۔ لیکن ہندوستان میں اس کی باضابطہ شروعات کلکتہ (1918) سے ہوئی۔ ہندوستان میں عالمی سطح پر کتاب میلے کا انعقاد 'نئی دہلی عالمی کتاب میلہ' کی صورت میں 1972 میں عمل میں آیا۔ وقت گزرنے کے ساتھ ہندوستان میں کتاب میلوں کی مقبولیت میں اضافہ ہوتا گیا۔ مرکزی ومختلف صوبائی حکومتوں، سرکاری اداروں اور تنظیموں کی جانب سے الگ الگ شہروں میں ان کا انعقاد کیا جانے لگا۔ بڑوں کے ساتھ بچوں کو بھی کتابوں سے قریب کرنے میں ان کتاب میلوں نے نہایت اہم کردار ادا کیا۔

کتاب میلوں سے حاصل ہونے والے اہم فوائد میں علمی وتعلیمی فضا سازی کے علاوہ، تجارت کا فروغ، نشر واشاعت کی سمجھ، نمائش کا سلیقہ، تہذیبوں سے آشنائی اور عالمی سطح پر شناخت بنانے کے مواقع ہیں۔ گویا کتاب میلے ایسے پلیٹ فارم کی حیثیت رکھتے ہیں جہاں ایک دنیا آباد ہوتی ہے۔ اس دنیا کا تعلق علم وآگہی سے ہوتا ہے۔ یہاں کتابوں کی خریداری کا مقصد محض خرید وفروخت کو بڑھاوا دینا نہیں بلکہ علم دوستی کا ثبوت پیش کرنا ہے۔ ذہنی آبیاری اور نئے نئے خیالات کی تشکیل ان کتاب میلوں کے اہم مقاصد ہیں۔ کتابیں اگر فرد کی علمی وتہذیبی ترقی کا باعث ہوتی ہیں تو کتاب میلے اجتماعی طور پر ایک معاشرے کی علمی، تعلیمی، تہذیبی اور ذہنی ترقی کا وسیلہ بنتے ہیں۔

کتاب میلوں کی ایک خاص بات یہ بھی ہے کہ ان کے ذریعہ مصنفین اور قارئین کے رابطے مضبوط ہوتے ہیں۔ کتاب میلوں مختلف علمی وادبی سرگرمیاں قارئین کو اپنے قلم کاروں سے قریب لانے، انھیں دیکھنے، سننے اور ملاقات کا موقع فراہم کرتے ہیں۔ اس طرح کتاب میلے کتابوں کے ساتھ ان کے لکھنے اور پڑھنے والوں کو ایک پلیٹ فارم پر جمع کرکے دونوں کے درمیان موجود اجنبی فاصلوں کو پر کرنے میں معاون ہوتے ہیں۔

جیسا کہ پہلے بھی ذکر کیا جا چکا ہے کہ قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی کا مقصد زبان وادب کو فروغ دینا ہے اور اس ضمن میں کونسل مختلف زاویوں سے اپنی خدمات انجام دیتی آئی ہے۔ کونسل نے کتابوں کی نشر واشاعت کے ساتھ ان کی نمائش اور کتاب میلوں کے انعقاد کا بھی اہتمام کیا ہے۔ اسی طرح کونسل نے کتاب کلچر کو فروغ دیتے ہوئے مختلف میلوں میں اپنی شرکت کو بھی لازمی تصور کیا ہے۔ حالیہ دنوں میں عالمی کتاب میلوں میں دبئی، شارجہ، فرینکفرٹ اور قومی سطح پر منعقد ہونے والے کتاب میلوں میں چنار، پٹنہ، اورنگ آباد، ویدیشہ، گورکھپور، ہریانہ، کانپور، ناگپور، پونے، سورت، کولکاتا، حیدرآباد، لکھنو، علی گڑھ اور نئی دہلی جیسے شہروں میں اپنی شرکت سے کونسل نے قارئین کو اردو زبان سے قریب کرنے میں اہم کردار ادا کیا ہے۔ گزشتہ برس کی طرح امسال بھی عالمی کتاب میلہ، نئی دہلی 2026 میں کونسل نے اپنے اسٹال پر مختلف موضوعات پر مذاکروں کا اہتمام کرکے ایک نیا ٹرینڈ سیٹ کیا ہے۔ ان مذاکروں میں نئی نسل کی شرکت اور قومی تعلیمی پالیسی 2020، انڈین نالج سسٹم وانڈین ملٹری سے متعلق موضوعات پر مذاکروں کا اہتمام قابل ذکر ہیں۔ شمارے میں میلے کی تفصیلی رپورٹ پیش کی جارہی ہے۔ یہ شمارہ اس اعتبار سے بھی خاص ہے کہ اس میں دیگر علمی وادبی موضوعات کے ساتھ ہندوستان کے معروف قلم کار 'خوشونت سنگھ' پر ایک خصوصی گوشہ بھی شامل ہے۔ امید ہے آپ اسے پسند فرمائیں گے اور اپنے تاثرات سے نوازیں گے۔

شمس اقبال

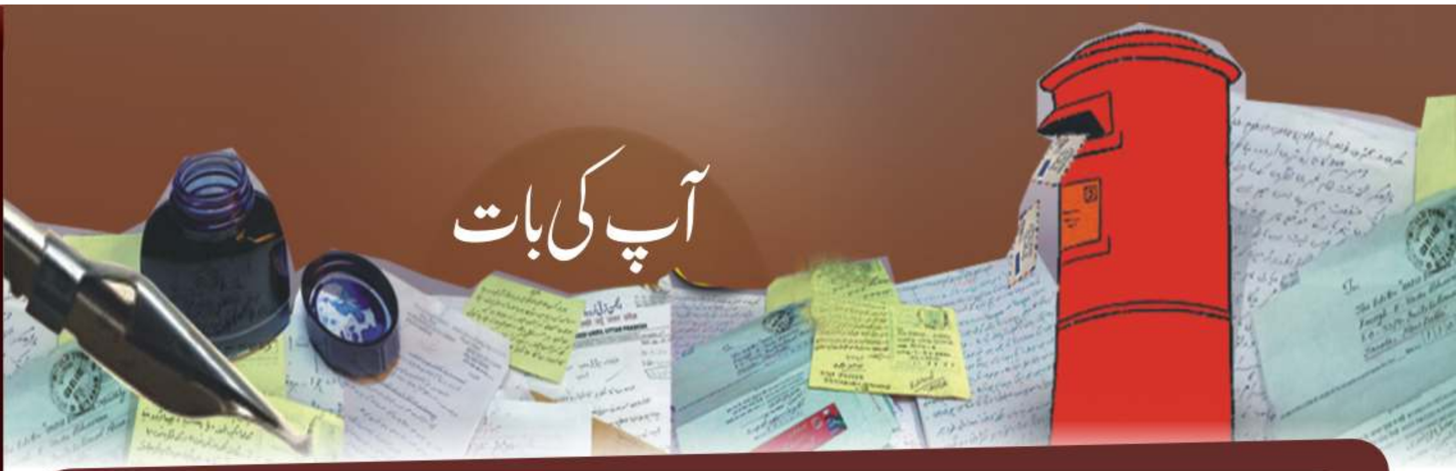

آپ کی بات

ماہنامہ'اردو دنیا' میں 'آپ کی بات' کے تحت قارئین کے تاثرات شائع کرنے کا مقصد رسالے کے مشمولات کے تئیں قارئین کی آرا سے واقفیت حاصل کرنا ہے۔ رسالے کے قلم کاروں اور قارئین سے گذارش ہے کہ مشمولات کے حوالے سے اپنے تاثرات ارسال کرنے کی زحمت کریں اور نئے موضوعات، مسائل، علاقوں اور ادبی وعلمی شخصیات سے بھی مطلع فرمائیں۔ خطوط کی شکل میں موصول ہونے والے آپ کے یہ تاثرات ہمارے لیے بے حد اہم ہیں کیوں کہ ہمیں ان سے رسالے کو بہتر بنانے میں مدد ملتی ہے۔ (ادارہ)

✍ اردو دنیا کا جنوری 2026 کا شمارہ ملا۔ یہ شمارہ اپنے متنوع مضامین اور نکھری ہوئی باسلیقہ ادارت کے سبب مجھے بہت پسند آیا۔ علی گڑھ کتاب میلے کی مفصل روداد اردو ناظرین، زائرین نمائش اور اب رسالے کے قارئین کے لیے بہت خوشنما اورحوصلہ افزاہے۔ تمام ادبی مشمولات قابل تعریف ہیں۔ فلم اداکار دھرمیندر کے حوالے سے لکھے گئے فیچرز میں فرحان حنیف وارثی اور منتظر قائمی کی تحریریں بہت اچھی لگیں۔ قانونی صحافت کے عنوان سے خواجہ عبدالمنتقم صاحب نے ایک الگ اور جدید موضوع پر قلم اٹھایا ہے۔

✍ **ف۔س۔اعجاز**: انشا پبلیکیشنس، B-25، ذکریا اسٹریٹ، کولکاتا، (مغربی بنگال)

✍ ماہنامہ'اردو دنیا' جنوری 2026 کا شمارہ وقت پر موصول ہوا۔ اردو زبان وادب کی ترویج وترقی کے لیے کونسل کا مسلسل قابل قدر کارنامہ نہ صرف زبان وادب کو زندہ رکھنے بلکہ نئی نسلوں میں ادب سے دلچسپی اور محبت کی شمع روشن کرنے میں کافی مددگار ثابت ہوا ہے۔ رسالے کے تمام مقالات و مضامین جدید تر موضوعات پر مبنی ہیں۔ جن میں جدت و نیا پن ہے اور خاص بات یہ ہے کہ اپنے موضوع کے مطابق کھرے ثابت ہوتے ہیں۔ جو اس بات کا ثبوت ہیں کہ عصر حاضر کی تمام تر سرگرمیوں کا احاطہ کرنا 'اردو دنیا' کا مقصد اولین ہے۔ مجموعی طور پر ماہنامہ'اردو دنیا' کا پیش نظر شمارہ قابل استفادہ ہے۔ جس کے لیے میں مدیر کے ساتھ ادارتی ٹیم کو بھی مبارکباد پیش کرتا ہوں۔

✍ **ڈاکٹر سید محمد عارف**: الہ آباد یونیورسٹی، (یوپی)

✍ قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان (NCPUL) کا بین الاقوامی جریدہ'اردو دنیا' اپنے تازہ ترین شمارے (جنوری 2026) کے ساتھ اردو بستیوں میں علم وادب کی نئی روشنی بکھیر رہا ہے۔ 98 صفحات پر مشتمل یہ شمارہ نہ صرف معلوماتی ہے بلکہ اردو کے روشن مستقبل کی دستاویزی شہادت بھی پیش کرتا ہے۔

شمارے کا آغاز علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں منعقدہ نو روزہ (نومبر 2025) کتاب میلے کی ایک جامع رپورٹ سے ہوتا ہے۔ تیرہ صفحات پر پھیلی یہ رپورٹ محض ایک روداد نہیں، بلکہ اردو کے 'کتاب کلچر' کے احیا کی کہانی ہے۔

ڈاکٹر شمس اقبال کی قیادت میں لاکھوں روپے کی کتب کی فروخت نے یہ ثابت کردیا کہ اردو قارئین کی تعداد میں کمی نہیں، بلکہ اضافہ ہو رہا ہے۔

شمارے میں شامل مقالات اردو ادب کے مختلف پہلوؤں کا احاطہ کرتے ہیں۔ ان میں عصری مسائل، کلاسیکی ورثہ اور شخصیات سے متعلق مضامین موجود ہیں۔ محمد مہتاب عالم کا مضمون 'امتزاجی تعلیم' اور محمد اویس ملک کا مقالہ 'ماحولیاتی تنقید' اردو کو جدید عالمی تناظر سے جوڑتے ہیں۔

شبیب نجمی نے مراثی انیس کے نسائی کرداروں اور احسان عالم نے شرر کی تاریخی ناول نگاری کے بیانیے کو خوبصورتی سے واشگاف کیا ہے۔ نیر مسعود، ندا فاضلی، منشاء الرحمٰن خان منشا، قیصر الجعفری اور ڈاکٹر بشریٰ رحمٰن پر لکھے گئے مضامین جریدے کی تحقیقی ثقاہت میں اضافہ کرتے ہیں۔ اس شمارے کی ایک خاص بات اردو کا عوامی اور ثقافتی رشتہ ہے۔

دھرم پاجی (دھرمیندر) کو خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے فرحان حنیف وارثی، منتظر قائمی اور محی الدین عبداللطیف نے بالی وڈ کے لیجنڈ اداکار دھرمیندر کی اردو نوازی اور انسانیت کو موضوع بنا کر ایک نئی جہت متعارف کرائی گئی ہے۔ وسیم احمد کا مضمون 'انارکلی' اور 'مغل اعظم' کا تقابلی مطالعہ فلمی وادبی ذوق رکھنے والوں کے لیے ایک بہترین تحفہ ہے۔

خواجہ عبدالمنتقم نے 'قانونی صحافت' کے امکانات روشن کیے ہیں، جبکہ معصوم

مرادآبادی نے حال ہی میں بچھڑنے والے پروفیسر دیوان حنان خان سے متعلق تعزیتی تحریر پیش کی ہے۔ مظہر الزمان خان سے گفتگو اور ڈاکٹر سعید عالم کا 'یادیں باتیں' پر تبصرہ جریدے کی ادبی وقعت کو مزید مستحکم کرتا ہے۔

'اردو دنیا' کا یہ شمارہ اپنی بہترین ترتیب، متنوع موضوعات اور معیاری طباعت کے باعث ہر اردو دوست کے مطالعے کی میز کی زینت بننے کے قابل ہے۔ یہ شمارہ اس بات کی علامت ہے کہ اردو زبان کا مستقبل اس کے جاں نثاروں کی بدولت بے حد تابناک ہے۔

زبیر خان سعیدی: F-33، شاہین باغ جامعہ نگر، نئی دہلی

اردو دنیا جنوری 2026 کا شمارہ موصول ہوا۔ اپنے علمی، ادبی اور دیگر مشمولات کے سبب اس شمارے نے پہلی نظر میں توجہ حاصل کر لی۔ اداریے کے تحت رسالے کے مدیر ڈاکٹر شمس اقبال نے کتابوں کے حوالے سے نہایت پُر مغز خیالات کا اظہار کیا ہے۔ اس کے مطالعے سے کئی ایسے نکات سامنے آئے جن سے اندازہ ہوتا ہے کہ کتابوں نے انسانوں کی ترقی اور کامیابی میں مرکزی کردار ادا کیا ہے۔ مدیر محترم نے کتابوں کے تئیں نئی نسل کی بدلتی دلچسپیوں پر بھی گہرائی سے اظہار خیال کیا ہے اور انٹرنیٹ، سوشل میڈیا و ڈیجیٹل پلیٹ فارم کے سبب پیدا ہونے والی تبدیلیوں پر بھی اُن کی گہری نظر ہے۔ یہی وجہ ہے کہ انھوں نے قارئین کے بدلتے ذوق کے مطابق کتابوں کی تیاری کی طرف توجہ دلائی ہے۔ رسالے کے مشمولات میں علی گڑھ اردو کتاب میلے کے حوالے سے ایک نہایت طویل رپورٹ بھی شامل ہے جس سے علی گڑھ اردو کتاب میلے کی تمام سرگرمیوں سے واقفیت ہو جاتی ہے اور اندازہ ہوتا ہے کہ قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان نے کتاب کلچر کو فروغ دینے میں کتنی اہم خدمت انجام دی ہے۔

زبان و تعلیم، ادب زاویے اور جہات اور شخصیات کے علاوہ فلم اور اردو کے تعلق سے نہایت اہم مضامین شامل ہیں جن کا مطالعہ کرتے ہوئے نئے نکات سامنے آتے ہیں۔ اس رسالے کا ایک اہم حصہ گوشۂ دھرمیندر ہے جس میں بالی ووڈ کے ستارہ دھرمیندر کی شخصیت اور اردو دوستی سے متعلق تین مضامین شامل ہیں۔ یہ مضامین ثابت کرتے ہیں کہ اردو نے سنیما میں اپنی کتنی مضبوط بنائی ہے اور دھرمیندر کو اس زبان سے کتنا گہرا عشق تھا۔ صحافت، یادرفتگاں، انٹرویو اور طباعت کے حوالے سے مضامین بھی قابل مطالعہ ہیں۔ رسالے کے ایک اہم شمارے کو تشکیل دینے کے لیے میں قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی اور پوری ادارتی ٹیم کو مبارکباد پیش کرتا ہوں۔

تسنیم: مادھوپور، بہار

ماہنامہ اردو دنیا دسمبر 2025 کا شمارہ مطالعے سے گزرا۔ اس شمارے کے جملہ مشمولات، زبان و ادب اور تنقید کے نئے پہلوؤں پر مشتمل ہیں۔ تاہم اس شمارے کا جو مضمون جدت اور تازگی لیے ہوئے ہے وہ عیدگاہ کالج، جموں و کشمیر میں برسر کار ڈاکٹر شاہ فیصل کا تحریر کردہ ہے۔ اس مضمون کا عنوان 'ڈاکٹر راہی معصوم رضا: گنگا جمنی تہذیب کے امین' ہے۔ جیسا کہ عنوان ہی سے ظاہر ہے کہ راہی معصوم رضا ہندوستان کی مشترکہ تہذیب اور گنگا جمنی تمدن کے علمبردار رہے ہیں۔ ان کی تحریریں خواہ شعری ہوں یا نثری اردو، ہندی کے امتزاج کی بھی خوبصورت ترین مثال ہیں۔ اس طرح کے اہم، منفرد اور نئے انداز کے موضوعات پر مضامین شامل کرنا قومی کونسل کی ترجیحات میں شامل ہے۔ یہ مضمون بھی اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے۔

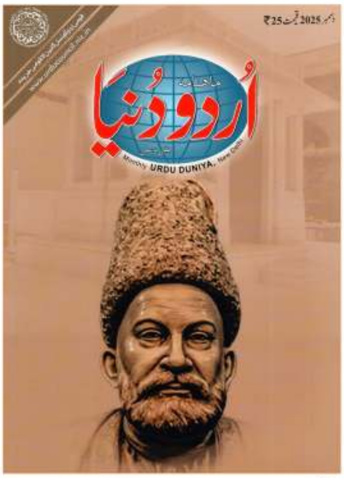

اس شمارے کا اداریہ بھی غیر معمولی اہمیت کا حامل ہے۔ جس میں اردو زبان وادب کی ممتاز و معروف شخصیتوں کے فن اور اُن کی زندگی کے اہم گوشوں پر اجمالاً گفتگو کی گئی ہے۔ اس شمارے کے دیگر مشمولات بھی اہم ہیں۔ مثلاً رضیہ پروین کا تحریر کردہ مضمون 'فضا ابن فیضی: مجھ کو مرے سخن سے پہچانو' بھی اپنے انداز کا ایک منفرد مضمون ہے۔ علاوہ ازیں ریاض توحیدی کی تحریر 'اقبال مجید کی افسانہ نگاری' اقبال مجید کے فن اور اُن کی افسانوی کائنات کی تفہیم میں ہماری مدد کرتی ہے۔

اس شمارے میں رئیس انور کا مضمون 'اردو شاعری میں بنارس کی جھلکیاں' خاصا اہم ہے کہ اس میں شہر بنارس کی اہمیت اور اس کی قدیم تہذیبی و ثقافتی عظمت پر تفصیل سے روشنی ڈالی گئی ہے۔ اس طرح اس شمارے کے مطالعے کے بعد یہ محسوس ہوتا ہے کہ اس میں شامل تمام مضامین اپنی لسانی و ادبی انفرادیت کے اعتبار سے تو اہم ہیں ہی، جدت اور تازگی کے لحاظ سے بھی قارئین کے ذہن و دماغ کو تازہ کرتے ہیں۔

اس شمارے کے آخری صفحات میں تبصرہ و تعارف کے عنوان کے تحت جن چند لیکن اہم ترین کتابوں پر تبصراتی نوٹ شامل کیے گئے ہیں وہ بھی اس شمارے کی قدر و قیمت اور وقعت میں اضافہ کرتے ہیں۔ مثلاً قومی کونسل کی حالیہ تصنیف 'ویر ساورکر اور تقسیم ہند کا المیہ' پر ڈاکٹر قرۃ العین کا تبصرہ شامل ہے جو کتاب کی اہمیت اور اس کی غیر معمولی افادیت پر اجمالاً لیکن اطمینان بخش طریقے سے روشنی ڈالتا ہے۔

اسی طرح اقتدار حسین خان کی تصنیف کردہ کتاب 'اردو صرف و نحو' پر عبدالرحمٰن شافی کا تبصرہ بھی پڑھے جانے سے تعلق رکھتا ہے۔ ظاہر ہے یہ کتاب بھی قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کی شائع کردہ اہم کتابوں میں سے ایک ہے۔ کتاب کا تعارف اور اس میں شامل بحثوں کا جس جامع انداز میں ذکر اس تبصرے میں ملتا ہے وہ یقیناً ادبی دنیا میں اس کتاب کی خاطر خواہ پذیرائی میں معاون ثابت ہوگا۔

اس شمارے میں شامل ایک اہم تبصرہ 'کلیم عاجز کی شاعری' پر ہے جس کے مصنف ڈاکٹر محمد رضوان ہیں۔ اس کتاب کا تعارف محمد یونس انصاری نے کرایا ہے جس میں کتاب کی معنویت اور اس کی وقعت پر بڑے ہی موزوں انداز میں روشنی ڈالی گئی ہے۔ غرض کہ اردو دنیا کا دسمبر 2025 کا یہ شمارہ اپنی علمی اہمیت کے ساتھ ساتھ اپنے تنوع اور جدت کے اعتبار سے بھی ایک دستاویزی حیثیت رکھتا ہے۔

اردو دنیا اور قومی کونسل کی ادارتی ٹیم کے ہم ممنون ہیں کہ وہ اس نوع کے اہم اور جدید موضوعات اور مسائل پر مشتمل مضامین کی اشاعت سے اردو کی ادبی دنیا میں نئے مباحث اور نئے موضوعات کی پیشکش کو ترجیح دیتی ہے۔

محمد امین: نالندہ، بہار

ادارہ

عالمی کتاب میلہ، نئی دہلی 2026

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کا مقصد اردو زبان کو فروغ دینا ہے۔ اس سلسلے میں کتابوں کی اشاعت کے ساتھ ان کی نمائش اور کتاب میلوں کا اہتمام بھی کونسل کی ترجیحات میں شامل ہیں۔ اسی طرح قومی اور بین الاقوامی سطح پر منعقد ہونے والے کتاب میلوں میں شرکت کو بھی کونسل ضروری تصور کرتی ہے۔ اسی مقصد کے تحت حالیہ دنوں میں فرینکفرٹ، شارجہ اور دبئی سے لے کر پٹنہ، لکھنؤ، اورنگ آباد اور نئی دہلی کے کتاب میلوں میں اس نے شرکت کی ہے۔ نئی دہلی عالمی کتاب میلہ 2026 میں کونسل کی سرگرم شرکت اس اعتبار سے بھی خاص ہے کہ اس میں کتابوں کی نمائش کے ساتھ اسٹال پر ہر دن مختلف موضوعات پر مذاکروں کا اہتمام کیا گیا۔ جس میں معروف قلم کاروں کے ساتھ نئی نسل نے بھی شرکت کی۔ پیش ہے اس کی یومیہ رپورٹ۔ —ادارہ

10 جنوری، 2026

قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان کے زیرِ اہتمام عالمی کتاب میلہ 2026 میں مطالعے کی اہمیت پر ایک اہم مذاکرے کا انعقاد کیا گیا۔ اس مذاکرے میں جناب معصوم مرادآبادی، ڈاکٹر خالد علوی، پروفیسر مشتاق عالم قادری اور ڈاکٹر ابراہیم افسر بطور پینلسٹ شریک ہوئے، جبکہ پروگرام کی نظامت ڈاکٹر احسن ایوبی نے انجام دی۔ جناب معصوم مرادآبادی نے کہا کہ مطالعے کے بغیر کوئی بھی انسان باشعور نہیں ہوسکتا۔ اپنی سوچ میں وسعت اور تنوع پیدا کرنے کے ساتھ ساتھ نئی چیزوں سے آگاہی حاصل کرنے کے لیے مطالعہ ناگزیر ہے۔ انھوں نے کہا کہ اگرچہ یہ ڈیجیٹل دور ہے اور لوگوں کے پاس وقت کی کمی ہے، لیکن آج کتابوں تک لوگوں کی رسائی پہلے سے کہیں زیادہ ہوچکی ہے اور معیاری کتابوں کا مطالعہ گھر بیٹھے بھی ممکن ہے۔ انھوں نے مزید کہا کہ کتابیں انھیں موضوعات پر لکھی جانی چاہئیں جن کی واقعی ضرورت ہو، پامال موضوعات پر کتابیں لکھنا وقت کا ضیاع ہے۔ ڈاکٹر خالد علوی نے کہا کہ ماضی میں لوگوں میں مطالعے کی عادت ہوا کرتی تھی اور گھروں میں میزوں پر مختلف رسائل اور اخبارات رکھے رہتے تھے، جس کی وجہ سے گھر والوں میں مطالعے کا ذوق خود بخود پیدا ہوجاتا تھا۔ انھوں نے کہا کہ کتاب کا کوئی نعم البدل نہیں ہے، جو شخص مطالعہ کرتا ہے وہ دوسروں سے آگے رہتا ہے۔ آگے بڑھنے اور زندگی میں کامیابی حاصل کرنے کے لیے مطالعہ ضروری ہے۔ کتابوں پر گفتگو کرتے ہوئے انھوں نے کہا کہ آج اچھی اور معیاری کتابوں کی کمی محسوس کی جا رہی ہے، اس لیے ضروری ہے کہ اچھے اور اہم موضوعات پر کتابیں لکھی جائیں۔ پروفیسر مشتاق عالم قادری نے کہا کہ کتاب اور مطالعہ لازم وملزوم ہیں۔ انھوں نے کہا کہ ٹیکسٹ بک کا سب سے بڑا فائدہ یہ ہے کہ قاری اسے بار بار پڑھ سکتا ہے اور اہم نکات کی نشاندہی بھی کرسکتا ہے، جو مطالعے کو مؤثر بناتا ہے۔ انھوں نے اس بات کی نشاندہی کی کہ موبائل فون اور جدید ٹیکنالوجی کی وجہ سے خاص طور پر نوجوانوں میں

مطالعے کا رجحان کم ہوا ہے، تاہم اس کے باوجود کتاب کی اہمیت اپنی جگہ مسلم ہے۔ ڈاکٹر ابراہیم افسر نے کہا کہ مطالعہ جتنا زیادہ ہوگا، انسان کے اندر اتنا ہی اعتماد، شعور اور فکری پختگی پیدا ہوگی۔ انھوں نے اس بات پر زور دیا کہ مطالعہ نہ صرف علم میں اضافہ کرتا ہے بلکہ انسان کی شخصیت کو بھی نکھارتا ہے۔

مقررین نے اس بات پر اتفاق کیا کہ مطالعے کے فروغ کے بغیر ایک صحت مند اور باشعور معاشرے کی تشکیل ممکن نہیں، اس لیے نئی نسل کو کتابوں سے جوڑنا وقت کی اہم ضرورت ہے۔

11 جنوری، 2026

قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان (این سی پی یو ایل) کے زیر اہتمام عالمی کتاب میلہ، نئی دہلی کے دوسرے دن دو اہم ادبی مذاکروں بعنوان 'نوجوان شاعروں سے ملاقات' اور 'شامِ افسانہ' کا انعقاد عمل میں آیا، جن میں ادب سے وابستہ اہلِ قلم، طلبہ اور شائقینِ ادب کی بڑی تعداد نے شرکت کی۔ 'شامِ افسانہ' کے عنوان سے منعقدہ مذاکرے میں ڈاکٹر نگار عظیم، ڈاکٹر شبانہ نذیر، ڈاکٹر رخشندہ روحی مہدی اور ڈاکٹر شہناز رحمٰن بطور پینلسٹ شریک ہوئیں، جبکہ نظامت کے فرائض ڈاکٹر ذاکر فیضی نے انجام دیے۔ مہمان مقررین نے افسانے کی تخلیق، اس کے فنی و فکری پہلوؤں اور عصری تقاضوں پر تفصیل سے اظہارِ خیال کیا۔ اس موقعے پر ڈاکٹر نگار عظیم نے کہا کہ افسانہ زندگی کی علامت ہے اور اسے خانوں میں تقسیم نہیں کیا جا سکتا، البتہ وقت کے ساتھ اس کی تکنیک میں تبدیلی آئی ہے۔ انھوں نے کہا کہ افسانہ خواہ علامتی، استعاراتی یا مابعد جدید تناظر میں لکھا گیا ہو، قاری پہچان لیتا ہے کہ کون سا افسانہ دیرپا ہے۔ نوجوان افسانہ نگاروں کے حوالے سے انھوں نے کہا کہ ان کی تحریریں مجموعی طور پر تسلی بخش ہیں، تاہم عجلت پسندی سے بچنے کی ضرورت ہے۔ انھوں نے اس بات پر زور دیا کہ افسانہ اگر سماجی مسائل سے جڑا ہو تو عمر کی قید سے آزاد ہوتا ہے۔ سوشل میڈیا کی مقبولیت کو معیار قرار نہ دیتے ہوئے انھوں نے کہا کہ فن ایک عبادت ہے اور اس کا ثمرہ فوری طور پر حاصل نہیں ہوتا۔ ڈاکٹر شبانہ نذیر نے کہا کہ افسانہ کئی اجزا کا مجموعہ ہے جس کے کسی ایک جز کو علاحدہ نہیں کیا جا سکتا۔ عمدہ افسانہ وہی ہے جو قاری کے ذہن میں محفوظ رہ جائے۔ انھوں نے ذکیہ مشہدی کو ایک اہم افسانہ نگار قرار دیتے ہوئے کہا کہ ان کے افسانوں کے موضوعات اور پیشکش منفرد ہیں۔ سوشل میڈیا پر لکھے جانے والے افسانوں کے حوالے سے انھوں نے کہا کہ ہر افسانے کو ایک ہی زمرے میں رکھنا درست نہیں، خواہ وہ پرنٹ فارم میں ہو یا ڈیجیٹل پلیٹ فارم پر شیئر کیا گیا ہو۔ ڈاکٹر رخشندہ روحی مہدی نے کہا کہ موجودہ دور میں قارئین کی تعداد میں کمی ضرور آئی ہے لیکن اس سے زیادہ مایوس ہونے کی ضرورت نہیں ہے، مطالعے کے لیے اب بہت نئے پلیٹ فارم دستیاب ہیں اور اچھے قاری آج بھی موجود ہیں۔ انھوں نے اردو اور ہندی افسانوں کے موازنے سے احتراز پر زور دیتے ہوئے کہا کہ ہر زبان کا اپنا اسلوب اور مزاج ہوتا ہے۔ ڈاکٹر شہناز رحمٰن نے کہا کہ غیر جانبدار اور معیاری تنقید ہی ادب کو آگے بڑھاتی ہے۔ ان کے مطابق افسانے کی قدر و قیمت کا تعین ذاتی پسند و ناپسند کے بجائے فنی اور فکری پیمانوں پر ہونا چاہیے۔ انھوں

نے مزید کہا کہ نئی نسل کے افسانہ نگاروں کو تنقید سے خوف زدہ ہونے کے بجائے اسے تخلیقی ارتقا کا ذریعہ بنانا چاہیے۔ مذاکرے کے اختتام پر تمام افسانہ نگاروں نے اپنے افسانوں سے منتخب اقتباسات بھی پیش کیے۔

اس سے قبل 'نوجوان شاعروں سے ملاقات' کے عنوان سے منعقدہ مذاکرے میں سالم سلیم، خوشبو پروین اور سفیر صدیقی نے شرکت کی، جبکہ نظامت کے فرائض ڈاکٹر شاداب شمیم نے انجام دیے۔ اس موقعے پر سالم سلیم نے شاعری میں زبان کی اہمیت پر زور دیتے ہوئے کہا کہ اچھی زبان کے بغیر معیاری شاعری ممکن نہیں۔ انھوں نے مشاعروں کے حوالے سے گفتگو کرتے ہوئے کہا کہ مشاعرے ماضی میں بھی اردو زبان وادب کے فروغ میں اہم کردار ادا کرتے رہے ہیں اور آج بھی لوگوں کو اردو زبان وادب سے قریب کر رہے ہیں۔ خوشبو پروین نے کہا کہ شاعری کا شوق انھیں بچپن سے تھا، جس کا آغاز مدرسے سے ہوا اور یونیورسٹی تک پہنچتے پہنچتے شاعری ان کی شناخت بن گئی۔ انھوں نے کہا کہ شاعری میں معیار سے کوئی سمجھوتہ نہیں ہونا چاہیے۔ سفیر صدیقی نے کہا کہ شاعری ایک فطری صلاحیت ہے اور موزونیت کے بغیر اچھی شاعری ممکن نہیں۔ انھوں نے غزل کو اپنی پسندیدہ صنف قرار دیتے ہوئے کہا کہ وہ غزل میں ہی تجربات کرتے ہیں۔ سوشل میڈیا کی مقبولیت پر بات کرتے ہوئے انھوں نے کہا کہ مقبول ہونا معیار کی ضمانت نہیں۔ مذاکرے کے اختتام پر نوجوان شاعروں نے اپنے منتخب اشعار بھی سنائے، جنھیں حاضرین نے بے حد پسند کیا۔

12 جنوری، 2026

عالمی کتاب میلہ، نئی دہلی میں قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان کے زیر اہتمام آج دو اہم ادبی پروگراموں کا انعقاد عمل میں آیا۔ پہلا پروگرام ''اکیسویں صدی میں ہندوستانی تہذیب: اردو فکشن کے حوالے سے'' جبکہ دوسرا پروگرام ''بزمِ سخن'' کے نام سے منعقد ہوا۔ دونوں پروگراموں میں ادبی شخصیات، محققین، طلبہ اور شائقینِ ادب نے بڑی تعداد میں شرکت کی۔

''اکیسویں صدی میں ہندوستانی تہذیب: اردو فکشن کے حوالے سے'' کے عنوان سے منعقدہ مذاکرے میں پروفیسر خالد اشرف، پروفیسر فاروق بخشی، پروفیسر ابوبکر عباد بطور پینلسٹ شریک ہوئے جبکہ ڈاکٹر عبدالرزاق زیادی نے اس مذاکرے کی نظامت کی۔ مذاکرے کے دوران مقررین نے اردو فکشن میں تہذیب وتمدن کی عکاسی، بدلتے سماجی رویوں اور عصری تقاضوں پر تفصیلی گفتگو کی۔ پروفیسر خالد اشرف نے تہذیب و تمدن پر گفتگو کرتے ہوئے کہا کہ ہندوستانی تہذیب کی بنیادی خصوصیت اس کی ہمہ گیری، رواداری اور "جیو اور جینے دو" کے جذبے میں مضمر ہے۔ انھوں نے کہا کہ ہندوستانی تہذیب نے وہ چیزیں بھی قبول کیں جو اس کے مزاج سے ہم آہنگ نہیں تھیں اور یہی اس کی وسعت قلبی کی دلیل ہے۔ پروفیسر فاروق بخشی نے گلوبلائزیشن کے تناظر میں گفتگو کرتے ہوئے کہا کہ جہاں اس کے کچھ فوائد ہیں وہیں سماج پر اس کے کچھ منفی اثرات بھی مرتب ہوئے ہیں، اور خاص طور پر ہماری تہذیب اس سے زیادہ متاثر ہوئی ہے۔ ان کے مطابق افسانوں اور فکشن میں ہماری تہذیبی شناخت آج بھی مختلف رنگوں میں جلوہ گر ہے۔ خورشید عالم، ابن کنول اور ثروت خان وغیرہ کے فکشن کا حوالہ دیتے ہوئے کہا کہ ان کے یہاں ہندوستانی تہذیب اور ثقافت بھرپور انداز میں پیش کی گئی ہے۔ انھوں نے مزید کہا کہ اردو فکشن نے ہمیشہ تہذیبی قدروں کو محفوظ رکھنے میں اہم کردار ادا کیا ہے۔ پروفیسر ابوبکر عباد نے کہا

کہ اگرچہ ایک وقت تھا جب ہندوستانی تہذیب مغربی تہذیب سے زیادہ متاثر نظر آتی تھی، لیکن موجودہ دور میں صورت حال کسی حد تک بدل رہی ہے۔ انھوں نے کہا کہ پریم چند، راشد الخیری اور دیگر افسانہ نگاروں کے یہاں ہندوستانی تہذیب، رسوم، رسمیات اور سماجی اقدار واضح طور پر نظر آتی ہیں۔ انھوں نے اس بات پر بھی زور دیا کہ نئی نسل کے فکشن نگار ہندوستانی تہذیب کے حوالے سے سنجیدہ تخلیقی کارنامے انجام دے رہے ہیں۔

آج کا دوسرا پروگرام 'شام سخن' کے عنوان سے منعقد ہوا جس میں جناب نعمان شوق، جناب احمد علوی، جناب شاہد انور، ڈاکٹر وسیم راشد، پروفیسر رحمٰن مصور، جناب ارشد ندیم، آلوک یادو شریک ہوئے۔ اس محفل میں شعرا نے اپنے کلام سے سامعین کو محظوظ کیا۔ پیش ہیں منتخب اشعار:

ایسے ملے نصیب سے سارے خدا کہ بس
میں بندگی کے زعم میں چلا اٹھا کہ بس
(نعمان شوق)

کہنا ہے ڈاکٹر کا کہ شوگر کے روگ میں
ہر طرح کی مٹھاس سے خطرے میں جان ہے

ہندی میں لکھ کے لاتا ہوں میں اس لیے غزل
رس گلے سے بھی میٹھی اردو زبان ہے
(احمد علوی)

فن عروض کی راہیں دکھا کے آئی ہوں
تمام عمر میں اردو پڑھا کے آئی ہوں
(ڈاکٹر وسیم راشد)

اک دل خراش زخم تری یاد کی طرح
رہتا ہے مرے ساتھ جو ہمزاد کی طرح
(ارشد ندیم)

نہ درد تھا نہ کرب تھا نہ پیاس بے مثال تھی
ترے بغیر زندگی کی کلپنا محال تھی
(رحمٰن مصور)

سانحہ ایک ہی لمحے کے لیے آتا ہے
عمر کٹ جائے گی وہ لمحہ بھلانے والے
(شاہد انور)

نئی نسلوں کے ہاتھوں میں بھی تابندہ رہے گا
میں مرجاؤں گا مٹی میں قلم زندہ رہے گا
(آلوک یادو)

ایک سفر روز مرے ساتھ لگا رہتا ہے
کیا بدن ہے جو صحرا میں پڑا رہتا ہے
(عمیر منظر)

اس شعری نشست کی نظامت کے فرائض ڈاکٹر عمیر منظر نے نہایت خوش اسلوبی سے انجام دیے۔

13 جنوری، 2026

عالمی کتاب میلہ، بھارت منڈپم میں قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان کے اسٹال پر دو اہم اور عصری موضوعات پر مبنی مذاکروں کا انعقاد عمل میں آیا، جن میں صحافت اور ڈیجیٹل اظہار کے مختلف پہلوؤں پر تفصیلی گفتگو کی گئی۔ دونوں مذاکروں میں اہلِ علم، صحافیوں اور اردو سے وابستہ افراد کی بڑی تعداد موجودگی رہی۔ پہلا مذاکرہ 'ملک کی تعمیر و ترقی میں صحافت کا کردار' کے عنوان سے منعقد ہوا، جس میں جناب شکیل شمسی، جناب شعیب رضا فاطمی اور ڈاکٹر مظفر حسین غزالی بطور پینلسٹ شریک ہوئے، جبکہ نظامت کے فرائض جناب نایاب حسن نے انجام دیے۔ جناب شکیل شمسی نے کہا کہ صحافت کا رنگ و روپ تیزی سے بدل چکا ہے اور ڈیجیٹل و سوشل میڈیا کے فروغ سے صحافت میں ایک انقلاب برپا ہوا ہے، جس کے باعث اب بات زیادہ کھل کر کہی جا رہی ہے۔ انھوں نے زور دیا کہ صحافت کے بنیادی اصولوں سے واقفیت نہایت ضروری ہے اور ایک صحافی کو اداریہ، کالم اور خبر کی ترتیب و اہمیت کا مکمل علم ہونا چاہیے۔ انھوں نے مزید کہا کہ صحافی کا باکردار اور بااخلاق ہونا ازحد ضروری ہے اور پیشہ ورانہ فرائض سے کوتاہی کرنا صحافت کے وقار کے خلاف ہے۔ انھوں نے کہا کہ صحافت کے فنی اسرار و رموز سے واقفیت لازمی ہے اور جن افراد نے باضابطہ صحافتی تعلیم حاصل نہیں کی ہے، انھیں صحافت سے متعلق معیاری کتابوں کا مطالعہ ضرور کرنا چاہیے۔ جناب شعیب رضا فاطمی نے کہا کہ ماضی کے صحافی محض خبر نویس نہیں ہوتے تھے بلکہ وہ سیاسی اور سماجی میدان کے بھی شہسوار ہوا کرتے تھے۔ انھوں نے اردو مواد کو ڈیجیٹل پلیٹ فارم پر دستیاب کروانے کے حوالے سے قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان کی خدمات کو خاص طور پر سراہا۔ انھوں نے انٹرنیٹ کی افادیت پر روشنی ڈالتے ہوئے کہا کہ آج ہم اپنی بات اور خبریں بآسانی دور دراز علاقوں تک پہنچا سکتے ہیں۔ ڈاکٹر مظفر حسین غزالی نے سوشل میڈیا کے مثبت اور منفی پہلوؤں پر گفتگو کرتے

ہوئے کہا کہ جہاں سوشل میڈیا نے خبر رسانی کو آسان بنایا ہے وہیں غلط اور بے بنیاد خبروں کے پھیلاؤ کا خطرہ بھی بڑھ گیا ہے۔ انھوں نے صحافت میں باریک بینی، تحقیق اور ذمے داری کی اہمیت پر زور دیتے ہوئے کہا کہ مستند معلومات کے بغیر خبر کی اشاعت معاشرے کے لیے نقصان دہ ہوسکتی ہے۔

اس سے قبل 'اردو میں بلاگ نویسی' کے عنوان سے ایک مذاکرہ منعقد ہوا، جس میں جناب سہیل انجم، جناب جاوید رحمانی اور جناب توحید حقانی بطور پینلسٹ شریک ہوئے، جبکہ نظامت کے فرائض جناب افضل حسین خان نے انجام دیے۔

جناب سہیل انجم نے کہا کہ ماضی میں اظہارِ خیال کے لیے اخبارات کا سہارا لینا پڑتا تھا، لیکن اکیسویں صدی میں انٹرنیٹ کے آنے کے بعد سوشل میڈیا اور بلاگنگ کا استعمال تیزی سے بڑھا ہے۔ انھوں نے بلاگنگ کو مفید قرار دیتے ہوئے کہا کہ یہاں ہر فرد آزادانہ طور پر اپنی بات کہہ سکتا ہے، تاہم اس کا مثبت استعمال ضروری ہے۔ ان کا کہنا تھا کہ بلاگنگ انفرادی سطح پر زیادہ مؤثر ہوتی ہے، جبکہ ادارہ جاتی سطح پر کئی پابندیاں ہوتی ہیں۔ انھوں نے اس بات کی بھی نشاندہی کی کہ سوشل میڈیا کے فروغ کے بعد بلاگنگ کسی حد تک کمزور ہوئی ہے۔ جناب جاوید رحمانی نے کہا کہ آج بلاگنگ نے بڑی حد تک اخبارات کی جگہ لے لی ہے، کیونکہ اب لوگ اخبار کے انتظار کے بجائے بلاگ اور آن لائن پلیٹ فارم سے فوری طور پر خبریں اور معلومات حاصل کر لیتے ہیں۔ انھوں نے کہا کہ برصغیر کے مقابلے میں یورپ کے بلاگرز زیادہ متحرک اور فعال نظر آتے ہیں، جس سے ہمیں سیکھنے کی ضرورت ہے۔ جناب توحید حقانی نے بلاگنگ کو خیالات کے مثبت اظہار کا مؤثر ذریعہ قرار دیتے ہوئے کہا کہ بلاگ کو ذاتی ڈائری کی جدید شکل کہا جا سکتا ہے۔ انھوں نے کہا کہ بلاگ کسی ایک زبان یا موضوع تک محدود نہیں بلکہ ہر موضوع پر اظہارِ خیال کی گنجائش رکھتا ہے۔ انھوں نے بلاگ اور وی لاگ کے فرق کو واضح کرتے ہوئے سیٹیزن جرنلزم پر بھی روشنی ڈالی۔ ان کا کہنا تھا کہ ادارہ جاتی بلاگنگ زیادہ تر خبروں تک محدود رہتی ہے، جبکہ انفرادی بلاگ زیادہ مؤثر، آزاد اور بامعنی ہوتا ہے۔

14 جنوری، 2026

عالمی کتاب میلے کے پانچویں دن قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی کے اسٹال پر دو اہم ادبی مذاکرے منعقد ہوئے۔ دونوں مذاکروں میں اہلِ علم و دانش نے شرکت کی اور موضوعات کے مختلف پہلوؤں پر قیمتی خیالات کا اظہار کیا۔ پہلا مذاکرہ 'کتاب میلوں کی علمی و ثقافتی اہمیت' کے عنوان سے منعقد ہوا، جس میں پروفیسر ارتضٰی کریم، ڈاکٹر حفیظ الرحمٰن، جناب وجیہ الدین اور ڈاکٹر سفینہ بطور پینلسٹ شریک ہوئے، جبکہ نظامت کے فرائض عذرا انجم نے انجام دیے۔ پروفیسر ارتضٰی کریم نے اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ کتاب میلوں میں مختلف موضوعات پر بیش قیمت اور اہم کتابیں ایک ہی جگہ دستیاب ہوتی ہیں۔ اگر کوئی قاری کتاب نہ بھی خریدے تو کم از کم اسے دیکھنے اور چھونے کا موقع ضرور ملتا ہے، جو کتاب سے ربط قائم رکھنے میں مددگار ثابت ہوتا ہے۔ انھوں نے کہا کہ آج مختلف شہروں میں کتاب میلے منعقد ہو رہے ہیں، جو اس بات کا ثبوت ہیں کہ لوگوں میں آج بھی کتاب سے محبت باقی ہے۔ انھوں نے مصنوعی ذہانت (AI) پر گفتگو کرتے ہوئے اس کے ممکنہ خطرات اور نقصانات کی نشاندہی کی اور کہا کہ اس کے بڑھتے ہوئے استعمال سے نوجوان سہل پسندی کا شکار ہو رہے ہیں۔ ڈیجیٹل دور میں ہماری ذمے داری ہے کہ ہم اپنی تہذیب، ثقافت اور ادبی ورثے کو محفوظ رکھنے کے طریقوں پر غور کریں۔ ان کا کہنا تھا کہ ڈیجیٹل کتاب کبھی بھی مطبوعہ کتاب کا مکمل نعم البدل نہیں ہوسکتی۔ انھوں نے کہا کہ اس قسم کے مذاکروں سے آگے بڑھنے اور عملی اقدام کی ترغیب ملتی ہے۔ ڈاکٹر حفیظ الرحمٰن نے کہا کہ کتاب میلوں کی علمی و تعلیمی اہمیت مسلم ہے۔ یہاں ادب، مذہب، سائنس، ٹیکنالوجی اور بچوں کے ادب سے متعلق اہم کتابیں بآسانی دستیاب ہو جاتی ہیں۔ ایک ہی جگہ اتنی متنوع اور معیاری کتابوں کا مل جانا کسی نعمت سے کم نہیں۔ انھوں نے کہا کہ مطالعہ انسان کی فکری صلاحیتوں میں اضافہ کرتا ہے۔ انھوں نے مزید کہا کہ عالمی کتاب میلوں میں بین الاقوامی اسٹالز بھی ہوتے ہیں، جہاں دنیا بھر کے موضوعات پر لکھی گئی کتابیں دستیاب ہوتی ہیں۔ جناب وجیہ الدین نے کہا کہ ٹیکنالوجی اگر مثبت

15 جنوری، 2026

عالمی کتاب میلے میں قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان کے اسٹال پر آج دو اہم ادبی موضوعات پر مذاکروں کا انعقاد ہوا، جن میں اہلِ علم و ادب کی بڑی تعداد نے شرکت کی۔ 'میرا تخلیقی سفر: مصنفین سے ملاقات' میں پروفیسر طارق چھتاری، ڈاکٹر خورشید اکرم اور جناب راجیو پرکاش ساحر بطور پینلسٹ شریک ہوئے، جبکہ مذاکرے کی نظامت کے فرائض جناب مالک اشتر نے انجام دیے۔ پروفیسر طارق چھتاری نے اپنے تخلیقی سفر پر روشنی ڈالتے ہوئے کہا کہ ان کا گھریلو ماحول تعلیمی تھا، گھر میں کتابوں کی موجودگی نے بچپن ہی سے مطالعے کی طرف مائل کیا۔ انھوں نے کہا کہ ابتدا ہی سے ان کا ذہن تخلیقی انداز میں سوچنے کا عادی رہا، مختلف موضوعات پر خیالات آتے رہے اور اسی عمل کے دوران مکالمے ذہن میں تشکیل پاتے گئے۔ انھوں نے اپنی پہلی کہانی کے پس منظر اور اس پر معروف افسانہ نگار سید محمد اشرف کی حوصلہ افزائی کا ذکر بھی بڑے دلچسپ انداز میں کیا۔ ان کا کہنا تھا کہ تخلیق ایک مسلسل عمل ہے جو تخلیق کار کے ذہن میں ہمہ وقت جاری رہتا ہے۔ انھوں نے سائنس سے اردو ادب کی طرف اپنے سفر اور رسائل میں تخلیقات کی اشاعت کے تجربات بھی تفصیل سے بیان کیے۔ ڈاکٹر خورشید اکرم نے کہا کہ افسانہ ان کا پہلا عشق رہا ہے۔ ابتدا میں رسائل میں کہانیاں پڑھتے رہے اور پھر تخلیق کی طرف راغب ہوئے۔ انھوں نے کہا کہ ہر تخلیق اپنے الجھاؤ سے نکلنے کی کوشش کرتی ہے، اگر اسے خوبصورت راستہ مل جائے تو فکشن وجود میں آتا ہے اور اگر سرا نہ ملے تو شاعری کی صورت اختیار کر لیتا ہے۔ انھوں نے بتایا کہ

انداز میں استعمال کی جائے تو بے حد فائدہ مند ثابت ہو سکتی ہے، تاہم اس کے منفی استعمال نے نوجوانوں کو کتابوں سے دور کر دیا ہے۔ انھوں نے گھروں میں ذاتی لائبریری قائم کرنے اور بچوں کے لیے الگ گوشہ مخصوص کرنے کی تلقین کی، تاکہ بچوں میں مطالعے کا شوق پیدا ہو۔ انھوں نے کہا کہ اے آئی ایک کہانی تو لکھ سکتی ہے، لیکن اس میں وہ روح اور جذبہ نہیں ڈال سکتی جو ایک تخلیق کار اپنی محنت اور احساس سے پیدا کرتا ہے۔ ڈاکٹر سفینہ نے کہا کہ کتاب میلے میں لوگ عموماً دو وجوہات سے کتابیں خریدتے ہیں، ایک ضرورت کے تحت اور دوسرے شوقیہ۔ مختلف اسٹالز پر گھومتے ہوئے قاری کو کبھی کبھار ایسی نایاب اور معیاری کتابیں بھی مل جاتی ہیں جو اس کی علمی تشنگی کو دور کرتی ہیں۔

دوسرا مذاکرہ 'ادبِ اطفال کی تخلیق: مسائل اور امکانات' کے عنوان سے منعقد ہوا، جس میں جناب فیروز بخت احمد، جناب انیس اعظمی اور جناب طٰہٰ نسیم بطور پینلسٹ شریک ہوئے، جبکہ نظامت کے فرائض محترمہ نہاں نے انجام دیے۔ جناب فیروز بخت احمد نے کہا کہ ادب کو آگے بڑھانے کے لیے اس کی جڑوں کو مضبوط کرنا بے حد ضروری ہے۔ انھوں نے کہا کہ موجودہ دور میں ادبِ اطفال کی صورتِ حال حوصلہ افزا نہیں ہے۔ اگرچہ ماضی کی کہانیاں آج کے بچوں کے ذہنی تقاضوں سے پوری طرح ہم آہنگ نہیں رہیں، اس کے باوجود ان ادبی سرمایوں کو زندہ اور محفوظ رکھنا ناگزیر ہے، کیونکہ یہی کہانیاں ہماری تہذیبی اور لسانی شناخت کی بنیاد ہیں۔ انھوں نے مزید کہا کہ اردو زبان مر نہیں رہی بلکہ مسلسل پنپ رہی ہے، تاہم اس حقیقت سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ قارئین کی تعداد میں کمی واقع ہوئی ہے۔ انھوں نے اس بات پر زور دیا کہ بچوں اور نوجوانوں کے لیے جدید اسلوب اور عصری موضوعات کے ساتھ معیاری ادب تخلیق کیا جانا چاہیے تاکہ مطالعے کا ذوق فروغ پا سکے اور اردو زبان و ادب کا مستقبل مزید مستحکم ہو۔ انیس اعظمی نے کہا کہ ادبِ اطفال بچوں کو پڑھنے، لکھنے اور تخلیقی صلاحیتوں کو پروان چڑھانے کا حوصلہ دیتا ہے۔ انھوں نے اس بات پر زور دیا کہ والدین کو چاہیے کہ بچوں کو اردو کتابیں اور رسائل پڑھنے کی ترغیب دیں تاکہ ان کی ذہنی نشو و نما بہتر ہو۔ انھوں نے مزید کہا کہ گھریلو سطح پر اردو زبان کے استعمال سے بچے اپنی زبان اور تہذیب سے واقف ہو سکتے ہیں۔ طٰہٰ نسیم نے کہا کہ ادبِ اطفال کی مانگ آج بھی برقرار ہے، ضرورت صرف اس بات کی ہے کہ بچوں کے ادب میں سائنسی اور جدید موضوعات کو شامل کیا جائے۔ انھوں نے کہا کہ بچوں کی کتابوں کو رنگین کاغذ، خوبصورت طباعت اور دلکش تصاویر سے مزین کیا جائے تو بچے خود بخود ان کی طرف راغب ہوں گے۔

16 جنوری، 2026

عالمی کتاب میلے میں قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان کے اسٹال پر کونسل کے زیرِ اہتمام آج تین اہم موضوعات 'اردو زبان اور نئی نسل'، 'انڈین نالج سسٹم کے اردو تراجم' اور 'اردو میں یونانی طب: قومی تعلیمی پالیسی 2020 کے تناظر میں' پر مذاکروں کا انعقاد عمل میں آیا، جن میں اہلِ علم و ادب، طلبہ اور شائقینِ اردو کی بڑی تعداد نے شرکت کی۔

'اردو زبان اور نئی نسل' کے عنوان سے منعقدہ مذاکرے میں قومی اردو کونسل کے ڈائریکٹر ڈاکٹر شمس اقبال، ڈاکٹر شمع افروز زیدی، ڈاکٹر اطہر فاروقی اور ڈاکٹر محبوب حسن بطور پینلسٹ شریک ہوئے، جبکہ نظامت کے فرائض ڈاکٹر صائمہ ثمرین نے انجام دیے۔ اس موقعے پر قومی اردو کونسل کے ڈائرکٹر ڈاکٹر شمس اقبال نے اظہارِ خیال کرتے ہوئے کہا کہ عموماً جب ہم نئی نسل کی بات کرتے ہیں تو فوراً نوجوان لکھنے والوں یا کسی مخصوص طبقے کی طرف توجہ چلی جاتی ہے، جبکہ اصل نئی نسل وہ ٹین ایجرز ہیں جن کے لیے الگ نوعیت کے لٹریچر کی ضرورت ہے۔ انھوں نے کہا کہ بچوں کو ان کی عمر، ذہنی ساخت اور دلچسپی کے مطابق کتابیں فراہم کی جانی چاہئیں، نہ کہ یہ توقع کی جائے کہ وہ براہِ راست اعلیٰ سطح کی کلاسیکی نثر یا مشکل متون پڑھنے لگیں۔ ڈاکٹر شمس اقبال نے مزید کہا کہ زبان یا ادب یکا یک نہیں سیکھا جاتا بلکہ یہ ایک تدریجی عمل ہے، جو مرحلہ بہ مرحلہ آگے بڑھتا ہے۔ اس لیے ضروری ہے کہ ہم نئی نسل کی نفسیات اور رجحانات کو سمجھیں اور اسی کے مطابق اردو میں دلچسپ، آسان اور عصری

ابتدا میں وہ غزل سے مرعوب تھے، مگر اوزان و بحور کی پابندی نے انھیں نثری نظم کی طرف مائل کیا۔ ان کا کہنا تھا کہ تخلیق اچانک نہیں ہوتی بلکہ اس کے لیے بہتر ماحول، اچھے دوست اور وافر مطالعہ بے حد ضروری ہے۔ جناب راجیو پرکاش ساحر نے کہا کہ اردو سے محبت ہی نے ان کے اندر کے تخلیق کار کو بیدار کیا۔ انھوں نے بتایا کہ اردو انھیں وراثت میں نہیں ملی بلکہ انھوں نے محنت اور لگن کے ساتھ اردو زبان اور اس کا رسم الخط سیکھا۔ انھوں نے کہا کہ زندگی کے گہرے مشاہدے اور لکھنؤ کے ادبی ماحول نے ان کے تخلیقی سفر میں اہم کردار ادا کیا۔ مذاکرے کے اختتام پر تینوں تخلیق کاروں نے اپنی تخلیقات بھی پیش کیں، جنھیں حاضرین نے بے حد سراہا۔

اس سے قبل 'ڈیجیٹل میڈیا: چیلنجز اور مواقع' کے عنوان سے ایک مذاکرہ منعقد ہوا، جس میں محمد نسیم نقوی، اشرف بستوی، ڈاکٹر خالد رضا خان اور ڈاکٹر شگفتہ یاسمین نے بطور پینلسٹ شرکت کی، جبکہ نظامت ڈاکٹر مسعود احمد نے کی۔ محمد نسیم نقوی نے کہا کہ سوشل میڈیا اسی وقت مفید ثابت ہوسکتا ہے جب اس کا مثبت اور ذمے دارانہ استعمال کیا جائے۔ انھوں نے کہا کہ خبروں کی ترسیل میں تصدیق اور احتیاط بے حد ضروری ہے، ورنہ ڈیجیٹل میڈیا کے نقصانات زیادہ ہو سکتے ہیں۔ اشرف بستوی نے کہا کہ ڈیجیٹل میڈیا نے عام لوگوں کو اظہار کا پلیٹ فارم فراہم کیا ہے، تاہم غلط خبروں سے محتاط رہنے کی اشد ضرورت ہے۔ انھوں نے والدین پر زور دیا کہ وہ ڈیجیٹل دور میں بچوں کی صحیح رہنمائی کریں۔ ڈاکٹر خالد رضا خان نے کہا کہ ڈیجیٹل میڈیا نے معلومات تک رسائی کو آسان بنا دیا ہے، مگر اس کے ساتھ توجہ کے انتشار اور وقت کے ضیاع کا خطرہ بھی موجود ہے۔ انھوں نے اردو کتابوں کو ڈیجیٹائز کرنے کی ضرورت پر زور دیا۔ ڈاکٹر شگفتہ یاسمین نے کہا کہ سوشل میڈیا نے عام انسان کی آواز کو دور تک پہنچایا ہے، تاہم بچوں اور نوجوانوں کو اس کے بے جا استعمال اور مصنوعی ذہانت (اے آئی) کے منفی اثرات سے بچانا ضروری ہے۔

موضوعات پر مواد تیار کریں۔ انھوں نے کہا کہ آج ضرورت اس بات کی ہے کہ ہم متحرک ہوں، نئے خیالات کے ساتھ آگے آئیں اور نئی نسل تک اردو کو جدید انداز میں پہنچائیں۔ اگر ہم وقت کے تقاضوں کو سمجھتے ہوئے منصوبہ بندی کریں تو اردو زبان نئی نسل کے لیے مزید پرکشش اور مؤثر ثابت ہوسکتی ہے۔ ڈاکٹر شمع افروز زیدی نے کہا کہ بچوں اور نئی نسل کو اردو سے جوڑنے کے لیے سب سے پہلے گھریلو ماحول سازگار بنانا ہوگا۔ گھر میں اردو زبان کا استعمال بے حد ضروری ہے۔ انھوں نے کہا کہ انگریزی وقت کی ضرورت ہے، مگر اس کا یہ مطلب نہیں کہ ہم اردو کو نظرانداز کردیں۔ انھوں نے قومی اردو کونسل کی کاوشوں کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ کونسل بچوں کے ذوق اور دلچسپی کو مدنظر رکھتے ہوئے معیاری کتابیں شائع کر رہی ہے، جس کے مثبت نتائج سامنے آرہے ہیں۔ ڈاکٹر اطہر فاروقی نے کہا کہ جب تک گھروں میں کتاب نہیں پہنچے گی اور مطالعے کا ماحول نہیں بنے گا، نئی نسل اردو سے قریب نہیں ہوگی۔ انھوں نے اسکولی سطح پر اردو تعلیم کی اہمیت پر زور دیتے ہوئے کہا کہ ہر موضوع پر معیاری اردو کتابوں کی اشد ضرورت ہے۔ ڈاکٹر محبوب حسن نے کہا کہ یہ بات خوش آئند ہے کہ نوجوان نسل اردو کی طرف متوجہ ہورہی ہے، تاہم اس رجحان کو مضبوط کرنے کے لیے مزید عملی اقدامات کرنے ہوں گے۔ انھوں نے کہا کہ جو زبان اپنے عہد کی ضروریات کو پورا نہیں کرتی، وہ ترقی کی دوڑ میں پیچھے رہ جاتی ہے۔

'انڈین نالج سسٹم کے اردو تراجم' کے موضوع پر منعقدہ مذاکرے میں پروفیسر عزیزالدین، پروفیسر علیم اشرف، ڈاکٹر رحیل صدیقی اور ڈاکٹر ارشاد نیازی بطور پینلسٹ شریک ہوئے، جبکہ نظامت ڈاکٹر ریحان نے کی۔ پروفیسر عزیزالدین نے کہا کہ اردو میں ہندوستانی ثقافت اور وراثت کے ترجمے کی روایت بے حد قدیم ہے اور اس کی بنیاد عہدِ اکبری میں رکھی گئی تھی جس کا سلسلہ آج تک جاری ہے۔ پروفیسر علیم اشرف نے کہا کہ زیادہ تر قدیم تراجم سنسکرت سے فارسی میں ہوئے اور بعد میں اردو میں منتقل ہوئے، مگر ان پر نظرِ ثانی اور جدید تقاضوں کے مطابق ایویلویشن کی شدید ضرورت ہے۔ انھوں نے کہا کہ مترجم کے لیے زبان کے ساتھ ثقافت اور تہذیب سے واقفیت بھی لازمی ہے۔ ڈاکٹر رحیل صدیقی نے کہا کہ مترجم کو اپنی ذاتی فکر سے بالاتر ہوکر متن کے ساتھ انصاف کرنا چاہیے۔ انھوں نے کہا کہ ویدوں کے اردو میں کامیاب ترجمے ہوئے ہیں. انھوں نے مزید کہا کہ قومی اردو کونسل نے اصطلاح سازی کے میدان میں جو اہم کام کیا ہے، وہ لائقِ تحسین ہے۔ ڈاکٹر ارشاد نیازی نے کہا کہ ترجمے میں سب سے اہم مرحلہ لفظ کی تفہیم ہے، کیونکہ جب تک لفظ واضح نہ ہو، معنی اور مفہوم بھی واضح نہیں ہو سکتے۔ انھوں نے ہندی سے اردو ترجمے میں تذکیر و تانیث کے مسائل کی طرف توجہ دلائی اور مذہبی صحائف کے تراجم کو عصری ضرورت قرار دیا۔

آج کا تیسرا اور آخری مذاکرہ ''اردو میں یونانی طب: قومی تعلیمی پالیسی 2020 کے تناظر میں'' کے عنوان سے منعقد ہوا، جس میں ڈاکٹر سید احمد خاں، پروفیسر عبدالودود اور پروفیسر شبیر احمد بطور پینلسٹ شریک ہوئے، جبکہ نظامت ڈاکٹر محمد فیصل نے کی۔ اس مذاکرے میں مقررین نے کہا کہ یونانی طب برصغیر کے علمی ورثے کا ایک اہم حصہ ہے اور اردو زبان اس علم کی ترسیل کا بنیادی ذریعہ رہی ہے۔

مقررین نے اس بات پر زور دیا کہ یونانی طب سے متعلق قدیم اردو متون کو جدید سائنسی اور تعلیمی معیار کے مطابق ازسرِنو مرتب کرنے کی ضرورت ہے، تاکہ نئی نسل اور طلبہ اس سے بخوبی فائدہ اٹھا سکیں۔ انھوں نے

کہا کہ اگر یونانی طب کو قومی تعلیمی پالیسی کے تحت ادارہ جاتی سطح پر فروغ دیا جائے تو یہ نہ صرف اردو زبان کے استحکام کا سبب بنے گا بلکہ ہندوستانی طبی نظام کو بھی عالمی سطح پر متعارف کرانے میں مددگار ثابت ہوگا۔

17 جنوری، 2026

قومی اردو کونسل کے زیر اہتمام عالمی کتاب میلے میں آج تین مذاکرے منعقد ہوئے۔ پہلا پروگرام 'جتنے دور اتنے پاس' نامی کتاب پر مذاکرہ تھا۔ اس کتاب کے مصنف دھریندر سنگھ جفا ہیں۔ انھوں نے یہ کتاب انگریزی میں Death was'nt painfull کے نام سے تحریر کی تھی۔ جس کا اردو ترجمہ جناب شاہد جمیل نے کیا ہے۔ اس کتاب میں مشرقی اور مغربی پاکستان کے درمیان 1971 میں ہونے والی کشمکش اور ہندوستان کی مداخلت کے واقعات ایک فائٹر پائلٹ کی زبانی بیان کیے گئے ہیں۔ اس مذاکرے میں جناب کرنل طاہر مصطفیٰ اور جناب سرت جفا بطور پینلسٹ شریک ہوئے جبکہ ڈاکٹر فیضان الحق نے اسے موڈریٹ کیا۔ جناب کرنل طاہر مصطفیٰ نے ملک کی سرحد کی حفاظت کرنے والے فوجیوں کے جذبے اور حوصلے کی تعریف کرتے ہوئے ہندوستان کی دفاعی صلاحیتوں کا خصوصی ذکر کیا۔ فوج سے متعلق عالمی کتاب میلے کا تھیم منتخب کرنے کے لیے انھوں نے این بی ٹی انڈیا کو مبارکباد پیش کی۔ انھوں نے زبان کے مسائل پر گفتگو کرتے ہوئے کہا کہ فوجیوں کو اس علاقے کی زبان ضرور جاننی چاہیے جہاں وہ ڈیوٹی کررہے ہیں۔ اس کے بغیر وہاں کے لوگوں سے کمیونی کیٹ کرنے میں دشواری پیش آئے گی۔

دوسرے پینلسٹ اور کتاب کے مصنف جناب دھریندر سنگھ جفا کے صاحبزادے جناب سرت جفا نے گفتگو کرتے ہوئے کہا کہ اس طرح کی کتابوں کی اشاعت کے لیے قومی اردو کونسل قابل مبارکباد ہے۔ یہ کتاب فوج کے وقار اور اپنے ملک ہندوستان کو جاننے اور سمجھنے کے حوالے سے بہت اہم ہے۔ اس طرح کی کتابوں سے ملک کی یوا پیڑھی کو ہندوستان کی فوجی طاقت اور عظمت کا بخوبی علم ہوگا۔ اس کتاب کے حوالے سے انھوں نے مزید کہا کہ چونکہ میرے والد ہندوستان۔ پاکستان کی جنگ میں شامل تھے اور بطور فائٹر پائلٹ اس کا حصہ رہنے کے سبب قیدی بھی بنے تھے، کتاب میں انھوں نے اس سے متعلق اپنے تجربات اور خیالات تحریر کیے ہیں۔ مزید انھوں نے ہندوستانی زبانوں کی اہمیت پر بھی واضح انداز میں بات کی۔ انھوں نے کتاب کے حوالے سے ایک اہم بات یہ بھی کہی کہ اس کے مطالعے سے فوجیوں کے مابین انسان دوستی اور ہمدردی کے جذبات کا بھی علم ہوتا ہے۔

دوسرا مذاکرہ 'مادری زبان اور قومی تعلیمی پالیسی 2020' کے موضوع پر منعقد ہوا جس میں پروفیسر عذرا عابدی، پروفیسر جسیم احمد اور ڈاکٹر سید مبین زہرا بطور پینلسٹ شامل ہوئے۔ نظامت کے فرائض ڈاکٹر شاہد حبیب فلاحی نے انجام دیے۔ اس موقعے پر اظہار خیال کرتے ہوئے پروفیسر عذرا عابدی نے کہا کہ نئی تعلیمی پالیسی 2020 پر گفتگو کے لیے یہ ایک اہم پلیٹ فارم ہے۔ مادری زبان میں تدریس وقت کی اہم ضرورت ہے۔ یہ ان بچوں کے لیے بہت اہم ہے جو پچھڑے علاقوں میں رہتے ہیں۔ لسانی تنوع کے لحاظ سے ہندوستان ایک مثالی ملک ہے۔ یہ ہماری ذمے داری ہے کہ ہم اپنے گھروں میں مادری زبان کی طرف بچوں کی توجہ دلائیں۔ پروفیسر جسیم احمد نے کہا کہ تعلیمی پالیسی میں مادری زبان کا خیال رکھنا ضروری ہے۔ اسی لیے حکومت ہند نے نئی تعلیمی پالیسی 2020 میں اس پر خاص دھیان دیا ہے۔ بچوں کو پانچویں کلاس تک اور اگر ممکن ہو تو آٹھویں تک بھی مادری زبان میں تعلیم ضرور دی جائے۔ اس کے بعد ہائر ایجوکیشن کو بھی مادری زبان سے جوڑا جا سکتا ہے۔ ساتھ ہی بچوں کو وہ زبان بھی سیکھنا چاہیے جس میں روزگار کے مواقع زیادہ ہیں۔ انھوں نے مزید کہا کہ ہمیں مادری اور قومی زبان میں موازنے سے بچنا چاہیے۔ دونوں کی اپنی اپنی اہمیت ہے۔ ڈاکٹر سید مبین زہرا نے اس حوالے سے اظہار خیال کرتے ہوئے کہا کہ مادری زبان میں تعلیم وقت کی ضرورت ہے۔ بچہ اس زبان کو زیادہ بہتر طریقے سے سمجھتا ہے جو وہ ماں سے سنتا ہے۔ مادری زبان کی وجہ سے حاشیائی علاقوں میں تعلیم کی شرح بڑھی ہے۔ ہم ایجوکیشنسٹ کی ذمے داری ہے کہ ہم سبھی علاقوں کے بچوں کی ذمے داری کو سمجھیں۔ انھوں نے کہا کہ کسی بھی زبان کو فروغ دینے کے لیے گھر سے شروعات کرنی ہوگی، سرکار کا کام صرف پالیسی بنانا ہے۔ ساتھ ہی انھوں نے سیلف لرننگ کو پرموٹ کرنے پر بھی زور دیا۔

تیسرا مذاکرہ 'اردو کے فروغ میں تھیٹر کا کردار' کے موضوع پر منعقد ہوا جس میں بحیثیت پینلسٹ جناب ایڈوکیٹ اے رحمٰن، پروفیسر محمد کاظم، پروفیسر دانش اقبال شامل ہوئے۔ مذاکرے کی نظامت جناب تحسین منور نے کی۔ جناب پروفیسر محمد کاظم نے گفتگو کرتے ہوئے کہا کہ اردو ڈرامے کی اصل شروعات شمالی ہند میں امانت کے اندر سبھا سے ہوئی۔ تھیٹر اور اردو لازم ملزوم ہیں۔ ڈرامہ واحد ایسی صنف ہے جو خواندہ اور ناخواندہ دونوں طبقے تک اردو زبان کی رسائی کو ممکن بناتی ہے۔ مذاکرے کے دوسرے پینلسٹ جناب ایڈوکیٹ اے رحمٰن نے کہا کہ ڈراموں کی وجہ سے زبان ترقی کرتی ہے۔ اردو زبان میں اچھی تعداد میں ڈرامے موجود ہیں اور ڈراموں کا ان کے تھیٹر پر پیش کیا جانا ضروری ہے۔ لوگ ادب عالیہ کی بات کرتے ہوئے ڈرامے سے گریز کرتے ہیں، جو درست نہیں۔

تیسرے پینلسٹ پروفیسر دانش اقبال نے ریڈیو ڈرامے کے حوالے سے گفتگو کرتے ہوئے کہا کہ رفیع پیر کا اس حوالے سے بہت اہم کام ہے۔ اس کے علاوہ ان کی دلچسپیوں اور کوششوں کے سبب ان کے بہت سے شاگردوں نے بھی اس بابت قابل ذکر خدمات انجام دی ہیں۔ چوتھے پینلسٹ جناب جاوید حسن نے گفتگو کرتے ہوئے کہا کہ ڈرامے کے فروغ میں اردو کا بہت اہم کردار ہے۔ مثلاً اگر غالب یا میر پر کوئی ڈراما تحریر کیا جائے تو ظاہر ہیکہ اس میں اردو الفاظ ہی استعمال ہوں گے۔ انھوں نے ریڈیو کے تعلق سے گفتگو کرتے ہوئے کہا کہ ریڈیو ڈراما ایک طرح سے اہم موڑ کی حیثیت رکھتا ہے۔

18 جنوری، 2026

آج عالمی کتاب میلے میں قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان کے زیرِ اہتمام 'ہندی صحافت پر اردو کے اثرات' کے عنوان سے ایک اہم مذاکرے کا انعقاد کیا گیا، جس میں جناب پرتاپ سوم ونشی، پروفیسر رحمت اللہ اور مرزا عبدالباقی بیگ بطور پینلسٹ شریک ہوئے، جبکہ اس مذاکرے کی نظامت ڈاکٹر جاوید عالم نے کی۔ پرتاپ سوم ونشی نے کہا کہ اگر کسی زبان کو دور تک پہنچانا ہے اور اسے عام لوگوں میں مقبول بنانا ہے تو غیر ضروری اور مشکل الفاظ کے استعمال کو کم کرنا ہوگا، تاکہ وہ زبان سب کے لیے فائدہ مند بن سکے۔ انھوں نے اس بات پر زور دیا کہ ہندی اخبارات میں اردو اور ہندی دونوں زبانوں کے الفاظ یکساں طور پر استعمال ہوتے ہیں۔ ہندی اور اردو کے امتزاج سے جو زبان بنتی ہے اسے ہندوستانی کہا جاتا ہے، اور یہی زبان عوام میں زیادہ سمجھی اور قبول کی جاتی ہے۔ انھوں نے کہا کہ جب تک ہندی اخبارات اور رسائل میں اردو کے الفاظ شامل نہیں ہوں گے، وہ مکمل طور پر مقبول نہیں ہو سکتے، کیونکہ خالص ہندی میں لکھی تحریریں عام قارئین کے لیے بعض اوقات دشوار ہوتی ہیں۔

پروفیسر رحمت اللہ نے اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے اپنے صحافتی سفر کی تفصیلات بیان کیں اور کہا کہ ان کی صحافت کی ابتدا ہندی زبان سے ہوئی، لیکن وقت کے ساتھ ساتھ وہ اردو کی طرف مائل ہوتے گئے۔ انھوں نے کہا کہ آج کا موضوع صرف زبان تک محدود نہیں بلکہ تاریخ اور تہذیب سے بھی اس کا گہرا تعلق ہے، کیونکہ ہندی اور اردو دونوں زبانیں اسی سرزمین پر پیدا ہوئیں اور پروان چڑھیں۔ انھوں نے مزید کہا کہ آج ہندی اخبارات میں اردو اور ہندوستانی زبان کا استعمال بڑھتا جا رہا ہے۔ اگرچہ دونوں زبانوں میں لکھنے کا انداز الگ ہے، لیکن ان کی تاثیر ایک جیسی ہے۔ اردو کے استعمال سے ہندی زبان میں گہرائی اور وسعت پیدا ہوتی ہے، انھوں نے مزید کہا کہ اردو اور ہندی دونوں زبانیں ایک دوسرے کی مخالف نہیں بلکہ ایک دوسرے کی تکمیل کرتی ہیں۔

مرزا عبدالباقی بیگ نے کہا کہ ہندی اور اردو دونوں زبانوں کے مصادر بنیادی طور پر ایک ہی ہیں، فرق زیادہ تر ناموں اور رسم الخط کا ہے۔ بول چال اور اظہار کے وقت اردو ایک خاص لطف اور مٹھاس پیدا کرتی ہے، اسی لیے اردو کو ''میٹھی زبان'' کہا جاتا ہے۔ انھوں نے کہا کہ اگر اردو میں ہندی کے الفاظ شامل کر دیے جائیں تو اس کا حسن دوبالا ہو جاتا ہے۔ انھوں نے مزید کہا کہ اردو شاعری کی اپنی ایک منفرد اہمیت ہے اس لیے اس میں دو مصرعوں میں گہری اور مؤثر بات کہہ دی جاتی ہے۔ انھوں نے بعض ایسے الفاظ کی نشاندہی بھی کی جو ہندی اور اردو دونوں میں مستعمل ہیں۔

مذاکرے کے اختتام پر مقررین نے اس بات پر اتفاق کیا کہ ہندی اور اردو کا باہمی رشتہ نہ صرف لسانی بلکہ تہذیبی اور ثقافتی سطح پر بھی مضبوط ہے، اور صحافت کے ذریعے اس رشتے کو مزید مستحکم کیا جا سکتا ہے۔ ■

گوشۂ خوشونت سنگھ

خوشونت سنگھ کا شمار ہندوستان کے معروف قلم کاروں میں ہوتا ہے۔ ان کے اظہار کی زبان گرچہ انگریزی تھی لیکن موضوعات و مسائل کے اعتبار سے وہ اتنی اہم تھی کہ ہندی اور اردو کے ساتھ دیگر ہندوستانی زبانوں کے قارئین بھی متوجہ ہوگئے۔ ان کے ناول، افسانے اور مضامین اردو میں منتقل ہوئے اور شوق سے پڑھے گئے۔'ٹرین ٹو پاکستان' اور'دہلی' نے اردو قارئین کو خاص طور پر متاثر کیا۔ فروری 1915 میں ان کی ولادت ہوئی تھی۔ اسی مناسبت سے فروری کے شمارے میں ان کے علمی و ادبی خدمات کے جائزے پر مشتمل ایک گوشہ ترتیب دیا جا رہا ہے۔ امید ہے قارئین اسے پسند فرمائیں گے۔ (ادارہ)

سوانحی خاکہ

نام : خوشحال سنگھ
قلمی نام : خوشونت سنگھ
پیدائش : 02فروری 1915
وفات : 20 مارچ 2014
والد : سرسوبھا سنگھ
والدہ : ویراں بائی
بیوی : کنول ملک
اولاد : راہل سنگھ (بیٹا)، مالا (بیٹی)
مادرعلمی : ماڈرن اسکول، نئی دہلی
سینٹ اسٹیفن کالج، نئی دہلی
کنگز کالج، لندن
ملازمت : آکاش وانی (ریڈیو ناشر)
ادارت : السٹریٹڈ ویکلی، ہندوستان ٹائمز، نیشنل ہیرالڈ
اعزازات : پدم وبھوشن (2007) پدم بھوشن (1974)
پنجاب رتن (2006)
راجیہ سبھا کے رکن (1980-1986)

چند اہم مطبوعات

- ٹرین ٹو پاکستان (ناول)
- دلی (ناول)
- آزادی (ناول)
- سمندر میں تدفین (ناول)
- کمپنی آف وومن (ناول)
- خوشونت سنگھ کے بہترین افسانے
- سورگ (افسانے)
- پنجاب، پنجابی اور پنجابیت (مضامین)
- سچ محبت اور ذرا سا کینہ (خودنوشت)
- شکوہ جواب شکوہ (انگریزی میں ترجمہ)

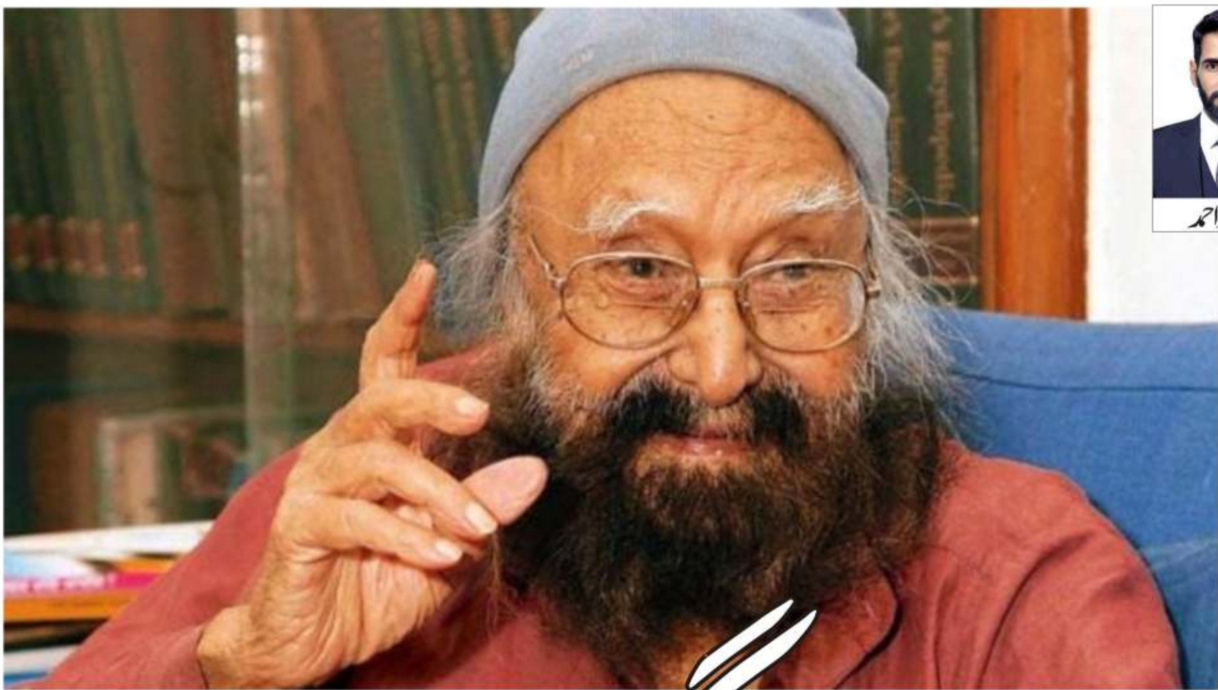

مسعود احمد

خوشونت سنگھ کی فکری و ادبی معنویت

ادیب دنیا میں جینے کا ایک خاص طریقہ خود منتخب کرتا ہے۔وہ صرف اپنے عہد کا مشاہدہ نہیں کرتا، اپنی ذہنی اپج ،فکری افتاد اور قلم کو بھی اسی مشاہدے کے تابع کردیتا ہے۔ہمارے ہاں ایسے ادیبوں میں خشونت سنگھ کا نام نمایاں ہے۔ان کی پوری ادبی اور صحافتی زندگی اس جملے کی عملی تفسیر بن کر سامنے آتی ہے۔وہ روایت کے بت کدے کے مکین ادیب نہیں تھے۔ انھوں نے زندگی کو اپنے منفرد طرز پر جیا۔ بھر پور قہقہے لگائے۔لوگوں کو ہنسایا بھی اور رلایا بھی اور اپنے اصولوں پر قائم رہتے ہوئے اس دنیا کو خیر باد کہہ گئے۔ ان کا شمار بیسویں صدی کے ان چند ہندستانی ادیبوں میں ہوتا ہے جنھوں نے ادب کو تفریح اور جمالیاتی تجربے کے ساتھ سماجی ضمیر کی آواز بنادیا۔ان کی تحریروں میں تقدس کا مصنوعی لبادہ ملتا ہے نہ اخلاقی وعظ کی یک رنگی۔ یہاں انسان اپنی تمام تر کمزوریوں، پیچیدگیوں، سچائیوں اور تضادوں کے ساتھ موجود نظر آتا ہے۔

خوشونت سنگھ کی پیدائش 15اگست 1915 کو پنجاب کے ہڈالی نامی گاؤں میں ایک سکھ خاندان میں ہوئی۔ان کا پیدائشی نام خوشحال سنگھ تھا۔انھوں نے ابتدائی تعلیم لاہور سے حاصل کی۔اعلی تعلیم کے لیے لندن کا سفر کیا۔وہ بچپن سے ہی بلا کے ذہین تھے۔یہی ذہانت آگے چل کر ان کی تحریروں کا حصہ بنی ۔ اسی

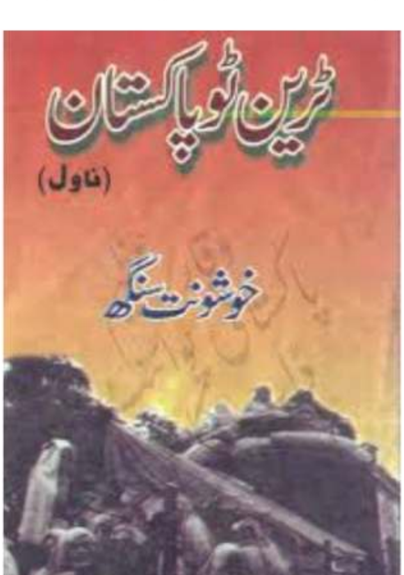

ذہانت نے ان کے قارئین اور سامعین کو سوچنے پر مجبور کیا۔انھیں چونکایا اور بسا اوقات بے چین بھی کیا۔انھوں نے قانونی تعلیم حاصل کی۔ لاہور کی عدالت میں وکالت کا آغاز بھی کیا۔تاہم انھیں جلد اس بات کا احساس ہو گیا کہ قانون کے رسمی ضابطے ان کی فکری تشنگی کو سیراب نہیں کر سکتے۔نتیجتاً وہ ادب اور صحافت کی جانب مائل ہوئے۔ یہاں سوال اٹھانے کی آزادی قدرے زیادہ تھی۔ 1951 میں وہ آکاش وانی سے منسلک ہو گئے۔

خوشونت سنگھ بیک وقت ادیب ،مورخ،صحافی اور وکیل تھے۔ان کا نام آتے ہی انسانی ذہن فوراً تقسیم ہند کے سانحے کی طرف چلا جاتا ہے۔ اس موضوع کو انھوں نے اپنے شہرہ آفاق ناول 'A Train to Pakistan' (پاکستان ایکسپریس) میں نہایت سادہ مگر دل دہلا دینے والے اسلوب میں پیش کیا ہے۔ تقسیم ہند ان کی زندگی کا سب سے گہرا اور فیصلہ کن تجربہ ثابت ہوئی۔ یہ ناول 1955 میں لکھا گیا اور 1956 میں پہلی بار شائع ہوا۔1998 میں اس ناول پر مبنی ایک فلم بھی

خوشونت سنگھ کی صحافتی زندگی انگریزی اور اردو صحافت کی تاریخ میں ایک نمایاں مقام رکھتی ہے۔ انھوں نے بے باکی، سچائی، طنز، شگفتگی اور بے لاگ تنقید کو صحافت کا شعار بنا دیا۔ ان کی صحافتی زندگی کا آغاز آزاد ہندوستان میں ہوا۔ اس وقت قوم تعمیر نو کے ابتدائی مراحل میں تھی اور صحافت پر سنجیدہ اخلاقی ذمہ داریاں عائد تھیں۔ انھوں نے اپنے صحافتی کیریئر کا آغاز آل انڈیا ریڈیو دہلی سے کیا تھا۔

ریلیز ہوئی۔ اس ناول میں نہ سیاسی نعرے ہیں نہ نظریاتی خطابت۔ اس میں خالص انسان ہے۔ خوف زدہ، الجھن کا شکار اور ٹوٹا بکھرا ہوا۔ یہ رویہ البرٹ کامیو کے اس تصور سے ہم آہنگ ہے کہ ادیب کا کام فیصلہ سنانا نہیں بلکہ حالات کو سمجھنا ہے۔ 'اے ٹرین ٹو پاکستان' دراصل انسان کو سمجھنے کی ہی ایک کوشش ہے۔ وہ روایت کے پاسدار تھے نہ مصلحت پسند۔ بلکہ جیسا سوچتے تھے اسے بعینہ ورق پر اتارنے کے دھنی تھے۔ نیز اپنے لکھے ہوئے پر قائم بھی رہتے تھے۔ اس انداز نے انھیں ہندوستانی انگریزی ادب کی اہم آواز بنا دیا۔ ان کی سب سے نمایاں خصوصیت روایت شکنی ہے۔ انھوں نے ادبی روایت کی اندھی تقلید نہیں کی۔ نہ ہی سماجی اقدار کو مقدس سمجھ کر انھیں سوال سے بالاتر رکھا۔ مذہب، سیاست، جنس، بڑھاپا اور موت کوئی موضوع ان کے لیے ممنوع نہیں تھا۔ انھوں نے خود لکھا کہ ادب کا مقصد قاری کو خوش فہمی میں مبتلا رکھنا نہیں بلکہ اسے آئینہ دکھانا ہے۔ آئینہ ہمیشہ بے رحم ہوتا ہے۔ خوشونت سنگھ کا قلم بھی بے رحمی کی صفت سے مملو تھا۔

خوشونت سنگھ برصغیر کے شاید واحد ایسے ادیب ہیں جنھوں نے پوری زندگی انگریزی میں لکھا۔ لیکن انھیں ہندی اور اردو میں بھی ہمیشہ قدر و احترام کی نگاہ سے دیکھا گیا۔ مصنف کے طور پر وہ اپنی غیر جانب داری، مزاحیہ انداز، سیکولرزم اور شاعرانہ انداز بیان کے لیے مقبول تھے۔ انھوں نے اپنی خود نوشت Truth,Love & a Little Malice کے عنوان سے لکھی۔ یہ اٹھارہ ابواب پر مشتمل ہے۔ اس کا اردو ترجمہ 'سچ محبت اور ذرا سا کینہ' کے عنوان سے ہوا۔ یہ خود نوشت ان کی ادبی دیانت داری کا بین ثبوت ہے۔ انھوں نے خود کو فرشتہ یا معاشرے سے ماورا کوئی فرد بنا کر پیش نہیں کیا۔ بلکہ اپنی تمام کمزوریوں اور لغزشوں کو مزے لے لے کر بیان کیا۔ یہ خود نوشت دراصل ایک ادبی اعتراف نامہ ہے۔ یہاں ادیب اپنے خود ساختہ اخلاقی بتوں کو توڑ دیتا ہے۔ اردو ادب کے تناظر میں اگر دیکھا جائے تو یہ رویہ ہمیں سعادت حسن منٹو کے افسانوں میں جا بجا ملتا ہے۔ وہاں بھی سچ سب سے بڑی قدر کے طور پر ابھرتا ہے۔

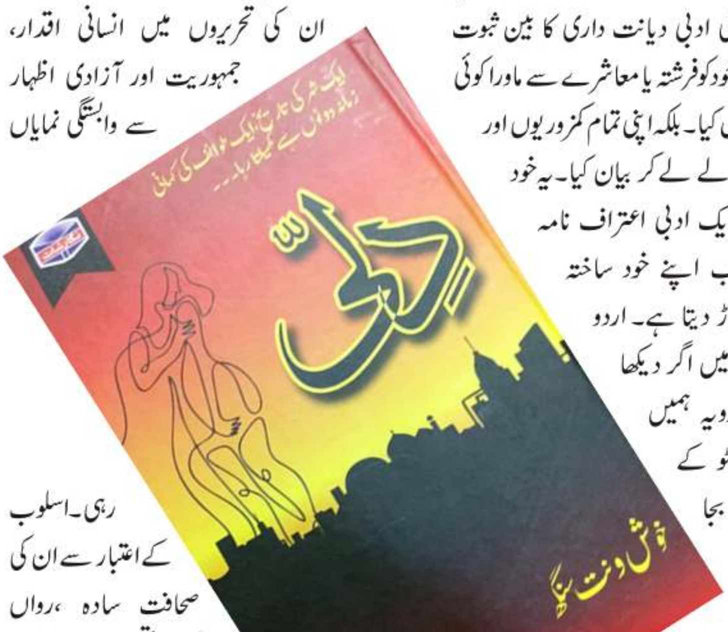

خوشونت سنگھ کی صحافتی زندگی انگریزی اور اردو صحافت کی تاریخ میں ایک نمایاں مقام رکھتی ہے۔ انھوں نے بے باکی، سچائی، طنز، شگفتگی اور بے لاگ تنقید کو صحافت کا شعار بنا دیا۔ ان کی صحافتی زندگی کا آغاز آزاد ہندوستان میں ہوا۔ اس وقت قوم تعمیر نو کے ابتدائی مراحل میں تھی اور صحافت پر سنجیدہ اخلاقی ذمہ داریاں عائد تھیں۔ انھوں نے اپنے صحافتی کیریئر کا آغاز آل انڈیا ریڈیو دہلی سے کیا تھا۔ پھر وہ پرنٹ میڈیا کی طرف متوجہ ہوئے۔ یہاں ان کی صلاحیتوں کو جلا ملی۔ وہ The Illustrated weekly of India کے مدیر مقرر ہوئے۔ ان کی ادارت میں اس جریدے نے ادبی و فکری صحافت کی مضبوط نیو رکھی۔ اس کے بعد انھوں نے National Herald اور Hindustan Times جیسے معتبر اخبارات میں بھی نمایاں خدمات انجام دیں۔ ہندوستان ٹائمز میں شائع ہونے والا ان کا ہفتہ وار کالم With Malice Towards One and All بے حد مقبول ہوا۔ اس کالم میں انھوں نے مختلف سیاسی، سماجی اور مذہبی مسائل کو موضوع بنایا۔ وہ ہمیشہ طنز کو ہتھیار کے طور پر استعمال کرتے اور قاری کو سوچنے پر آمادہ کر دیتے تھے۔

خوشونت سنگھ کی صحافت کی سب سے نمایاں خصوصیت 'بے خوفی' تھی۔ وہ کسی جماعت، مذہبی گروہ یا طاقتور فرد سے مرعوب نہیں ہوتے تھے۔ باوجود اس کے ان کی تحریروں میں انسانی اقدار، جمہوریت اور آزادی اظہار سے وابستگی نمایاں رہی۔ اسلوب کے اعتبار سے ان کی صحافت سادہ، رواں اور شگفتہ تھی۔ وہ سنجیدہ موضوعات کو عام فہم زبان میں پیش کرتے تھے۔ جس سے ان کی تحریریں عوام و خواص دونوں میں مقبول ہوئیں۔ ان کی صحافت میں ذاتی مشاہدہ، تاریخی شعور اور سماجی حساسیت کا حسین امتزاج ملتا ہے۔ انھوں نے صحافت کو محض خبر رسانی تک محدود نہیں رکھا بلکہ اسے سماجی احتساب اور فکری رہنمائی کا ذریعہ بنایا۔ معروف مورخ رام چندر گوہا کے مطابق

"Khushwant Singh belonged to a rare tribe of indian public intellectuals who spoke truth to power without fear"

خوشونت سنگھ کی تاریخ نگاری ان کی ہمہ جہت شخصیت کا ایک وقیع پہلو ہے۔تاریخ کے میدان میں انھوں نے کم طبع آزمائی کی۔باوجود اس کے انھیں منفرد مورخ کے طور پر تسلیم کیا گیا۔ان کی تاریخ نگاری روایتی معنوں میں محض واقعات کی ترتیب نہیں بلکہ انسانی تجربے، سماجی رویوں اور تہذیبی شعور کی عکاس ہے۔ان کی تاریخ نگاری کا سب سے نمایاں نمونہ ان کی شہرہ آفاق تصنیف A History of the Sikhs ہے۔یہ کتاب دو جلدوں میں شائع ہوئی۔اس میں انھوں نے سکھ مذہب کے آغاز سے لے کر بیسویں صدی کے وسط تک کی تاریخ کو نہایت تحقیق، توازن اور غیر جانب داری کے ساتھ پیش کیا ہے۔اس تصنیف میں انھوں نے سیاسی واقعات، مذہبی افکار، سماجی ڈھانچے اور ثقافتی عوامل کو تاریخی تناظر میں سمجھنے کی کوشش کی ہے۔یہی وجہ ہے کہ یہ کتاب محض سکھ تاریخ ہی نہیں بلکہ برصغیر کی مجموعی تاریخ کی فہم کے لیے اہم سمجھی جاتی ہے۔

خوشونت سنگھ کی تاریخ نگاری میں سب سے اہم وصف ان کی حقیقت پسندی ہے۔وہ تاریخ کو تقدیس کے پردے میں چھپا کر پیش کرنے کے قائل نہیں تھے۔انھوں نے تاریخی شخصیات اور تحریکوں کا تجزیہ کرتے ہوئے انسانی کمزوریوں، تضادات اور عملی مسائل کو بھی واضح کیا۔ان کا ماننا تھا کہ تاریخ کا مقصد صرف فخر کے مواقع پیدا کرنا نہیں، ماضی سے سبق حاصل کرنا بھی ہے۔اسی نقطہ نظر نے ان کی تحریروں کو فکری گہرائی عطا کی۔دوسرا نمایاں وصف اسلوب کی سادگی اور روانی ہے۔وہ بھاری بھرکم اصطلاحات کے استعمال سے شعوری اجتناب برتتے ہیں۔ان کی تحریریں تحقیقی بنیادوں پر قائم ہیں تاہم زبان و انداز ایسا ہے کہ عام قاری بھی ان سے مستفیض ہو سکتا ہے۔وہ خشک اور پیچیدہ علمی اسلوب سے گریز کرتے تھے۔نیز تاریخ کو ایک جیتی جاگتی کہانی کی صورت میں بیان کرتے تھے۔اسلوب کی اسی دلکشی کی بدولت ان کی تاریخ نگاری اہل علم کے حصار سے باہر بھی اپنے پاؤں پسارتی ہے۔غرض یہ کہ انھوں نے تاریخ کو ماضی کا بوجھ نہیں بلکہ حال اور مستقبل کی رہنمائی کا ذریعہ بنایا۔

خوشونت سنگھ بہت ڈسپلنڈ شخص تھے۔وہ صبح چار بجے جاگتے تھے۔رات کو آٹھ بجتے ہی بستر کا رخ کرتے تھے۔انھوں نے اپنے گھر کے صدر دروازے پر یہ تختی لگا رکھی تھی کہ اگر آپ نے پہلے سے ملاقات کا وقت نہیں لیا ہے تو برائے مہربانی گھنٹی نہ بجائیں۔ایک مرتبہ وہ سابق صدر جمہوریہ ہند گیانی ذیل سنگھ کے کسی پروگرام میں تھے۔شام کو آٹھ بجتے ہی انھوں نے بے تکلفی کے ساتھ صدر ہند سے کہا ''گیانی میں چلتا ہوں'' اور پروگرام سے چلے آئے۔سابق صدر اے پی جے عبدالکلام بھی ملاقات کی غرض سے ان کے گھر گئے تھے۔خوشونت سنگھ کے مطابق انھیں اس امر کی بالکل توقع نہیں تھی۔عبدالکلام صاحب کے غیر متوقع دورے نے انھیں چونکا دیا۔

خوشونت سنگھ کی تاریخ نگاری میں سب سے اہم وصف ان کی حقیقت پسندی ہے۔وہ تاریخ کو تقدیس کے پردے میں چھپا کر پیش کرنے کے قائل نہیں تھے۔انھوں نے تاریخی شخصیات اور تحریکوں کا تجزیہ کرتے ہوئے انسانی کمزوریوں، تضادات اور عملی مسائل کو بھی واضح کیا۔

بنجامن فرنکلن نے لکھا ہے

''اگر تم چاہتے ہو کہ مرنے اور گل سڑ جانے کے بعد تمھیں فراموش نہ کر دیا جائے تو پھر یا تو پڑھے جانے کے قابل چیزیں لکھو یا لکھے جانے کے قابل کام کرو۔''

یہ قول خوشونت سنگھ نے اپنی خودنوشت میں درج کیا ہے۔انھوں نے اس پر عمل کرتے ہوئے ایسی تصانیف یادگار چھوڑیں جو انھیں تا قیامت زندہ رکھیں گی۔انھیں مکمل طور پر ناول نگار کہا جا سکتا ہے نہ محض صحافی۔وہ دراصل ایک عہد ہیں، ایسا عہد جس میں ادب، صحافت، تاریخ اور ذاتی تجربہ ایک دوسرے میں مدغم ہو جاتے ہیں۔ان کی تحریریں آج بھی زندہ ہیں۔اس لیے کہ وہ سچی ہیں اور سچ کبھی پرانا نہیں ہوتا۔

خوشونت سنگھ نے بڑھاپے اور موت پر بھی غیر معمولی سچائی سے لکھا۔98 برس کی عمر میں وہ یہ اعلان کرتے ہیں کہ اب انھیں مزید کتابیں لکھنے کا شوق نہیں۔اب وہ زندگی کو خاموشی سے دیکھنا چاہتے ہیں۔یہ اعتراف کمزور ادیب کا نہیں ایک مطمئن فکری مسافر کا ہے۔ان کے الفاظ ہیں۔

''یوم آزادی 2012 کو میں 98 سال کا ہو گیا۔مجھے اپنی صحت کا بخوبی علم ہے۔مجھے یہ بھی معلوم ہے کہ میں اس کے بعد کوئی دوسری کتاب نہیں لکھ سکوں گا۔۔۔سچ یہ ہے کہ اب میں مرنا چاہتا ہوں۔میں بہت لمبی عمر گزار چکا ہوں''۔

خوشونت سنگھ کے خاندان کے لوگوں بالخصوص والدین نے طویل عمریں پائی تھیں۔ان کے والد کا انتقال 88 برس کی عمر میں ہوا۔والدہ نے 94 برس کی عمر میں آخری سانس لی۔خوشونت سنگھ نے خود 99 برس کی عمر میں اس دنیا کو خیرباد کہا۔مختصر یہ کہ انھوں نے دنیا میں جینے کا جو طریقہ اختیار کیا وہ آسان نہیں تھا۔اس راستے میں تنقید بھی تھی، تنہائی بھی اور بدنامی بھی۔مگر وہ مرد آہن کی طرح ڈٹے رہے۔یہی ادیب کی پہچان ہے۔

ماخذ و مصادر

1. سنگھ، خشونت، پاکستان ایکسپریس، ترجمہ مسعود منور، موڈرن پبلشنگ ہاؤس، گولا مارکیٹ، دریا گنج، نئی دہلی، 1996
2. سنگھ، خشونت، سچ، محبت اور ذرا سا کینہ، آپ بیتی، ترجمہ، محمد احسن بٹ، ایم۔آر پبلی کیشنز، نئی دہلی، 2018
3. Md Jakir hossain,Every place is a palimpsest, A critical reading of Khushwant singh,s Delhi- A Novel,http://museindia.com.
4. Suman Rani and Pawan kumar Sharma,A Critical study of the portrayal of staire in Khushwant Singh's selected novels,International Journal of Advanced Academic Studies

Dr Masood Ahmed
Room No 12,First Floor,
House No.402A/3, Pal dairy,Munirka,
New Delhi-110067
Mob.9797303914

نوشاد کامران

خوشونت سنگھ اور ان کی فکشن نگاری

ہندوستان کی مٹی میں کچھ ایسی اعجاز نمابات ہے کہ یہاں اتحاد و اتفاق، اخوت و ہمدردی کو تحفظ و فروغ دینے والی ہستیاں ہمیشہ رونما ہوتی رہی ہیں جنھوں نے اپنی تحریروں، تقریروں اور عملی کوششوں کے ذریعے ملک کی سالمیت اور امن و آشتی کو قائم رکھنے میں نمایاں کردار ادا کیا۔ انھوں نے ملک کے مظلوم طبقے کے حق میں نہ صرف اپنی جنبش قلم کا استعمال کیا بلکہ ظلم و ناانصافی کے خلاف عملی اقدام بھی کیے۔ ہندوستان کے ایسے ہی جیالوں میں خوشونت سنگھ کا شمار ہوتا ہے۔

خوشونت سنگھ ایک کثیر الجہت انسان تھے۔ وہ بیک وقت ماہر قانون، بالغ النظر صحافی، ذی علم ادیب، کامیاب مدیر، مترجم اور تاریخ داں تھے لیکن انھوں نے خود کو سچا ہندوستانی کہلوانا پسند کیا۔ وہ ہندو مسلم اتحاد اور گنگا جمنی تہذیب کے زبردست حامی اور بہی خواہ تھے۔ انھوں نے اسی تہذیب کو اپنی تخلیقات میں زندہ کرنے کی کوشش کی۔

خوشونت سنگھ کی پیدائش 2فروری 1915 کو ہڈالی، پاکستان میں ہوئی۔ ابتدائی تعلیم اپنے گاؤں سے حاصل کرنے کے بعد انھوں نے گورنمنٹ کالج لاہور میں داخلہ لیا۔ اعلیٰ تعلیم کے لیے وہ ولایت گئے اور وہاں سے بیرسٹری کی تعلیم مکمل کی۔ خوشونت سنگھ تعلیم کے معاملے میں اوسط درجے کے طالب علم تھے۔ انھوں نے پرسار بھارتی میں دیے ایک انٹرویو میں بتایا ہے کہ وہ اپنے دیگر بھائیوں کی نسبت پڑھنے لکھنے میں کمزور تھے وہ کہتے ہیں:

> خوشونت سنگھ ایک کثیر الجہت انسان تھے۔ وہ بیک وقت ماہر قانون، بالغ النظر صحافی، ذی علم ادیب، کامیاب مدیر، مترجم اور تاریخ داں تھے لیکن انھوں نے خود کو سچا ہندوستانی کہلوانا پسند کیا۔ وہ ہندو مسلم اتحاد اور گنگا جمنی تہذیب کے زبردست حامی اور بہی خواہ تھے۔ انھوں نے اسی تہذیب کو اپنی تخلیقات میں زندہ کرنے کی کوشش کی۔

"میرے پتا جی تو چاہتے تھے کہ میں وکالت میں جاؤں، ہم چار بھائی ہیں۔ وہ تین تو پڑھائی میں بہت تیز تھے، فرسٹ ڈویژن لاتے تھے اور ایک میں ہی ہوں جس کو امتحان پاس کرنے میں مشکل رہتی تھی، تھرڈ ڈویژن ملا کرتے تھے۔ انھوں (والد صاحب) نے کہا کہ بھئی ہماری اولاد میں سے یہی ایک نالائق ہے اور یہ بحث مباحثہ بہت کرتا ہے تو اسے وکیل ہی بنائیں تو انھوں نے مجھے ولایت بھیجا بیرسٹری کرنے کے لیے۔"[1]

قانون کی تعلیم مکمل کر کے خوشونت سنگھ واپس ہندوستان آئے اور انھوں نے لاہور میں وکالت کی پریکٹس شروع کر دی لیکن ان کو اس میں کوئی قابل ذکر کامیابی نہیں ملی۔ اسی دوران تقسیم ہند کا واقعہ پیش آیا۔ خوشونت سنگھ تقسیم کے بعد پاکستان سے دہلی آ گئے۔ ہندوستان آنے کے بعد وہ کچھ عرصے کے لیے وزارت خارجہ سے منسلک رہے۔ اس زمانے تک ان کے اندر کا قلمکار ان کی شخصیت پر غالب آ چکا تھا۔ چنانچہ انھوں نے وزارت خارجہ سے خود کو علاحدہ کر لیا اور پورے انہماک کے ساتھ تصنیف و تالیف میں سرگرم ہو گئے۔ انھوں نے ملک کے سربرآوردہ اخبارات و رسائل کی ادارت کی اور اپنی غیر معمولی ادارتی صلاحیت کی بنیاد پر ان جرائد کو نئی بلندیاں عطا کیں۔ ان کے زیر ادارت جریدوں

میں السٹریٹیڈ ویکلی اور ہندوستان ٹائمز قابل ذکر ہیں۔خوشونت سنگھ کے ہفتہ وار کالم ملک اور بیرون ملک کے مختلف پرچوں کی زینت بنتے تھے۔ ان کا عمیق مطالعہ، وسیع مشاہدہ اور طبیعت کی ظرافت ان کی تحریروں کو پروقار اور لطیف بناتے تھے۔ان کے منفرد لب و لہجے اور اچھوتے انداز بیان کی وجہ سے خوشونت سنگھ کا قاری ان کی تحریر کا گرویدہ تھا۔

خوشونت سنگھ نے اگرچہ انگریزی کو اپنے اظہار کا ذریعہ بنایا لیکن ان کی تحریروں پر اردو زبان کے اثرات صاف نظر آتے ہیں۔خوشونت سنگھ اپنے موضوعات کی تشکیل میں ان عناصر کو شامل رکھتے ہیں جہاں سے اردو زبان و ادب کا خمیر تیار ہوا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی تحریریں اردو دنیا کے قارئین کو بھی بہت خوش آتی ہیں۔ خوشونت سنگھ نے متعدد ناول، افسانے، تاریخی کتابیں اور تراجم لکھے ہیں۔ان میں ٹرین ٹو پاکستان(1956)، آئی شیل ناٹ ہیئر دا نائٹ اینگل (1959)، دہلی (1990)، دا کمپنی آف ویمن (1999)، دا سن سیٹ کلب (2005) ہسٹری آف سکھ اور تراجم شکوہ، جواب شکوہ وغیرہ قابل ذکر ہیں۔

خوشونت سنگھ جتنے کامیاب ناول نگار ہیں اتنے عمدہ افسانہ نگار بھی۔موضوعات کی نیرنگی، پرلطف انداز بیان اور ظرافت کی آمیزش ان کے افسانوں کو منفرد و ممتاز بناتے ہیں۔''جب دولت رام مرا''، ''کالی چمیلی''، ''صاحب کی بیوی''، ''تتلی''، ''ناستک'' اور ''مرنے کے بعد'' وغیرہ ان کے بہترین افسانے ہیں۔خوشونت سنگھ اگرچہ انگریزی زبان میں لکھتے تھے مگر اپنی تحریر کے لیے مضامین و موضوعات کا انتخاب وہ ہندوستان کی تہذیب و ثقافت سے کرتے تھے۔انھیں اپنی تہذیب اور اپنے لوگوں سے بے پناہ محبت تھی۔اس کے باوجود انھوں نے کسی خامی یا نقص کو نظر انداز نہیں کیا۔ اپنے افسانوں کے ذریعے انھوں نے رجعت پسندی اور دقیانوسی مکتب فکر پر چوٹ بھی کی۔ ان کی اکثر کہانیوں کے کردار تہ دار ہوتے ہیں۔ یہ کردار شریف یا فرشتہ صفت نہیں ہوتے بلکہ ان میں وہ ساری برائیاں اور خصلتیں پائی جاتی ہیں جو موجودہ زمانے کے عام آدمی میں پائی جاتی ہیں۔ان کے بعض کردار کثرت سے مے نوشی کرتے ہیں اور بیمار پڑتے ہیں، توبہ کرتے ہیں اور پھر پیتے ہیں۔ وہ بنرجی اور مارتھا جیسے کردار خلق کرتے ہیں جو عمر کے آخری حصے میں پہنچ کر بھی جنسی تعلقات قائم کرتے ہیں۔خوشونت سنگھ سر موہن لال جیسا انگریزی داں اور خود پسند کردار بھی تخلیق کرتے ہیں جو خود کو انگریزوں کے موافق بنانے کی کوشش کرتا ہے اور تیسرے درجے کے انگریزوں کے ذریعے دھتکار دیا جاتا ہے۔خوشونت سنگھ اپنے کرداروں کے عادات و اطوار کی تفصیل نہیں بتاتے بلکہ ان کے افعال کے ذریعے قاری کے ذہن پر مثبت و منفی نقش ثبت کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ وہ اپنے افسانوں میں ایسا ماحول پیدا کرتے ہیں کہ ان کا کردار گناہ کرنے کے باوجود گنہگار کے بجائے معصوم و مجبور معلوم ہوتا ہے۔افسانوں کے اختتام پر قاری کے ذہن میں تادیر یہ قصہ باقی رہتا ہے کہ وہ کہانی کے کردار سے نفرت کرتا ہے یا ہمدردی رکھتا ہے۔کرتار سنگھ دگل لکھتے ہیں:

''سب سے بڑی خوبی ان افسانوں کی یہ ہے کہ ان کے تخلیق کار کا دل سمندر جیسا وسیع ہے۔ جو ہمدردی ان افسانوں میں ایک ادیب کی اپنے کرداروں کے لیے مجھے محسوس ہوئی ہے وہ بہت کم ہمارے باقی ادب میں دکھائی دیتی ہے۔ ہمارے افسانوں، ہمارے ناولوں کے برے لوگ صرف برے لوگ ہوتے ہیں ان میں کوئی خوبی دکھائی نہیں جاتی۔ اچھے لوگ صرف اچھے لوگ ہوتے ہیں، مجال ہے کہیں خواب میں بھی کوئی غلطی کر جائیں ...بیمے کا ایجنٹ بڑا گھٹیا آدمی ہے، لیکن اس کو ایسا کہنے سے مصنف آخر تک کتراتا رہتا ہے۔اس افسانے میں تخلیق کار کی اپنے کردار سے جو ہمدردی نظر آتی ہے، اس کی مثال مجھے ہندوستان چھوڑ دنیا کے دوسرے افسانوں میں بھی کہیں کہیں ہی دکھائی دیتی ہے۔''2

اردو زبان میں تقسیم ہند کے نتیجے میں پیش آنے والے واقعات اور فسادات کے موضوع پر، اور انسان مر گیا، میرے بھی صنم خانے، سفینۂ غم دل، آگ کا دریا، خدا کی بستی، غدار، اداس نسلیں، آنگن، لہو کے پھول، ایوان غزل، آخر شب کے ہمسفر، بستی، زمین، تذکرہ، دو گز زمین، خوابوں کا سویرا جیسے ناول لکھے گئے۔ انگریزی زبان میں لکھا گیا خوشونت سنگھ کا ناول ''ٹرین ٹو پاکستان'' بھی اسی نوعیت کا منفرد ناول ہے۔ جس کی شہرت اور مقبولیت کے پیش نظر ڈاکٹر عرفان احمد نے انگریزی سے اردو میں ترجمہ کیا۔

اس ناول میں خوشونت سنگھ نے سرحد پر واقع ایک گاؤں کے لوگوں کے باہمی میل جول اور انتشار و افتراق کے درمیان محبت کی قوت کو ابھارنے کی کوشش کی ہے۔ تقسیم ہند کے زمانے میں جہاں پورا ملک منافرت اور عصبیت کے خوف و ہراس میں مبتلا تھا، پنجاب کا یہ گاؤں اخوت و برادرانہ ہم آہنگی کی مثال بنا ہوا تھا۔ لیکن کچھ ہی دنوں میں اس گاؤں کو بھی فرقہ واریت کی نظر لگ گئی۔ البتہ گاؤں کا ہی ایک بدمعاش جگت سنگھ عرف جگا اپنی جان کی بازی لگا کر منو ماجرا میں

''خوشونت سنگھ جتنے کامیاب ناول نگار ہیں اتنے عمدہ افسانہ نگار بھی۔ موضوعات کی نیرنگی، پرلطف انداز بیان اور ظرافت کی آمیزش ان کے افسانوں کو منفرد و ممتاز بناتے ہیں۔''

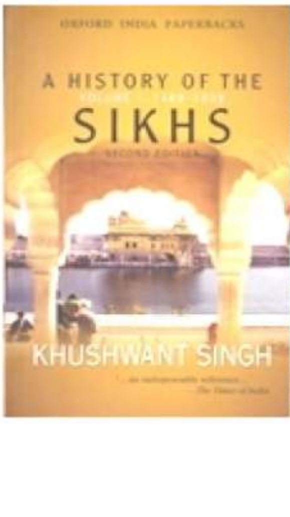

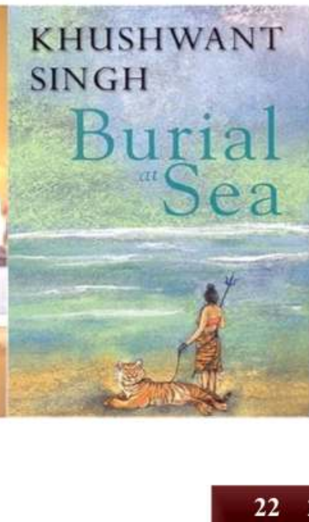

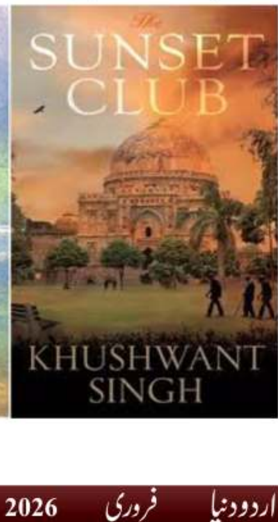

قتل وغارت ہونے سے بچالیتا ہے۔

خوشونت سنگھ نے اس ناول میں جہاں یہ پیغام دینے کی کوشش کی ہے کہ آدمی خواہ کتنا ہی برا ہو جائے اس کے اندر انسانیت کا شرارہ ضرور باقی رہتا ہے جسے ایک مناسب ہوا کا جھونکا کبھی بھی تابندہ کر سکتا ہے۔ یہ ناول اگرچہ بہت نازک اور سنجیدہ موضوع کو محیط ہے مگر خوشونت سنگھ نے ڈاک بنگلے کے واقعات، جیل خانے کے مناظر اور جگا اور نوراں کے معاشقے کے ذریعے ناول کی فضا کو بوجھل اور خشک ہونے سے بچائے رکھا ہے۔ ناول کو پڑھتے ہوئے جہاں غم کی زیریں لہریں طبیعت کو مغموم کرتی ہیں، وہیں لطف وانبساط کی نرم پھوار بھی محسوس ہوتی ہے اور قاری محبت، درد، نفرت، حوصلہ مندی، غصہ، رحم دلی، سازش، جرأت وشجاعت کی وادیوں کو سبک سری کے ساتھ پار کرتا چلا جاتا ہے۔ آزادی کے زمانے کے ہندوستانی گاؤں کے حسین مناظر سادہ دل کسانوں کی روزمرہ زندگی، گرودوارے کا کیرتن، ڈاک بنگلے کی رونق اور اسٹیشن کی گہما گہمی کی بہترین تصویریں ناول میں جگہ جگہ نظر آتی ہیں۔ اس کی اہمیت اور معنویت کی بنا پر ہی 1998 میں پامیلا روکس نے اس ناول پر فلم بنائی جو بہت پسند کی گئی۔

خوشونت سنگھ کا ایک اور ناول 'دہلی' ہے جو ایک نیم تاریخی ناول ہے۔ اردو میں فردوس بریں، لہو کے پھول، داراشکوہ، آگ کا دریا، اداس نسلیں، کئی چاند تھے سر آسماں' وغیرہ اسی قبیل کے بہترین ناول ہیں۔ خوشونت سنگھ نے اس ناول میں عہد وسطی اور عہد جدید کی دہلی کی تاریخ کو پیش نظر رکھا۔ انھوں نے سات سو برس سے زائد عرصے پر مبنی دہلی کی تاریخ کو افسانوی قالب میں ڈھالا ہے۔ اس ناول میں جہاں حکومتوں کے قائم ہونے اور تاراج ہوجانے کے درمیان سلاطین وامرا کا جاہ وجلال، تزک واحتشام نظر آتا ہے وہیں اس معاشرت کی مخدوش تصویریں بھی دکھائی دیتی ہیں۔ اس تاریخی بیانیہ میں مختلف ادوار کی دہلی میں رائج امرد پرستی اور شہوانیت کو بھی ناول میں بے کم وکاست بیان کیا گیا ہے۔

اس ناول کو پڑھتے ہوئے قاری خود کو بھی اس عہد و ماحول کا حصہ سمجھتا ہے جہاں غیاث پور کے صوفی دربار لگاتے ہیں اور عوام کا ہجوم ہوتا ہے۔ ان کے پردہ فرمانے کے بعد امیر خسروان کے مزار پر پہنچتے ہیں تو لوگ یہ دیکھنے کے لیے جمع ہونے لگتے ہیں کہ اگر امیر خسروان کی قبر کے قریب گئے تو محبوب الٰہی وصیت کے مطابق اپنے عارف باللہ مرید کو گلے لگانے کے لیے مدفن سے باہر نکل آئیں گے۔ امیر خسرو آہ و زاری کرتے ہوئے آگے بڑھتے ہیں مگر حضرت نصیر الدین چراغ دلی انھیں مضبوطی کے ساتھ گلے لگا لیتے ہیں۔ ناول میں اس طرح کے تاریخی واقعات افسانوی صورت میں جگہ جگہ موجود ہیں۔ علاء الدین خلجی، محمد بن تغلق، شاہ جہاں، اورنگ زیب جیسی تاریخی ہستیاں

خوشونت سنگھ کاایک اور ناول 'دھلی' ھے جوایک نیم تاریخی ناول ھے۔ اردو میں فردوس بریں، لھو کے پھول، داراشکوہ، آگ کا دریا، اداس نسلیں، کئی چاند تھے سر آسماں' وغیرہ اسی قبیل کے بہترین ناول ھیں۔ خوشونت سنگھ نے اس ناول میں عھد وسطی اور عھد جدید کی دھلی کی تاریخ کو پیش نظر رکھا۔انھوں نے سات سو برس سے زائد عرصے پر مبنی دھلی کی تاریخ کو افسانوی قالب میں ڈھالا ھے۔

اپنے کروفر کے ساتھ نظر آتی ہیں۔ متعدد فرضی کردار بھی زیب داستان کے لیے خلق کیے گئے ہیں۔ ان میں بھاگ متی کا کردار مرکزی حیثیت کا حامل ہے۔

اس ناول میں شہر دہلی خود ایک جیتے جاگتے کردار کی طرح محسوس ہوتا ہے جو وقت کے ساتھ ساتھ تخریب وتعمیر کے مرحلے سے گزرتا ہے۔ اسی بنتی بکھرتی دہلی میں ادبی سرگرمی بھی آب وتاب کے ساتھ نظر آتی ہے۔ عوام وخواص کی شعر وشاعری سے دلچسپی، سلاطین وامرا کا شعری محفلیں قائم کرنا اور شعرا وادبا کی سرپرستی قابل دید ہے۔ خوشونت سنگھ نے اس ناول میں اشعر الشعرا میر تقی میر کے حوالے سے پورا ایک باب قائم کیا ہے۔ اس میں انھوں نے میر کی زندگی کی کہانی انھیں کی زبانی کہلوائی ہے۔ آگرے کی ادبی فضا اور ایک باصلاحیت نوجوان کی پروان چڑھتی شاعری، ادبی حلقوں میں اس شہرت اور دیگر شاعروں سے ادبی چشمک کو ناول میں خوبصورتی سے بیان کیا گیا ہے۔ چونکہ خوشونت سنگھ کامیاب مترجم بھی تھے لہٰذا انھوں نے میر کے کئی اشعار کا ترجمہ بھی بلا تکلف ناول میں شامل کیا ہے۔ میر تقی میر کا شعر ہے ؎

کچھ نہ دیکھا پھر بجز یک شعلۂ پر پیچ وتاب
شمع تک تو ہم نے دیکھا تھا کہ پروانہ گیا

اس شعر کا ترجمہ خوشونت سنگھ نے کیا ہے:

The Flame it saw,
But thereafter nothing besides the curving,
Leaping tonques of fire.
By the time its eyes were on the flame,
The moth was in the fire.3

خوشونت سنگھ نے اس میں شعر کہانی کے بہاؤ میں نہ صرف مدد لی ہے بلکہ پروانہ سے ان کے ادبی چشمک کے ضمن میں اس شعر کو استعمال کر کے لطف کو دوآتشہ کر دیا ہے جو ان کی شعر فہمی اور حس مزاح پر دال ہے۔ ناول کے اس حصے کو پڑھتے ہوئے شمس الرحمٰن فاروقی کے ناول ''کئی چاند تھے سر آسماں'' کے اس حصے کی یاد آنا لازمی ہے جہاں انھوں نے نواب مرزا خان داغ دہلوی کا ذکر کیا ہے۔

خوشونت سنگھ کی دہلی محفل کی طرح متعدد بار سجتی ہے اور اجڑ جاتی ہے۔ انگریزوں کے زمانے میں بھی دہلی پر ستم ڈھائے جاتے ہیں۔ اس ناول کے ذریعے خوشونت سنگھ نے یہ پیغام دینے کی کوشش کی ہے کہ بار بار منہدم ہونے کے باوجود شہر دہلی کی رونق روز افزوں ہے۔

اس ناول کے بارے میں خوشونت سنگھ کہتے ہیں کہ ناول لکھنے کا ان کا واحد مقصد یہ تھا کہ جس طرح وہ دہلی کو جانتے ہیں اپنے قاری کو بھی اس سے متعارف کر سکیں اور جتنی شدید محبت ان کے دل میں دہلی کے لیے ہے ویسی ہی محبت اپنے قارئین کے دل میں بھی پیدا کر سکیں۔ ناول پڑھ کر بلا خوف تردید کہا جا سکتا ہے کہ خوشونت سنگھ اپنے قارئین کے دل میں دہلی اور ہندوستان کی محبت کو جاگزیں کرنے میں کامیاب ہیں۔

حواشی

1 htttps://www.youtube.com/watch?v=f_7Wk32j2HM
2 Delhi A Novel by Khushwant Singh Digital Edition 2011
3 ''خوشونت سنگھ کے بہترین افسانے'' از خوشونت سنگھ ترجمہ وترتیب آصف نواز۔ صفحہ 37، مکتبہ شعر وادب، لاہور

Mohd Naushad
Malik Mohammad Bharti Inter College
Jais, Amethi (U.P) 229305
Mob:9452795731

خوشونت سنگھ کی ادبی خدمات

پرواز احمد

جدید ہندوستان کی تاریخ میں جن اہم شخصیات نے اپنے قلم اور فکر وخیال سے روشن باب کا اضافہ کیا ہے، ان میں خوشونت سنگھ کا نام قابل ذکر ہے۔ وہ بنیادی طور پر صحافی اور کالم نویس تھے لیکن ان کی تخلیقی اور تحریری صلاحیتوں کا اظہار مختلف اصناف نثر میں ہوا ہے۔ وہ ایک مشہور فکشن نگار، تاریخ نویس، نقاد، قانون داں اور سیاست کی سوجھ بوجھ رکھنے والے شخص تھے۔ ان کی تحریریں اپنی بے باکی اور بصیرت سے پر تخلیقیت کے سبب ہمیشہ پڑھی جاتی رہی ہیں۔

خوشونت سنگھ کی پیدائش ہڈالی، موجودہ پاکستان میں 1915 میں ہوئی۔ اس وقت ان کا نام خوش حال سنگھ رکھا گیا۔ ان کی پیدائش کی دو مختلف تاریخیں بتائی جاتی ہیں۔ ان کے والد کے مطابق وہ 2 فروری 1915 کو پیدا ہوئے، جبکہ ان کی دادی سال 1915 کے ماہ اگست کا ذکر کرتی ہیں لیکن تاریخ نہیں بتاتی۔ خوشونت سنگھ نے خود اپنی تاریخ پیدائش 15 اگست 1915 طے کیا ہے البتہ دستاویزوں میں 2 فروری 1915 ہی درج ہے۔ خوشونت سنگھ اپنی آپ بیتی میں اس بابت لکھتے ہیں:

''کئی برس بعد جب اسے ماڈرن اسکول دہلی میں ہمارے داخلے کے لیے فارم پر کرنا پڑے تو میرے باپ نے میرے بڑے بھائی اور میری پیدائش کی تاریخ قیاسی طور پر درج کر دی تھی۔ میری پیدائش کی تاریخ 2 فروری 1915 درج کی گئی تھی۔ برسوں بعد میری دادی نے مجھے بتایا تھا کہ میں ....شاید اگست میں پیدا ہوا تھا۔ میں نے فیصلہ کیا کہ اپنی پیدائش کی تاریخ مہینے کے وسط میں متعین کروں سو یہ طے ہوئی 15 اگست 1915 اور میں نے خود کو اسد قرار دے لیا۔ بتیس برس بعد 15 اگست آزاد ہندوستان کا جنم دن (برتھ ڈے) بن گیا۔''[1]

> خوشونت سنگھ نے اسکول میں انتخابی مضمون کے طور پر اردو زبان کا انتخاب کیا تھا۔ بچپن میں اپنے والد کوعدالتوں اور کچہریوں کے چکر لگاتے دیکھ کر انھوں نے قانون کی تعلیم حاصل کرنے کا فیصلہ کرلیا۔

خوشونت سنگھ کے خاندان کا شمار ضلع خوشاب، ریاست پنجاب کے نہایت خوش حال تاجر اور عزت دار خانوادے میں ہوتا تھا۔ ان کے آبا واجداد ایک زمانے سے اونٹوں کے ذریعے کھیوڑہ سے چٹانی نمک اور کھجوریں لاکر لاہور اور امرتسر میں فروخت کیا کرتے تھے اور واپسی میں اپنے ساتھ مٹی کا تیل، چائے، چینی، مصالحہ جات اور دیگر اشیا لاتے اور انھیں گاؤں گاؤں فروخت کرتے۔ خوشونت سنگھ کے والد نے مختلف کاروبار میں زور آزمائی کی، مگر خاطر خواہ کامیابی نہ مل سکی۔ خوشونت سنگھ کے چچا اجل سنگھ خاندان کے پہلے شخص تھے، جنھوں نے ماسٹرز کی ڈگری حاصل کی تھی۔ ان کا شمار پنجاب کے بڑے زمینداروں میں ہوتا تھا۔ بعد میں وہ قانون ساز اسمبلی کے رکن اور پنجاب کے وزیر مالیات اور گورنر بھی بنے۔ آخری عمر میں وہ تامل ناڈو کے گورنر رہے۔ اس طرح یہ کہا جا سکتا ہے کہ خوشونت سنگھ کا خاندان خوش حال، تعلیم یافتہ اور سیاسی اثر ورسوخ رکھتا تھا۔ خوشونت سنگھ کی شخصیت پر اس کا مثبت اثر پڑا۔

خوشونت سنگھ کے والد نے اپنے کاروبار کی وجہ سے دہلی میں سکونت اختیار کر لی تھی، اس لیے ان کی تعلیم وتربیت دہلی میں ہوئی۔ انھوں نے اپنی ابتدائی تعلیم ماڈرن اسکول دہلی سے اور بارہویں جماعت سینٹ اسٹیفن کالج، دہلی سے مکمل کی۔ خوشونت سنگھ کی طالب علمی کا زمانہ ہندوستان کی تحریک آزادی کی شدت کا زمانہ تھا۔ ایک طرف قوم پرستی کی تحریک اپنے عروج پر تھی تو دوسری طرف استعماری تشدد بھی اپنی انتہا پر تھی۔ بھگت سنگھ، سکھ دیو اور راج گرو کو حکومت نے

تختۂ دار پر لٹکا دیا تھا، جس کے خلاف ملک کے بیشتر اسکول کالج کا تعلیمی نظام معطل ہو گیا تھا، مگر سینٹ اسٹیفن کالج بند نہیں ہوا تھا۔ قوم پرستی کی تحریکات سے متاثر ہو کر خوشونت سنگھ اسکول کی چھت سے ترنگا لہرا کر بھگت سنگھ زندہ باد کے نعرے لگانے لگے۔

خوشونت سنگھ نے اسکول میں انتخابی مضمون کے طور پر اردو زبان کا انتخاب کیا تھا۔ بچپن میں اپنے والد کو عدالتوں اور کچہریوں کے چکر لگاتے دیکھ کر انھوں نے قانون کی تعلیم حاصل کرنے کا فیصلہ کرلیا۔ انھوں نے 1934 میں گریجویشن کی ڈگری گورنمنٹ کالج لاہور سے حاصل کی۔ ان سے پہلے ان کے خاندان میں کسی نے قانون کی تعلیم حاصل نہیں کی تھی۔ قانون کی مزید تعلیم حاصل کرنے کی غرض سے انھوں نے کنگز کالج لندن میں داخلہ لیا اور ایل۔ ایل۔ بی۔ کی سند حاصل کی۔ لاہور عدالت میں انھوں نے کچھ دن وکالت کی اور اس کے بعد وہ ہندوستان کی وزارت خارجہ سے وابستہ ہو گئے۔

خوشونت سنگھ کی صحافتی زندگی کا آغاز 1951 میں بطور ناشر آل انڈیا ریڈیو سے ہوا۔ وہ مختلف اخبارات و رسائل سے منسلک رہے۔ 1951 سے 1953 تک وہ رسالہ 'یوجنا' کے مدیر رہے۔ 1969 سے 1979 تک ممبئی سے شائع ہونے والے مشہور ہفت روزہ انگریزی نیوز 'السٹریٹڈ ویکلی آف انڈیا' کے مدیر رہے اوران کی ادارت میں یہ جریدہ شہرت کی بلندیوں پر پہنچا۔ 1978 سے 1979 تک وہ 'نیشنل ہیرالڈ'، 1979 سے 1980 تک 'نیو دہلی' اور 1980 سے 1983 تک 'ہندوستان ٹائمز' جیسے اہم اور مشہور زمانہ اخبارات کے مدیر رہے۔ خوشونت سنگھ نے اپنے عہد کے تقریباً تمام اہم اور نامور ملکی و غیر ملکی اخبارات و جرائد کے لیے کالم لکھے۔

ادب اور تعلیم کے میدان میں خوشونت سنگھ کی خدمات کا اعتراف کرتے ہوئے انھیں 1974 میں پدم بھوشن کا اعزاز عطا کیا گیا۔ گولڈن ٹیمپل حادثے میں ہندوستان کی مرکزی حکومت کے رویے سے ناراض ہو کر انھوں نے پدم بھوشن ایوارڈ واپس کر دیا تھا۔ 2007 میں انھیں پدم وبھوشن کے اعزاز سے نوازا گیا۔ 1980 سے 1986 تک وہ راجیہ سبھا کے رکن بھی رہے۔ اس طرح یہ کہا جا سکتا ہے کہ انھوں نے فکری سطح پر ایک متمول اور خوشحال زندگی بسر کی اور 20 مارچ 1914 کو ان کا انتقال ہوا۔

خوشونت سنگھ کی فکری تشکیل میں تحریک آزادی اور ہندوستان کے سیاسی انتشار، برطانوی استعمار کی بربریت اور ان کے عہد میں رونما ہونے والے سیاسی، سماجی اور تہذیبی بدلاؤ نے اہم کردار ادا کیا۔ ان کی زندگی کا بیشتر حصہ دہلی اور نواح دہلی میں گزرا۔ اس وقت یہ علاقہ تمام قسم کی سیاسی، سماجی اور تہذیبی سرگرمیوں کی آماجگاہ تھا۔ انھوں نے 1931 میں بھگت سنگھ کی پھانسی دیکھی، 1942 کی تحریک بھارت چھوڑو کو قریب سے دیکھا۔ 1947 کی تقسیم اور آزادی کا مشاہدہ جاگتی آنکھوں سے کیا۔ ہجرت، نقل مکانی اور در بدری کو برداشت کیا۔ غرض جدید ہندوستان اور آزاد ہندوستان کے تمام مشکل ادوار کو انھوں نے دیکھا اور برداشت کیا۔ اس درمیان سیاسی بازیگری کے ساتھ غربت، افلاس، فرقہ واریت، ذات پات کی تفریق، عدم مساوات اور معاشرتی برائیوں کو انھوں نے نہ صرف قریب سے دیکھا بلکہ انھیں اپنے فکر و خیال کا حصہ بنایا اور اپنی تحریروں میں بے باکی کے ساتھ اس کا اظہار بھی کیا۔

ادب اور تعلیم کے میدان میں خوشونت سنگھ کی خدمات کا اعتراف کرتے ہوئے انھیں 1974 میں پدم بھوشن کا اعزاز عطا کیا گیا۔ گولڈن ٹیمپل حادثے میں ہندوستان کی مرکزی حکومت کے رویے سے ناراض ہو کر انھوں نے پدم بھوشن ایوارڈ واپس کر دیا تھا۔ 2007 میں انھیں پدم وبھوشن کے اعزاز سے نوازا گیا۔

ادب و سیاست میں خوشونت سنگھ کی دلچسپی اسکول کے زمانے سے ہی پیدا ہو گئی تھی۔ اسی زمانے میں ایک عالمی ادبی تحریک کا قیام عمل آیا۔ 1935 میں پیرس میں ادیبوں کی ایک کانفرنس ہوئی۔ جس کا مقصد ادب میں عوام کی نمائندگی اور عام لوگوں کے حق کی آواز بلند کرنا تھا۔ ہندوستان میں اس تحریک کا باضابطہ آغاز سجاد ظہیر اور ملک راج آنند کی عملی و قلمی کوششوں سے ہوا۔ اس تحریک سے اس وقت کے تقریباً تمام شعرا و ادبا متاثر ہوئے اور اپنے فکر و فن کا محور تبدیل کرنے پر اپنی رضامندی کا اظہار کیا۔ حقیقت نگاری اور راست گوئی پر مائل ہوئے۔ خوشونت سنگھ بھی اس تحریک اور نظریۂ ادب و حیات سے متاثر تھے۔ وہ لکھتے ہیں۔

''میں نے ملک راج آنند، راجا راؤ اور آر۔ کے۔ نارائن کو پڑھا۔ میں نے محسوس کیا کہ میں انھیں کے جیسے لکھ سکتا ہوں اور اگر وہ بیرون ملک مشہور ہو سکتے ہیں تو میں بھی ہو جاؤں گا۔''[2]

جیسا کہ ابتدا میں عرض کیا جا چکا ہے کہ خوشونت سنگھ کی بنیادی شناخت صحافی کی ہے لیکن انھوں نے انگریزی زبان میں ناول اور افسانے بھی لکھے ہیں۔ بطور فکشن نگار ان کے ناول 'Train to Pakistan' کو بہت شہرت ملی۔ اس کے علاوہ انھوں نے 'Delhi: a novel'، 1990 اور 'The Company of Women'، 1999 جیسے ناول لکھے۔ ان کے افسانوں کے مجموعے 'Mark of Vishnu'، 1950، 'Paradise and other Stories'، 2004 اور 'A Bride of the Saheb and Other Stories' شائع ہو چکے ہیں۔

تقسیم ہند کے تعلق سے ان کا لکھا گیا ناول 'Train to Pakistan' کلاسک کا درجہ رکھتا ہے۔ یہ ناول انگریزی زبان میں لکھا گیا ہے جس کا اردو ترجمہ مسعود منور نے 'پاکستان ایکسپریس' کے نام سے کیا ہے۔ یہ ناول تقسیم ہند کے المیے، تشدد اور قربانیوں کو پیش کرتا ہے۔ اس کے مطالعے سے لوگوں کے ظاہر اور پوشیدہ چہرے بے نقاب ہوتے ہیں۔ یہ تقسیم کے سیاسی اثرات کے بجائے عام لوگوں کی زندگی کی پریشانی اور دربدری کو پیش کرتا ہے۔ دنیا کی بیشتر زبانوں میں اس کا ترجمہ ہو چکا ہے۔ 1998 میں اس ناول پر مبنی 'Train to Pakistan' نام سے ہی فلم بھی بن چکی ہے۔

'Delhi: A Novel' تاریخی اور منفرد ناول ہے، جسے ناقدین اور قارئین دونوں نے بہت سراہا۔ یہ محض ایک کہانی نہیں ہے بلکہ دہلوی تہذیب و تمدن کا ایک جامع مرقع ہے جس میں جذباتی تصویر کشی بھی ملاحظہ کی جاسکتی ہے۔ یہ بیانیہ تاریخ اور ذاتی تجربے کے اشتراک سے وجود میں آیا ہے۔ یہ ناول تیرہویں صدی میں غیاث الدین بلبن کے دور حکومت سے شروع ہوکر 1984 کے سکھ مخالف فسادات تک دہلی کی تین ہزار سال کی تاریخ کو محیط ہے۔ اس میں دہلی کی کئی سلطنتوں کے عروج و زوال کو 21 ابواب میں پیش کیا گیا ہے۔

2003 میں جیکو پبلشنگ ہاؤس، ممبئی سے ایک کتاب Five Indian Masters کے نام سے انگریزی زبان میں شائع ہوئی۔ اس میں ہندوستان کے صرف پانچ افسانہ نگاروں یعنی راجا راؤ، رابندر ناتھ ٹیگور، پریم چند، ڈاکٹر ملک راج آنند اور خوشونت سنگھ کی اہم کہانیاں شامل ہیں۔ ان کہانیوں میں ہندوستانی تہذیب وتمدن اور انسانی جذبات کی بہترین عکاسی ملتی ہے۔ خوشونت سنگھ کی ادبی اہمیت اور مرتبے کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ ہندوستان کی افسانہ نگاری کی تقریباً صدسالہ تاریخ میں صرف پانچ ناموں کا انتخاب ہوا تو اس میں خوشونت سنگھ کا نام بھی شامل تھا۔

دوجلدوں پر خوشونت سنگھ کی کتاب 'AHistory of the Sikh' ایک اہم تاریخی اور تہذیبی دستاویز کی حیثیت رکھتی ہے۔ اس میں سکھ مذہب اور سکھوں کی سیاسی، معاشرتی اور تہذیبی تاریخ بیان کی گئی ہے۔ اس موضوع پر یہ کتاب مستند حوالے کا حکم رکھتی ہے۔ اس کتاب سے خوشونت سنگھ کی تاریخی بصیرت اور تاریخ نویسی سے آگاہی کا علم ہوتا ہے۔

خوشونت سنگھ کی تمام تصانیف میں اس عہد کی تلخی اور ظلم و جبر کو بڑی بے باکی کے ساتھ پیش کیا گیا ہے۔ انھوں نے فکشن کے میدان میں جو تخلیقات یادگار چھوڑی ہیں ان سے اس عہد میں موجود انسانوں کے احساسات و جذبات، تہذیب و ثقافت، وطن پرستی اور سماجی زندگی کو راست انداز میں پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔

خوشونت سنگھ کی سوچ، فکر اور ان کی تصنیفات پر ایک زمانے سے بحث و مباحثے مختلف زبان و ادب میں ہوتے رہے ہیں۔ خوشونت سنگھ کا تعلق بنیادی طور پر انگریزی ادب سے ہے۔ وہ اردو شاعری کی بھی عمدہ فہم اور بصیرت رکھتے تھے۔ اس کا اظہار ان کے ناول 'Delhi: A Novel' میں بہتر طور پر ہوا ہے۔ مثال کے طور پر ناول 'Delhi: A Novel' کا باب 'میر تقی میر' ملاحظہ کیا جاسکتا ہے۔ اس باب میں میر تقی میر کے عہد کے سیاسی و سماجی حالات کو وہ میر اور ان کی شاعری کے ذریعے پیش کرنے کی کوشش کرتے ہیں:

"The flame it saw,
But thereafter nothing besides the curving,
leaping togues of fire.
By the time its eyes were on the flame,
*The moth was in the fire*5

"A simmering fire burns our hearts away;
We sink and my heart in depth of agony lies;
As with the the toper of the lamp
*Lops up the last drops of oil and dies"*6

خوشونت سنگھ کے حافظے میں اردو کے اشعار تھے اور جب وہ اپنی خودنوشت لکھتے ہیں تو ان کا کثرت سے استعمال کرتے ہیں۔ اقبال سے انھیں قلبی لگاؤ تھا۔ وہ کلام اقبال میں شکوہ اور جواب شکوہ کو بطور خاص اہم تصور کرتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ انھوں نے ان دونوں نظموں کا انگریزی میں ترجمہ کیا، جو 1981 میں آکسفورڈ، دہلی پریس سے شائع ہوا۔ اس کے علاوہ انھوں نے اردو کے اولین اہم ناول 'امراؤ جان ادا' کا بھی انگریزی ترجمہ کیا ہے۔

خوشونت سنگھ کا تعلق بنیادی طور پر انگریزی ادب سے ہے۔ وہ اردو شاعری کی بھی عمدہ فہم اور بصیرت رکھتے تھے۔ اس کا اظہار ان کے ناول 'Delhi: A Novel' میں بہتر طور پر ہوا ہے۔ مثال کے طور پر ناول 'Delhi: A Novel' کا باب 'میر تقی میر' ملاحظہ کیا جاسکتا ہے۔

خوشونت سنگھ کا زمانہ اردو شعر و ادب کے عظیم قلمکاروں کا زمانہ تھا۔ ان کے معاصرین میں اردو زبان و ادب سے تعلق رکھنے والے شعرا و ادبا میں عصمت چغتائی، کرشن چندر، راجندر سنگھ بیدی، شوکت صدیقی، انتظار حسین، سعادت حسن منٹو، فیض احمد فیض، میراجی، ساحر وغیرہ کے نام خصوصیت کے ساتھ قابل ذکر ہیں۔ ان کا زمانہ ایک تھا، حالات ایک جیسے تھے، ظلم و جبر کا استعماری نظام یکساں تھا اور ان کا تخلیقی رویہ بھی کم و بیش ایک جیسا تھا۔ فرق صرف زبان کا تھا۔ خوشونت سنگھ انھیں موضوعات و مسائل کو انگریزی میں پیش کرتے رہے جبکہ دیگر ہندوستانی زبانوں کے شعرا و ادبا نے ہندوستان کی مختلف زبانوں میں ان کا اظہار کیا۔ مثال کے طور پر کرشن چندر نے تقسیم ہند کے سانحے اور اس وقت ہونے والی قتل و غارت گری کو جس انداز میں پیش کیا ہے، ایسا خوشونت سنگھ کے یہاں بھی دیکھا جاسکتا ہے۔ کرشن چندر نے 'امرتسر آزادی سے پہلے' اور 'امرتسر آزادی کے بعد' جیسے افسانے لکھے اور اسی طرز پر خوشونت سنگھ نے 'Train to Pakistan' تخلیق کیا۔

خوشونت سنگھ کی تخلیقات اور دیگر تحریروں کے مطالعے سے یہ نتیجہ اخذ کیا جاسکتا ہے کہ انھوں نے اپنے عہد کو بہتر طور پر سمجھنے کی کوشش کی اور ان کا عمدہ اظہار اپنی تحریروں کے ذریعے کیا۔ وہ ایک عمدہ فکشن نگار تھے، ساتھ ہی انھوں نے بصیرت افروز سیاسی و سماجی کالم لکھے، جن سے قارئین کا ایک بڑا طبقہ متاثر ہوا۔

حواشی

1. سچ محبت اور ذرا سا کینہ: خوشونت سنگھ، مترجم: احسن بٹ، ایم۔ آر۔ پبلیکیشنز، نئی دہلی، 2018، صفحہ نمبر 8
2. ایضاً، صفحہ نمبر 381
3. Delhi: A Novel, Khushwant Singh,Penguin Books,1990, page No.170
4. ایضاً، صفحہ نمبر 176

Parwaz Ahmed
Research Scholar, Department of Urdu
Banaras Hindu University,Varanasi
mob:7753027349
Email:ahmedvns111@gmail.com

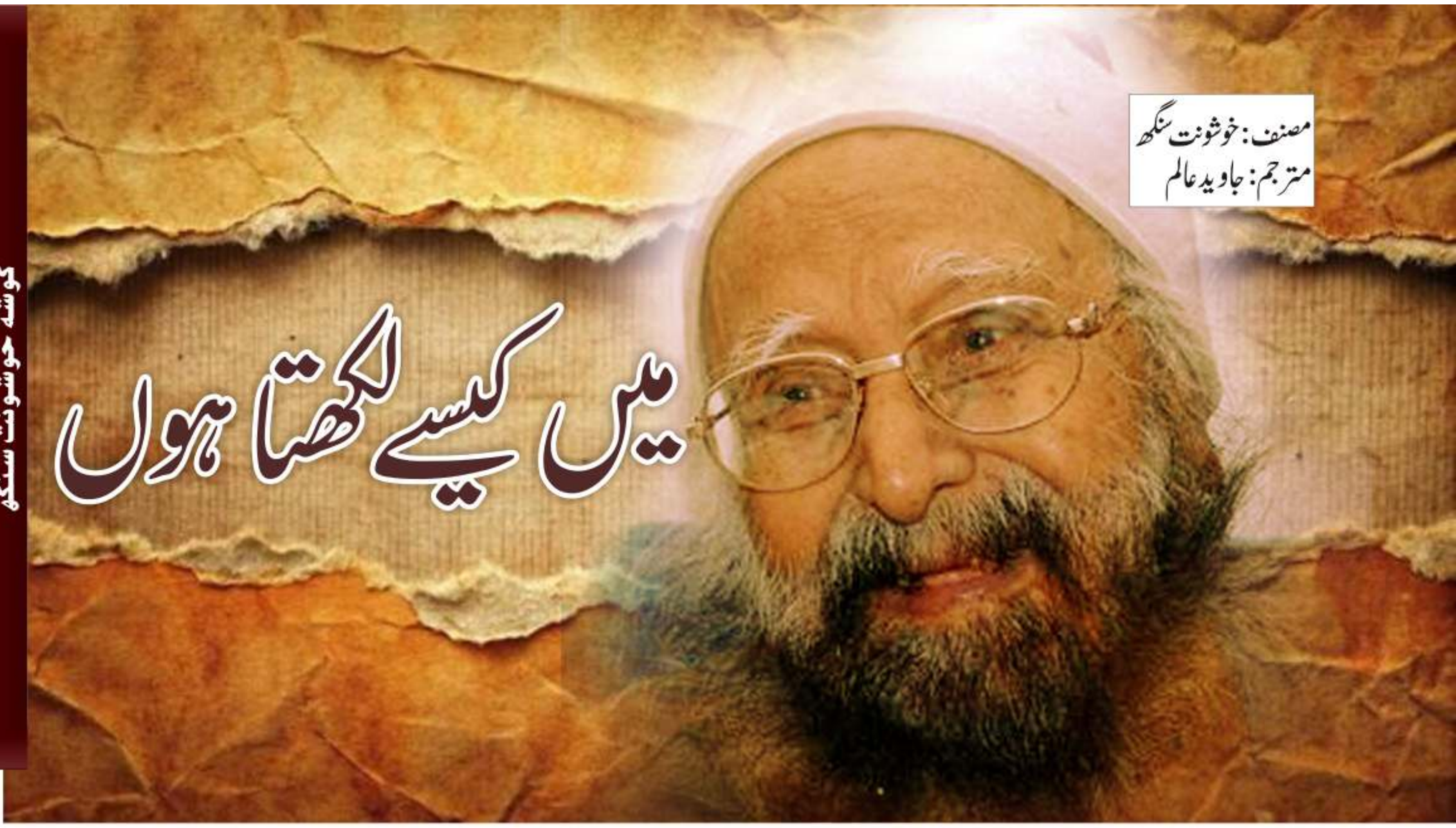

میں کیسے لکھتا ہوں

مصنف: خوشونت سنگھ
مترجم: جاوید عالم

مجھے ان لوگوں پر رشک آتا ہے جو یہ کہتے ہیں کہ لکھنے میں انھیں کیف و سرور حاصل ہوتا ہے۔ میرے ساتھ ایسا بالکل نہیں ہے۔ اگر میں ترغیب کا انتظار کروں تو کچھ بھی نہیں لکھ سکتا۔ مجھے خود کی شدت سے تادیب کرنی پڑتی ہے۔ میں 5-4 بجے کے درمیان اُٹھ جاتا۔ کپ میں خود کے لیے جن سنگ (Ginseng): ایک جڑی بوٹی جس کا استعمال مختلف ادویات بنانے کے لیے کیا جاتا ہے، کا ایک کپ تیار کرتا اور اپنے نوٹس لے کر بیٹھ جاتا، اپنے مواد کو منظم کرتا۔ ٹیک کی لکڑی کے فرنیچر سے آراستہ یہ خوب صورت کمرہ مجھے مطالعہ کے لیے میرے والد نے دیا تھا۔ اس میں ایک منقش ایرانی قالین اور آتش دان ہے۔ اس کمرے سے ملحقہ حصے میں یَوونی (Yvonne) میرے چچازاد بھائی کلبیر (Kulbeer) کے ساتھ بیٹھتا۔ (یوونی اخیر تک اسے کلبر کہتا رہا) وہ میرے والد کے سکریٹری کے فرائض انجام دیتا تھا۔ میں نے تہیہ کر رکھا تھا کہ جب تک میری میز پر رکھے ہوئے سارے سادہ کاغذ بھر نہیں جائیں گے، میں اپنی کرسی سے نہیں اٹھوں گا۔ اکثر و بیشتر یہی ہوتا کہ میں جو کچھ لکھتا اسے پڑھ پانا دشوار ہوتا تھا۔ اسے میں ٹائپ کراتا اور پھر دوبارہ لکھتا۔ کبھی کبھی میں ایک ہی سطر کو پانچ یا چھے بار لکھتا جب تک کہ وہ پڑھنے کے قابل نہیں ہو جاتی۔ پھر میں کام روک کر کافی پیتا۔ کچھ دن چڑھنے پر کافی پینا میرے والدین کے گھر کا معمول تھا۔ اس تقریب کی صدارت میری والدہ کرتیں اور ہر ایک کے سامنے کافی، کریم اور شکر پیش کرتیں۔ کئی ایک مہمان بھی ہمارے ساتھ کافی پینے کے لیے آجاتے۔

میرے قارئین ان حالات سے واقف ہیں جنھوں نے مجھے شعبہ قانون سے ہٹا کر فورن سروس میں اور اس کے بعد رابطۂ عامہ نیز درس و تدریس اور بالآخر صحافت اور تصنیف کی جانب مہمیز کیا۔ یہاں ان مصنفوں کا ذکر بھی ناگزیر ہے جن سے میری شناسائی رہی، جنھوں نے مجھے متاثر کیا، اور اس کا بھی کہ مصنف بننے کے لیے کیا مسائل درپیش ہوتے ہیں، کیا تصنیف کوئی تفریحی شے ہے یا اس کے دم پر زندگی بھی بسر کی جاسکتی ہے؟

اسکول اور کالج میں میری خراب کارکردگی کے باوجود بچپن سے ہی مجھے ادیب بننے کی خواہش تھی۔ جونیئر اسکول کے زمانے میں ہی میں نے ایک ناول لکھنے کے لیے ایک کاپی خریدی تھی جس کے پہلے صفحے پر میں نے جلی حروف میں ناول کا عنوان درج کیا تھا: شیلا از خوشونت سنگھ۔ ان دنوں سیدھے سادے Sheilla نام کی بہ نسبت، جس میں صرف ایک 'L' ہوتا تھا، مجھے نام کچھ زیادہ ہی ماڈرن لگتا تھا۔ وہ کھلاڑی لڑکیاں مجھے مسحور کرتی تھیں جو بالوں کی دو چٹیا لال پھیتوں سے باندھتیں، ہاف پینٹ پہنتیں اور لڑکوں سے ہنس ہنس کر باتیں کرتی تھیں۔ میں کاپی لیے کئی دنوں تک اپنی ہیروئن کو تلاش کرتا رہا، میں نے شاید کچھ سطریں بھی لکھیں، لیکن SHEILLA کبھی مکمل نہیں ہوئی۔

برطانیہ میں کالج کے پانچ برس اور بالخصوص Inns of Court کی تعلیم کے دوران میری لکھنے کی خواہش نے قدرے زیادہ ٹھوس شکل اختیار کی۔ میں قانون کی کتابوں سے بیزار تھا اور افسانے یا شاعری پڑھ کر میں محظوظ ہوتا تھا۔ خوش نصیبی یہ رہی کہ جو کچھ میں نے ہندستان میں پڑھا تھا اس کا ایک بڑا حصہ میرے حافظے میں محفوظ رہ گیا تھا۔ مجھے اس بات کا بھی شدید احساس تھا کہ شاعری اگر شاعر کی داخلی دنیا کا اظہار ہے تو نثر لکھنے کے لیے وسیع مطالعے اور اس سے بھی کچھ زیادہ نثر لکھنے کے لیے ذخیرۂ الفاظ پر قدرت ضروری ہے۔ میں ہمیشہ اپنے ساتھ لغت رکھتا اور جو لفظ سمجھ سے پرے ہوتے انھیں نشان زد کر لیتا۔ میں نے بائبل دوبارہ پڑھی جس سے میرا تعارف سینٹ اسٹیفنس کالج (دہلی) ہی میں ہو چکا تھا۔ (انجیل مقدس کا) عہد نامہ جدید مجھے قدرے خشک معلوم ہوا جبکہ عہد نامہ قدیم کا متن شاعرانہ تھا۔ میں نے The Song of Solomon, The Psalms, Proverbs اور Book of Job بار بار پڑھی اور اس کے بعض حصے حفظ کر لیے جو آج تک میری یادداشت کا حصہ ہیں۔ اس کے علاوہ میں نے بڑی تعداد میں بکواس نظمیں، لطیفے، چو بیتے، بچوں کے گیت، لیوس تیرل (Lewis

(Carroll) کی نظمیں، گلبرٹ (Gilbert) اور سلیوان (Sullivan) کے اوپیرا بھی پڑھے۔ اس طرح میں نے خود کو ایک دیہاتی پنجابی سے مڈل کلاس انگریز میں ڈھالنے کی سعی کی۔ میں The Times کی لفظی پہیلیوں (Crossword) پر بھی ہاتھ آزمائی کرنے لگا۔ مجھے یہ ماننے میں کوئی عار نہیں ہے کہ میں نے اپنی زندگی کے بہت سے قیمتی گھنٹے اس پر ضائع کیے۔ میں نے جن ناول نگاروں کو پڑھا ان میں اولڈس ہکسلے (Aldous Huxley) اور سمرسیٹ موم (Somerset Maugham) نے مجھے سب سے زیادہ متاثر کیا۔ میں یہ خواہش کرتا کہ ہکسلے کے یہاں جملوں کے الٹ پھیر، طنزیہ حاضر دماغی اور قاری کو اپنی گرفت میں رکھنے کی صلاحیت کو جوڑ کر میں بھی اپنا ایک اسلوب پیدا کرسکوں۔ لیکن سچ تو یہ تھا کہ مجھے لکھنے کی ترغیب عظیم اور بڑے مصنّفین سے زیادہ دوم درجے کے لکھنے والوں نے دی۔ بالخصوص وہ ہندستانی ادیب جن کی کتابیں برطانیہ اور امریکہ میں شائع ہوچکی تھیں۔ جب میں نے ملک راج آنند، راجہ راؤ اور آر۔ کے ناراین کی کتابوں کا مطالعہ کیا تو مجھے لگا کہ جیسا وہ لکھتے ہیں ویسا تو میں بھی لکھ سکتا ہوں اور اگر ان کی کتابیں بیرون ملک شائع ہوسکتی ہیں تو میری کیوں نہیں؟ یہ اندازہ کچھ غلط بھی نہ تھا۔

انڈیا (اس وقت لندن) میں اپنی دوسری تقرری کے دوران لکھنے کا 'پیشہ' اختیار کرنے کے بارے میں سنجیدگی سے غور کیا۔ ادیب بننے کی خواہش رکھنے والوں کی طرح میں نے بھی معروف خواتین اور مرد قلم کاروں سے دوستی کی کوشش کی، اپنے لیے ان سے ان کی کتابوں پر دستخط کرائے۔ فرانکوئی مارس (Francois Mauriac) سے ان کے ناولوں اور تصویروں پر اٹوگراف لیے۔ مجھے آندرے گاید (Andre Gide) کا ان کی خاتون سکریٹری کے نام ایک دستخطی خط ملا، اور میں نے اسٹیفن اسپنڈر (Stephen Spender)، میری میکارتھی (Mary Mcarthy)، نارمن میلر (Norman Mailer)، کامپٹن میکینزی (Compton Mackenzie)، ساکے ورل (Sacheverell)، سِٹ ول (Sitwell)، ڈایلان ٹامس (Dylan Thomas)، روزا منڈلیمن (Rosamond Lehmann)، سیموئیل بیکٹ (Samuel Beckett) اور بعض دوسرے لوگوں سے مصافحے کیے۔ قلم کاروں کی یہ بچکانہ پرستش اس وقت تک جاری رہی جب مجھے احساس ہوا کہ مصنّفین سے صرف دعا سلام سے ہی کوئی مصنف نہیں بن جاتا۔ لکھنا ایک نہایت ذاتی عمل ہوتا ہے جس میں آپ کی کوئی مدد نہیں کرسکتا سوائے آپ کی ذات کے۔ تصنیف کی دنیا میں 'گرو چیلا' اور پیر و مرشد کے سے تعلقات جیسا کوئی ادارہ نہیں ہوتا۔ قلم کار خود اپنے لیے رہنما ہوسکتا ہے بس۔

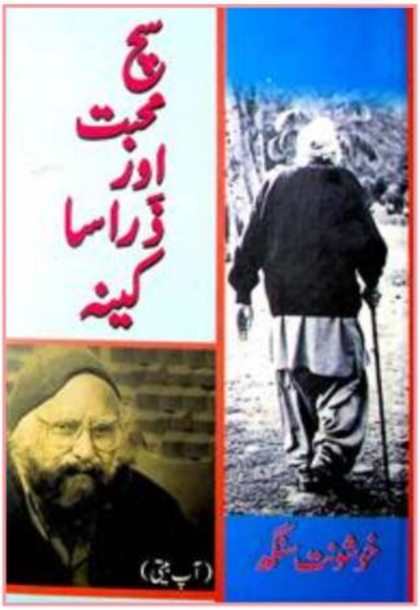

لندن وہی ہندستان میں سفارت خانے میں دوسری تقرری کے دوران میری History of the Sikhs کی اشاعت ہوئی اور گرونانک جی کی جپ جی صاحب کا منظوم ترجمہ بھی شائع ہوا۔ میں جب دہلی واپس آیا تو 'منو ماجرا' (Train to Pakistan) کا آدھا حصہ لکھ چکا تھا۔ بھوپال میں اسے مکمل کرنے میں مجھے پندرہ روز اور لگے۔ اس پورے واقعے کو پہلے کے باب میں درج کیا جاچکا ہے۔

اگلے دو برسوں میں آل انڈیا ریڈیو کے بین الاقوامی نشریات کے شعبے سے وابستہ رہتے ہوئے میں نیرد سی. چودھری (Nird. C. Chaudhry)، رُتھ جھب والا (Ruth Jhabvala) اور منوہر مُلگاؤنکر (Manohar Malgaonker) سے متعارف ہوا۔ جلد ہی یہ تینوں میرے قریبی دوست بن گئے۔ نیرد بابو کی خودنوشت Autobiography of an Unknown Indian (ص 195) ابھی حال میں شائع ہوئی تھی۔ چوں کہ اس کا انتساب بھی برطانوی سامراج کے نام تھا، اور ہندستان میں جو کچھ بہتری آئی تھی اسے انھوں نے برطانوی سامراج سے ہی جوڑ کر دیکھا تھا، اس لیے حکومت ہند کے سرکاریا اور بیوروکریٹ حلقوں میں اس پر کچھ ہنگامہ بھی مچا۔ ان کی انگریزی زبان کی مہارت بنگال کے گاؤں کے بیان اور ملک کے مسائل پر ان کے تجزیاتی نقطۂ نظر پر میں فریفتہ ہوگیا تھا۔ میں نے ان سے اس وقت دوستی کی جب انھیں برادری سے باہر کیا جاچکا تھا۔ ان کو دوستوں کی ضرورت تھی اور انھوں نے میرا دوستی کا ہاتھ قبول کیا۔

نیرد بابو نہایت ٹھگنے قد کے تھے، وہ ہمیشہ سوٹ بوٹ اور ٹائی میں ملبوس رہتے تھے اور ان کے سر پر انوکھی خاکی رنگ کی ٹوپی سے تھوڑی بڑی ہوتی۔ جوکر جیسے لگتے تھے۔ گھر سے باہر نکلتے تو گلی کے لونڈے 'جانی واکر، جانی واکر' گاتے ہوئے ان کے پیچھے لگ لیتے تھے۔ وہ بھی غصیل مزاج تھے۔ ایک دفعہ ان کے دفتر کے ساتھی نے جو ان کے ساتھ کمرے میں ہی بیٹھا تھا، انھیں انگریزوں کی چاپلوسی کا طعنہ دیا تو وہ آگ بگولہ ہو اٹھے اور چیخے: 'حرام زادے، اپنا یہ تبصرہ واپس لے، ورنہ میں تیری کھوپڑی توڑ دوں گا۔' اس نے بھی پیچھے ہٹنے سے انکار کردیا۔ پھر تو نیرد بابو اس کی میز تک پہنچے اور کانچ کے پیپرویٹ سے اس پر وحشیانہ حملے کرنے لگے، یہاں تک کہ وہ لہولہان ہوگیا۔ پھر دونوں شکایتیں درج کرانے کے لیے صدر شعبہ مہرا مسانی کے پاس گئے۔ بیچاری مہرا کیا کرسکتی تھیں، بچوں کی طرح لڑ پڑنے پر تنبیہ کی۔ چودھری کے لیے ان کے دل میں قدرے مروت تھی اور دیگر غیر متعصب اور ترقی یافتہ اور کھلے دماغ والے ہندستانیوں کی طرح وہ بھی ان کی ہمت اور ذہانت نیز ان کی صلاحیت کا اعتراف کرتی تھیں۔ لیکن وزیر برائے اطلاعات و نشریات 'کیسکر' ایسے بالکل بھی نہ تھے۔ جب انھیں اس معاملے کی خبر ملی تو انھوں نے نیرد چودھری کو ملازمت سے برطرف کرنے کا حکم صادر کردیا اور یہ دھمکی بھی دی کہ جن اخبارات نے بھی نیرد کے مضامین شائع کیے انھیں Black List کردیا جائے گا۔ نیرد کی حالت خستہ ہوگئی۔ ان کی کوئی اور آمدنی تھی نہیں مگر کنبے کی ضرورتیں اپنی جگہ تھی۔ مہرا مسانی، رتھ جھبوالا، ان کے شوہر اور میرے جیسے بعض دوست ان کے ساتھ کھڑے رہے۔ ہم نے طے کیا کہ انھیں اور ان کی اہلیہ کو اپنے اپنے گھر

مدعو کریں گے۔ یہاں وہ بہت سے غیر ملکی مداحوں سے ملے۔ ان کی ایک کتاب (The Autobiography of an Unknown Indian) نے ہی ان کو عرش تک پہنچا دیا تھا۔ میرے والد (سر) سوبھا سنگھ بھی ان کے مداحوں میں اس لیے شامل تھے کہ ان کی کتاب تو پڑھی نہیں تھی مگر ان کے بارے میں مجھ سے سنا تھا۔ نیرد جب بھی ہمارے گھر آتے، میرے والد انھیں اپنے باغیچے کی سیر کراتے جہاں انھوں نے گلاب کی دلکش اقسام لگا رکھی تھیں۔ برطانوی حکومت کی جانب سے خطاب و القاب پانے والوں کی کچھ زیادہ ہی قدر کرتے تھے اور میرے والد تو 'نایٹ'، 'سر' کا شاہی اعزاز جو غیر معمولی خدمات کے اعتراف کے طور پر دیا جاتا ہے تھے۔ دوسری طرف میرے والد نے بھی یہ محسوس کرلیا کہ نیرد بابو اپنے انگریز دوستوں میں بے حد مقبول ہیں اور ہر پارٹی میں توجہ کا مرکز بھی وہی ہوتے تھے۔ ان کی آپس میں خوب نبھتی تھی۔

نیرد اشتعال انگیز بھی تھے۔ ایک دفعہ وہ جھبوالا کنبے کے ساتھ کھانے کی میز پر تشریف فرما تھے کہ انھوں نے رتھ جھبوالا کی ماں سے کہا کہ ہندستانی تو پارسیوں کو ہم وطن نہیں سمجھتے۔ جھبوالا کی ماں جن کے شوہر میرٹھ سازش مقدمے میں جیل میں رہ چکے تھے، (اور وہ پارسی تھے) اپنا آپا کھو ہی نہیں بیٹھیں بلکہ وہ پھٹ ہی پڑیں: 'تم برٹش حکومت کے تلوے چاٹنے والے ہو، تم نے ہماری وطن پرستی پر شبہ کرنے کی جرأت کیسے کی؟' وہ پارٹی سے اٹھ کر اپنے کمرے میں چلی گئیں۔ نیرد مطمئن تھے اور اپنی بات پر قائم۔ نیرد بابو کے ساتھ مصیبت یہ تھی کہ میں جن لوگوں سے مل چکا ہوں ان سے کہیں زیادہ معلومات ان کو تھی۔ ان کا علم وسیع تھا۔ تاریخ، ادب، سائنس، قدرتی عوامل، کچھ بھی ہو، وہ سب کچھ جانتے تھے۔ ایک دفعہ ہینری کوؤم جانسن (Henry Droom Johnson) برٹش کونسل کے سربراہ کے گھر ایک پارٹی تھی۔ میں نے ہینری کی اہلیہ جینن سے کہا کہ آج پوری صبح میں ایک تقریر سنتا رہا جو وِٹ گینسٹاین (Wittgensdein) نام کے کسی سائنس داں کے ہائیڈریا اسی چیز کے متعلق کسی تھیوری کے بارے میں تھی۔ میں نے بڑے طنطنے سے یہ دعوا کیا کہ 'مجھے نہیں لگتا کہ وٹ گینسٹاین (Wittgensdein) کے بارے میں یہاں موجود کسی شخص نے بھی کچھ سنا ہوگا۔' یہ وہم وگمان میں بھی نہ تھا کہ فلسفیوں کے حلقے میں وٹ گینسٹاین ایک لیجنڈ کی حیثیت رکھتا تھا۔ میں نے بڑی ڈھٹائی سے یہ شرط لگائی کہ 'اس کمرے میں موجود لوگوں میں نیرد کو چھوڑ کسی کو اس کے بارے میں معلوم نہیں تھا۔' میری شرط قبول کر لی گئی۔

جینن نے جب یہ بات اپنے مہمانوں کو بتائی جو عالم و فاضل اسکالر تھے، لیکن وٹ گینسٹاین کا نام کسی نے نہیں سنا تھا، مگر نیرد بابو اس کے نظریے پر کھل کر بات کرنے لگے۔ اس سے بھی زیادہ حیران کن حادثہ میرے گھر پر ہوا۔ میں نے آئس لینڈ کے نوبل انعام یافتہ سایلن پی (Sillanpie) کو اپنے گھر دعوت دی تھی اور بعض ہندستانی مصنّفین کو ان سے ملنے کے لیے بلایا تھا۔ آئس لینڈ کے ادب پر نوبل انعام یافتہ ادیب کو اپنی تقریر پلا کر نیرد چودھری نے وہ شام اپنے نام کر لی۔

نیرد بابو بہت خبطی بھی تھے۔ اپنے چھت کے باغیچے میں انھوں نے کیکٹس کے پودے کی کئی قسمیں لگا رکھی تھیں جو طلوعِ آفتاب کے بعد گھنٹے دو گھنٹے کے لیے کھلتے تھے۔ یہ نظارہ دیکھنے کے لیے وہ بعض لوگوں کو اپنے فلیٹ پر بلاتے تھے جو دور دراز موری گیٹ کے پاس واقع تھا۔ گاڑیوں کی قطاریں شہر کی گلیوں میں آڑی ترچھی چلتی ہوئی یہ دلفریب نظارہ دیکھنے کے لیے وہاں پہنچتیں۔ چوں کہ کھانا ان کی اہلیہ کو پکانا ہوتا تھا، اس لیے، وہ شاذ و نادر ہی کسی کو کھانے کی دعوت دیتے تھے، اور جب دیتے تھے تو وہ تجربہ ناقابلِ فراموش ہوتا تھا۔ گھر پر وہ ہمیشہ بنگالی دھوتی کُرتے میں ہوتے تھے اور فرش پر پالتھی مار کر لکھنے پڑھنے کا کام کرتے تھے۔

نیرد بابو سے میری دوستی یک طرفہ تھی۔ وہ گرو تھے، میں ان کا سرنگوں شاگرد تھا۔ وہ جب بھی مجھ سے متفق نہیں ہوتے تو مجھے بیوقوف کہتے تھے۔ ان کی اہلیہ اکثر احتجاجاً کہتیں: 'اگر تمھارا یہی رویہ رہا تو اپنے اس اکیلے دوست سے بھی محروم ہو جاؤ گے۔' میرا ان سے الگ ہونے کا کوئی ارادہ نہ تھا اور میں سمجھتا ہوں کہ ان کے پاس بھی ایسی کوئی وجہ نہ تھی۔ ان کی بہت ساری کتابوں میں کسی اور ہندستانی مداح کے بجائے صرف میرا تذکرہ ہے۔ مجھے معلوم تھا کہ وہ ہندستان سے محبت کرتے تھے لیکن ہندستانیوں کو جھیل نہیں پاتے تھے۔ میکس مُولر (Max Muller) کی سوانح لکھنے کے لیے وہ جب انگلینڈ گئے تو پھر واپس نہیں آئے۔

رتھ سے میری شناسائی تب ہوئی جب میں آل انڈیا ریڈیو کی بین الاقوامی سروس میں انگریزی شعبے کا سربراہ تھا۔ میں نے ان کو بات چیت کے لیے مدعو کیا۔ وہ بے حد عمدہ اسکرپٹ لکھتی تھیں اور جو کچھ وہ ریکارڈ کرا دیتی تھیں اسے شاذ و نادر ہی دوہراتی تھیں۔ اسٹوڈیو میں جانے سے قبل جب وہ کچھ منٹوں کے لیے کافی پینے کے لیے میرے کمرے میں رکیں تو میں ان کا اعتماد حاصل کرنے میں کامیاب رہا۔

رتھ جھابوالا کے ناولوں کو اگر کوئی قاری ترتیب وار پڑھے تو اسے ہندستان اور ہندستانیوں سے ان کے ازالۂ التباس ہونے کا احساس ہو جائے گا۔ اس بیزاری کی تکمیل ان کے بہترین ناول Heat and Dust (1975) سے ہوتی ہے جس کو بُکر ایوارڈ ملا تھا۔ مجھے احساس ہو گیا کہ بس کچھ وقت کی ہی بات ہے جب نیرد چودھری کی طرح وہ بھی ہندستان چھوڑ کر یوروپ یا امریکہ میں جا بسیں گی۔ جب تک ان کے یہ طے کرنے کا وقت آیا، ان کے بعض ناولوں کو مرچینٹ آئیوری (Merchent Ivory) ٹیم فلموں کا روپ دے چکی تھی۔ کچھ ناول اور بھی تھے جن پر بننے والی فلمیں سیٹ پر تھیں۔ ان کے فلم ساز نیویارک میں رہتے تھے اور اس لیے رُتھ نے نیویارک ہی کو چُنا۔ تب تک ان کے شوہر کو بھی اندازہ ہو چکا تھا کہ وہ وہاں بھی عمارتوں کے خاکے اور نقشے بنا سکتے تھے۔ دہلی کی بعض قدیم عمارتوں کے جو خاکے انھوں نے بنائے ان کو چشم زدن میں کامیابی ملی۔

رتھ نے میرا تعارف انیتا دیسائی سے کرایا جو ایک بڑے کاروباری کی — آدھی یہود، آدھی بنگالی — اہلیہ تھیں۔ وہ ایک دبلی پتلی، خوش شکل خاتون تھیں جن کے دو بچے تھے۔ مجھے لگتا ہے کہ وہ رُتھ سے متاثر تھیں اور ان کی یہودیت انھیں رُتھ کے قریب لے آئی تھی۔ ان کی تصانیف میں یک گونہ مماثلت تھی اور انیتا کو بھی اپنے ہم وطن سے زیادہ مقبولیت بیرونی لوگوں سے ملی۔ ان کی ایک گرمی کسولی میں گزری۔ اسی سال جنگل میں ایک بھیانک آتش زنی کی وجہ سے پہاڑی کا ایک پورا حصہ جل گیا جو چیڑ کے آتش گیر درختوں سے ڈھکا ہوا تھا۔ کچھ گھر بھی جلے تھے۔ انیتا کے ناول Fire on the Mountain (1977) اسی تجربے کی تحریک سے لکھا گیا ہے۔ رتھ کی طرح انیتا کو بھی اپنی یہودی وراثت کا احساس تھا۔ ان کا

ناول Baumgartner's Bombay (1988) ایک یہود خاندان کے گرد ہی گھومتا ہے۔

آل انڈیا ریڈیو میں دو برس کی ملازمت کے دوران میں اس شخص کے ساتھ خط و کتابت کا حوصلہ پیدا کر سکا جسے آگے چل کر ہندستان کا 'جان ماسٹرس' کہا گیا۔ ماسٹرس کی طرح منوہر ملگاؤنکر (میک) بھی فوج کی نوکری کر چکے تھے۔ وہ ایک ماہر شکاری تھے اور غیر ملکی مہمانوں کو باگھوں کے شکار پر لے جانے کے لیے سفر کرانے والی ایجنسیوں سے ٹھیکے لیتے تھے، لیکن

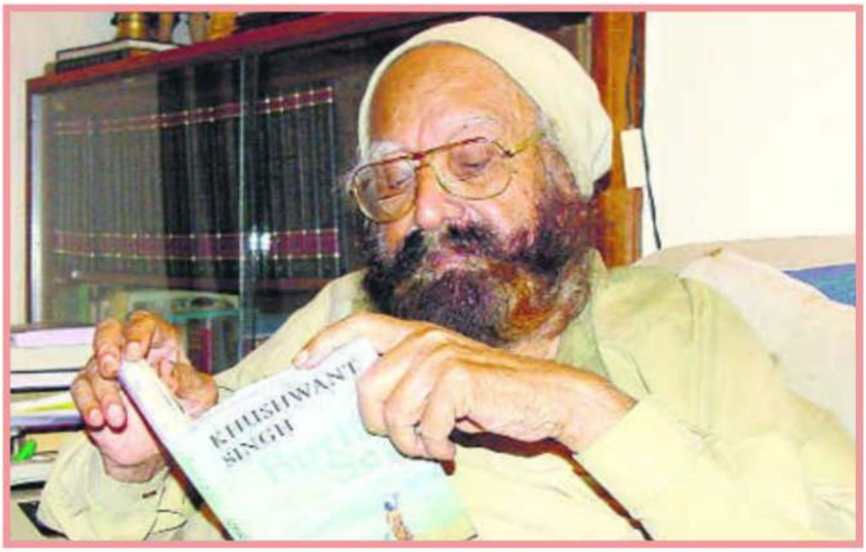

جلد ہی وہ ان خوب صورت جانوروں کی ہلاکت سے بیزار ہوا تھے اور انھوں نے یہ کام چھوڑ دیا۔ انھوں نے مجھے ایک افسانہ دکھایا جو اس بارے میں تھا کہ ایک تنومند، خوب صورت لیکن بیوقوف باگھ کی زندگی کیسے بچائی تھی جسے سڑک کے بیچ میں لوٹنے کی عادت تھی۔ وہ کسی بھی رایفل بردار شخص کا یہ آسانی نشانہ بن سکتا تھا لیکن میک نے اس کے قریب گولیاں داغ کر اسے متنبہ کر دیا کہ انسان کہیں زیادہ خطرناک جانور ہے اور اس سے دوری بنی رہنی چاہیے۔ باگھ دوبارہ نظر نہیں آیا۔ میں نے اس افسانے کو نشر کر دیا۔ اس کے بعد میک ملگاؤں کو کون روک سکتا تھا! ان کے قلم سے ناولوں کی ایک دھار بہہ چلی: تیز رفتار، اذیت پسند اور زبردست ڈرامائیت سے بھرپور۔ انگلینڈ اور امریکہ میں ان کے ناولوں کی خوب پذیرائی ہوئی۔ مہاراشٹر سے وابستگی کے سبب انھوں نے مراٹھا سورماؤں پر بھی کئی ایک تاریخی ناول لکھے۔ کتابوں کی قطار لگانے کے دوران میک کو معلوم ہوا کہ وہ تو سونے کی کان پر بیٹھے ہوئے ہیں، ان کی پشتینی جائیداد میں، جو گوا سے بہت دور نہ تھی، مینگنیز (Manganese) دھات ہونے کا پتا چلا۔ اب وہ ایک بڑے بنگلے میں جس کے ساتھ ایک طویل و عریض باغ بھی ہے اور ان کا نجی سوئمنگ پول بھی ہے، ایک انگریز زمیندار کی طرح رہتے ہیں۔ کتابیں اور اخباروں کے لیے کالم لکھتے وقت وہ اسکاچ، فینی اور دوسری شرابیں نوش فرماتے ہیں۔

میں ابھی بھی زندگی کے اس دور میں تھا جہاں میرا یہ عقیدہ تھا کہ جو شخص بھی عمدہ لکھتا ہے اس سے جان پہچان ہونی ہی چاہیے۔ لہٰذا میں نے حد سے آگے بڑھ کر سستھی براتا (Sasthi Brata) سے دوستی کر لی۔ یہ ان کا اصل نام نہیں تھا بلکہ بنگالی برہمن نام 'بھٹاچاریہ' کا مخفف تھا۔ میں نے براتا کا سوانحی ناول Confessions of an Indian Woman-Eater (1971) بھی پڑھا جو انگلینڈ سے شائع ہوا تھا۔ یہ واضح طور پر شہوانی زبان میں لکھا ہوا تھا اور رنگ رلیاں منا رہے کیسونووا کے کارناموں کی داستان تھا۔ میں نے Illustrated Weekly of India میں اپنے کالم میں اس ناول کی ستائش کی۔ میں نے The Spectator اور The New Statesman جیسے معروف انگریزی رسالوں میں ان کے بعض مضامین بھی پڑھے جو بہت ہی آسان اور خوب صورت زبان میں لکھے گئے تھے۔ بعد میں مجھے معلوم ہوا کہ سستھی براتا The Statesman (کلکتہ اور دہلی) میں کام کر چکے تھے اور انھوں نے جن لڑکیوں کے بارے میں قلم طرازی کی تھی وہ دہلی کے کافی ہاؤس حلقوں میں مشہور تھیں اور ان کی شناخت آسان تھی۔ وہ ظاہر ہے کہ براتا کے Confessions سے نالاں تھیں۔ اُن دنوں وہ لندن میں مقیم تھے، کسی انجینئرنگ یا کیمکل فرم میں ملازم تھے اور شاید کسی انگریز لڑکی کے ساتھ شادی کر چکے یا ساتھ رہ رہے تھے۔

سستھی براتا نے لندن سے فون کر کے مجھے مطلع کیا کہ وہ ہندستان آنے کے منصوبے بنا رہے تھے اور اگر میں Illustrated Weekly میں ان سے کچھ مضامین لکھنے کے لیے کہوں تو ہندستان میں ان کے قیام کا خرچ نکل آئے گا۔ میں اس کے لیے فوراً تیار ہو گیا۔ انھوں نے مجھ سے تاج محل ہوٹل میں ایک کمرہ بک کرانے کے لیے کہا جو میں نے کر دیا۔

سستھی تاج میں ہفتہ بھر سے زیادہ رُکے اور دوستوں کی جم کر خاطر تواضع کی۔ قیام کے آخری دن انھوں نے بل پر محض اپنا نام درج کر کے یہ لکھ دیا کہ اسے Illustrated Weekly کے ایڈیٹر کو بھیج دیا جائے۔ میں نے ادائیگی سے انکار کر دیا کیوں کہ سستھی نے مجھے کوئی مضمون لکھ کر نہیں دیا تھا اور میں نے کمرہ بھی Weekly کے نام سے نہیں، ان کے نام سے بک کرایا تھا۔ ہوٹل، سستھی اور میرے درمیان مہینوں تک تین طرفہ خط و کتابت چلی۔ آخر کار ہوٹل کی ڈائرکٹر کاملیہ پنجابی نے اس بل کو ہی رد کر دیا۔

کوئی سال بھر بعد سستھی دوبارہ ہندستان آئے۔ میں نے ان سے ملنے سے صاف انکار کر دیا۔ وہ کچھ دن میرے بیٹے راہل کے پاس ٹھہرے، اس سے کچھ رقم اُدھار لی اور جہاں تک مجھے علم ہے، اسے کبھی واپس نہیں کیا۔

اس کے بعد برسوں سے سستھی برت کی کوئی کتاب یا مضمون میری نظر سے نہیں گزرا۔ یہ افسوس کا مقام اس لیے ہے کہ اس میں بے پناہ خلاقانہ صلاحیتیں تھیں۔

میں ہم عصر مصنّفین میں تو سب سے عمدہ تخلیق کار وی ایس نیپال (V. S. Naipaul) کو سمجھتا ہوں۔ ان کا پہلا ناول A House for Mr Biswas (1961) میں نے پڑھا تھا۔ اگرچہ میں کسی ملک میں کبھی نہیں گیا، لیکن یہ وثوق سے کہہ سکتا ہوں کہ اس ناول میں وہاں بسے ہندنژاد لوگوں کی زندگی کا ایک مستند بیان ہے۔ ان کے ناولوں میں یہ سبھی کردار جیتے جاگتے نظر آئے نیز ان کے مکالمے نہایت دل چسپ ہیں۔ انگریزی ادب کی دنیا میں نیپال کو جب ابھرتے ہوئے

ستارے کا درجہ دیے جانے کے کچھ عرصے بعد وہ اپنے آباواجداد کی دھرتی دیکھنے کے لیے ہندستان آئے، تو ان کے ساتھ ان کی اہلیہ بھی تھیں۔ وہ ایک انگریز خاتون تھیں اور بہت ناراض لگ رہی تھیں۔ دہلی پہنچنے تک انھوں نے جو کچھ دیکھا تھا وہ اس سے بہت نالاں ہو چکے تھے۔ نیپال کو اُمید تھی کہ ان کو 'ہندستان کا لعل' کہا جائے گا اور وہ اپنی اہلیہ کو یہ دکھا سکیں گے کہ ان کی اتنی تعریف وتوصیف اپنے ملک میں نہیں ہوتی ہے۔ مگر اس وقت تک نیپال کو محض Cognoscenti کے ایک محدود حلقے نے پڑھا تھا جس کی تعداد ہر جگہ بہت مختصر ہوتی ہے۔ میں ان کا گائیڈ تھا۔ ان کو میں اپنے دوستوں کے یہاں لے گیا جن میں شاذ و نادر ہی کسی نے ان کو پڑھا تھا۔ ان کی خودداری کو بحال کرنے کے لیے میں انھیں مقامی کتب خانوں میں ہی لے گیا تا کہ وہ دیکھیں کہ ان کے ناولوں کی کتنی زیادہ مانگ تھی۔ میں انھیں سورج کنڈ لے گیا۔ فروری کا مہینہ ختم ہونے کو تھا اور دہلی کے اس قدیم شہر کے کھنڈروں سے لگی وادی پھولوں سے لدی ہوئی تھی۔ ہم نے تغلق آباد قلعہ کی بھاری بھرکم دیواروں کے سایے میں سینڈوچ اور گرم کافی کا ناشتہ کیا۔ قریبی گاؤں کے بچے ہمیں دیکھنے کے لیے جمع ہو گئے۔ ان کے کپڑے پھٹے ہوئے تھے، ناک بہہ رہی تھی اور گندی آنکھوں پر مکھیاں بھنبھنا رہی تھیں۔ نیپال نے سورج کنڈ کے حسین منظر کو سفرنامے An Area of Darkness (1964) میں محض چار الفاظ میں نپٹا دیا، لیکن ان گندے دیہاتی بچوں پر انھوں نے کافی تفصیل سے لکھا۔ کشمیر میں زعفران کے کھیتوں کے بیان میں بھی انھوں نے یہی انداز اختیار کیا۔ موسمِ خزاں میں کھلے سوسن کا وہ محض سرسری تذکرہ کرتے لیکن پیٹ ہلکا کرنے کے لیے فرن اٹھا کر بیٹھنے والی کشمیری عورتوں کا چرچا وہ بطورِ خاص کرتے تھے۔ نیپال کی طرزِ تحریر سے اندازہ ہوتا ہے کہ گندگی اور گھنونی چیزیں ان کے حواس پر چھائی رہتی تھیں۔

مجھے کم از کم New York Times کے لٹریری ایڈیٹر کی جانب سے دو بار فون کال آئی کہ میں وی ایس نیپال پر ایک مضمون لکھوں۔ انھیں یہ امید تھی کہ اس سال ادب کا نوبل انعام نیپال (Naipaul) کو ہی دیا جائے گا۔ میں نے اپنا مضمون لکھا لیکن اس سال یہ انعام نیپال کو نہیں ملا جس کے وہ مستحق تھے۔ ان دنوں ایسا محسوس ہوتا تھا کہ انگریزی میں لکھنے والے کسی بھی کالے شخص کو یہ انعام کبھی نہیں دیا جائے گا۔ برطانوی حکومت نے انھیں Knight کا خطاب ضرور دیا تھا، لیکن یہ نوبل انعام نہ ملنے کی خلش کو پورا نہ کر سکا۔ نیپال نے اپنے نام کے پہلے کبھی Sir لفظ کا استعمال نہیں کیا۔ انھیں جب یہ اندازہ ہو گیا کہ نوبل انعام ان کو ملنے سے رہا تو ان کی تحریروں کی عمدگی کم ہوتی چلی گئی۔

ایک کرسمس کے موقعے پر میرے امریکی ناشر، گرووَ پریس (Grove Press) کے بارنی روزیٹ (Bamey Rosset) نے مجھے بطور تحفہ گِنس برگ (Ginsberg) کی نظموں کی کتاب 'The Howl' بھیجی۔ مجھے ان کے پرجوش اندازِ بیان نے بے حد متاثر کیا اور میں نے شکریے کا خط لکھتے ہوئے شاعر کے بارے میں کچھ مزید معلومات حاصل کرنے کی کوشش کی۔ کچھ مہینے بعد میں نیویارک میں اپنے دوست، کولمبیا یونیورسٹی کے پروفیسر جان ہیزرڈ (John Hazard) اور ان کی اہلیہ سوسن کے گھر پر ٹھہرا ہوا تھا۔ روزیٹ (Rosset) نے مجھے بھی گرین وچ ولیج کے ایک ریسٹورنٹ میں کھانے پر مدعو کیا۔ وہیں میری ملاقات ایلن گنس برگ سے ہوئی۔

کسولی میں کچھ زیادہ قلم کار نہیں جاتے تھے۔ موسمِ گرما میں ہندی کے دو معروف ناول نویس اُپندر ناتھ اشک اور راجندر یادو نے، جو کلیان ہوٹل میں مقیم تھے، مجھے فون کیا۔ دونوں ہی مجھے ہندی ادب میں اپنے کارہائے نمایاں کے بارے میں بتلانے کے لیے بیتاب تھے۔ میں ان کے ناموں سے البتہ واقف تھا لیکن ان کی لکھی ہوئی تحریریں نہیں دیکھی تھیں۔ وہ اپنے بارے میں بات کرتے ہوئے ذرا احتیاط سے کام لے رہے تھے۔ راجندر یادو بار بار اپنی اہلیہ منّو بھنڈاری کا حوالہ دے رہے تھے جو خود بھی ایک مصنف تھیں۔ ان کے ناول 'مہا بھوج' نے ان کو بے حد شہرت دلائی تھی۔ یہ ایک بیسٹ سیلر ناول ثابت ہوا تھا اور اس پر فلم بھی بنی۔ کسی روز ناشتے کے دوران اشک نے میری اہلیہ کو بتلایا کہ وہ محض سات سال ہی کے تھے کہ انھیں احساس ہو گیا کہ ان کی تقدیر میں 'مہا لکھاری' بننا لکھا ہے۔ ان کے اندر قصہ گوئی کی صلاحیت غضب کی تھی اور اپنی پہلی بیوی سے نجات کے متمنی تھے، اس لیے، ان کے خلاف وہ بڑے مضحکہ خیز ظالمانہ انداز میں چھینٹا کشی کرتے تھے۔ اشک نے بہت سارے ناول لکھے تھے اور الٰہ آباد میں ان کا پبلشنگ ہاؤس بھی تھا۔ شہرت کے باوجود انھیں پیسوں کی تنگی ہمیشہ رہی۔ ایک بار تو انھوں نے یہ اعلان بھی کر دیا تھا کہ وہ اب لکھنا بند کر رہے ہیں کیوں اس سے کوئی رقم حاصل نہیں ہوتی، بلکہ اب سے سبزیوں کی دکان لگائیں گے کیوں کہ ناول لکھنے سے آلو گوبھی بیچ کر کہیں زیادہ کمائی ہوتی ہے۔ اس پینترے کی وجہ سے ان کو خوب شہرت ملی۔

قلم کی دنیا میں انکساری ذرا دور کی کوڑی ہے۔ بالخصوص ہندستانی ادیبوں کے یہاں جن میں یوروپ والوں کے مقابلے آداب وتکلفات ذرا کم ہیں، خود ستائی کوئی قبیح فعل نہیں۔ علاقائی زبانوں کے ادیب اپنی خدمات کا بکھان کرنے میں ذرا بھی ہچکچاتے نہیں۔ اردو زبان کے عظیم ترین شاعر غالب فخریہ اعلان کرتے تھے کہ یوں تو درجنوں شاعر موجود ہیں پھر بھی میرا اندازِ بیان ان سب سے ممتاز ہے۔ آج کل کے ادیب اپنی سالگرہ کی دعوت دیتے ہیں، اپنی تعریف میں قصیدے پڑھواتے ہیں اور اپنے 'ابھی نندن گرنتھ' (Fest script) شائع کر کے تقسیم کراتے ہیں۔

انگریزی میں لکھنے والے بعض ہندستانی ادیب بھی باہمی ستائش سے نہیں چوکتے۔ چوں کہ اکثریت کتابیں پڑھنے والوں کی نہیں ہوتی، سیاست داں اور نوکرشاہ تو اس فہرست میں بالکل ہی شامل نہیں ہیں، اور چوں کہ عوام کی یادداشت محدود ہوتی ہے، اس لیے، اپنا بکھان کرنا ہی سب سے موثر حربہ ہے۔ بس ایک ناول All about Hatterer (1948) اور ایک چھوٹا سا ڈراما Hali لکھا تھا۔ یہ ناول بلاشبہ ایک عمدہ تحریر ہے، لیکن میں شاید ہی اس کا تصور کر سکتا ہوں کہ دیسائی جتنا کم لکھ کر لوگ نوبل انعام پانے کی خواہش بھی کر سکتے ہیں۔ لیکن دیسائی نے (جب وہ لندن میں پریس سے منسلک تھے) مجھے پھسلانے کی کوشش کی کہ میں ان کے نام کی سفارش انتخابی کمیٹی کے سامنے حکومتِ ہند کی جانب سے کروں۔ یہ معاملہ پھر ڈاکٹر رادھا کرشنن کے سامنے پہنچا جو اُس وقت ماسکو میں ہمارے سفیر تھے، انھوں نے مجھے خوب پلائی۔

ایک دفعہ تو دہلی کے تمام اخبارات میں صفحۂ اول پر

یہ خبر شائع ہوئی کہ ہندی کے قلم کار وتساین (Vatsayan) کو جو اگییہ (Agyeya) کے قلمی نام سے لکھتے تھے، یہ اطلاع دی گئی ہے کہ اس سال کا نوبل انھیں ہی ملنے والا ہے۔ کچھ دنوں تک اخبارات میں یہی خبر شائع ہوتی رہی کہ دیکھیے ہندی کی کتنی بھاری عزت افزائی ہو رہی ہے، اور ان کی اہلیہ کپلا واتسیاین کے انٹرویو شائع ہوتے رہے۔ چند دنوں کے بعد خبر موصول ہوئی کہ انعام تو اسرائیل کے قلم کار ایگنان (Agnan) کو دے دیا گیا ہے۔ یہ غلط خبر کیسے پھیلی، اس بارے میں پوچھے جانے پر واتساین میاں بیوی نے یہ بھونڈی سی صفائی دی کہ تار بابو نے Agnon کی جگہ غلطی سے Agyeya پڑھ لیا تھا۔ کس ڈاک خانہ کا کون سا تار بابو، کوئی نہیں جان سکا؟

اپنی تشہیر اور پروپیگنڈہ کرنے کی سب سے نمایاں مثال ڈاکٹر گوپال سنگھ دردی کی ہے۔ انھوں نے خود کے بارے میں جو من گھڑت کہانی پھیلائی اور اس سے جس طرح استفادہ کیا، اس کے بارے میں میں لکھ چکا ہوں۔

کچھ سال بعد خبریں موصول ہوئیں کہ ملیالم کی شاعرہ کملا داس (Kamla Das) کو اس انعام کا امیدوار تسلیم کیا گیا ہے۔ یہ خبر بھی تمام اخبارات میں پہلے صفحہ پر شائع ہوئی۔ کملا کی ملیالی زبان میں بطور شاعرہ بہت ستائش ہوئی ہے اور انھوں نے خود اپنی زندگی پر ایک ناول بھی لکھا ہے جس میں انھوں نے اپنی شادی اور جنسی زندگی کی بے باک تصویر کشی کی ہے۔ کملا کے انتخاب کے بارے میں چھپنے والی خبروں کا میں نے بھی جائزہ لیا اور افسوس کا اظہار کیا کہ ان کے جیسی نیک خاتون بھی خود کی تشہیر کے موہ میں الجھ کر رہ گئی۔ نہایت برہم ہو کر انھوں نے مجھے فون کیا اور فون پر ہی چیخنے چلانے لگیں۔ ان کے بیٹے نے مجھے ایک قانونی نوٹس بھجوا کر معذرت طلب کی، ورنہ...لیکن ہوا کچھ بھی نہیں۔

مختلف رسائل، اخباروں کے ایڈیٹر اور ہندستان میں پینگوئن وایکنگ (Penguin Viking) کے اعزازی ایڈیٹر کے روپ میں ذہین باحوصلہ نوجوانوں کی حوصلہ افزائی کے لیے میں جو کچھ کر سکتا تھا وہ میں نے کیا ہے۔ ان میں سے جس کے اندر بھی کچھ قابلیت تھی وہ اس سے مستفید ہوئے۔ ان میں ایک تھے ایم جے اکبر جو کلکتہ کے The Telegraph کے ایڈیٹر بنے، پھر پارلیمنٹ کے ممبر بنے، اور سیاسی و سماجی معاملات پر متعدد کتابوں کے مصنف ہیں۔ باچی کارکریا (Bachi Karkarea) جن کو میں نے باءمبے ڈائنگ کے واڈیا گھرانے پر اپنی کتاب کے لیے منتخب کیا۔ (واڈیا خاندان کو متن پسند نہیں آیا اور اس کے سبب کتاب شائع نہیں ہوئی) میں نے ان کا نام ہوٹل مالک ایم ایس اوبیرائے کی سوانح کے لیے بھی پیش کیا اور اس کتاب کو پینگوئن وایکنگ نے شائع کیا۔ رسالوں، ریڈیو اور ٹی وی کے لیے کتابوں پر تبصرے کرنے کے دوران میں بہت سے نئے قلم کاروں کو آگے بڑھانے میں کامیاب رہا۔ ان میں اییتاؤ گھوش (Aitav Ghosh)، اُپ منیو چٹرجی (Upamanyu

> قلم کی دنیا میں انکساری ذرا دور کی کوڑی ہے۔ بالخصوص ہندستانی ادیبوں کے یہاں جن میں یوروپ والوں کے مقابلے آداب و تکلفات ذرا کم ہیں، خودستائی کوئی قبیح فعل نہیں۔ علاقائی زبانوں کے ادیب اپنی خدمات کا بکھان کرنے میں ذرا بھی ہچکچاتے نہیں۔

Chatterjee)، گیتا ہری ہرن (Geeta Hariharan)، شمع پھٹہلی (Shama Puttenahalli)، ایلن سِیلی (Allan Sealy)، رُکن اڈوانی (Rukun Advani)، رمیش مینن (Ramesh Menon)، مُکل کیشون (Mukul Kesvan) اور سب سے بڑھ کر وکرم سیٹھ کے نام شامل ہیں۔ The Golden Gate پر تبصرہ کرتے ہوئے میں نے لکھا تھا کہ ہندستان میں بالآخر بین الاقوامی سطحِ تخلیق میسر آ گیا جو اپنے ملک کا نام روشن کرے گا۔ ان کے ناول A Suitable Boy کی کامیابی سے یہ بات ثابت ہو چکی ہے کہ میری پیش گوئی غلط نہیں تھی۔

نوجوان امیدواروں کی حوصلہ افزائی کے اپنے ہی جوکھم ہوتے ہیں جنھیں ادب کی دنیا میں لانے سے مہلک نتائج برآمد ہوئے۔ ان میں ایک نام اندرانی ایکٹھ گیالت سین (Indrani Aikath Gyaltsen) کا ہے۔ وہ بہار میں رہنے والی ایک بنگالی لڑکی تھی جس نے دارجلنگ کے پاس چائے کے ایک باغ کے تبتی مالک سے شادی کی تھی۔ ہمارا تعارف گلین برن (Glen Burn) چائے باغ میں اس کے ساتھ ٹھہرے ہوئے جرمن سفیر کی بیوی نے کرایا تھا۔ پھر ہم خط و کتابت کرنے لگے۔ اس نے مجھے اپنی کچھ نظمیں بھیجیں۔ میں نے صدق دلی سے اقرار کیا کہ شاعری کے بارے میں میری معلومات بہت کم ہیں لیکن اگر وہ کوئی ناول یا پھر افسانے لکھے تو میں شاید کچھ مدد کر سکوں گا۔ اس نے اپنے خرچ پر اپنی نظمیں شائع کرائیں اور ان کا انتساب میرے نام کیا۔ میں اس لیے نثر لکھنے کے لیے زور دینے لگا۔ اس نے اپنے ناول Daughters of the House (1991) کے باب مجھے بھیجنے شروع کر دیے۔ پینگوئن وایکنگ میں میرے رفیق کار ڈیوڈ دیویدار نے ان کو قبول کر کے برطانیہ اور امریکہ کے ناشرین کے ہاتھوں فروخت کر دیا۔ اندرانی کی زندگی کا ایک نیا دور شروع ہو چکا تھا۔ لیکن وہ کامیابی اور بہت جلد شہرت کی تمنا کرنے لگی۔ ایک بار جب وہ کلکتہ کتاب میلے میں میرے ساتھ تھی، مجھ سے پوچھ بیٹھی: 'مجھ سے کوئی میرا آٹوگراف کیوں نہیں مانگتا؟' میں نے اسے یقین دلایا کہ وہ کچھ اور ناول لکھ لے گی تو لوگ بھی اس سے آٹوگراف مانگیں گے۔ کتاب میلہ کے آخری کچھ دنوں کے دوران اس کا دوسرا ناول Cranes Morning (1993) سامنے آیا۔ (اس کا انتساب بھی میرے ہی نام تھا) ہندستان میں اس پر اچھے تبصرے ہوئے اور بیرونی ناشرین نے اسے قبول کیا، لیکن یہ اس کے لیے کافی نہیں تھا۔ وہ چاہتی تھی کہ لوگ اسے تسلیم کریں، اس کے بارے میں بات کریں۔ اسے کلکتہ کے The Statesman میں لکھنے کے لیے ایک ہفتہ وار کالم دیا گیا۔ اس نے جوش و خروش سے لکھنا شروع کر دیا کیوں کہ اس کے زیادہ تر دوست یہی اخبار پڑھتے تھے۔ میں نے اسے ایک سے زیادہ دفعہ آگاہ کیا کہ جو کچھ ذہن میں آ جائے اسے نذر قلم کرنے سے بات نہیں بنتی۔ کچھ مہینوں کے بعد The Statesman نے اس کے کالم چھاپنے بند کر دیے۔ اس بات سے اس کو سخت صدمہ پہنچا۔ ساتھ ہی اس کے خاندان کے افراد سے تعلقات تلخ ہونے لگے۔ وہ دارجلنگ چھوڑ کر

چائی باسا (Chaibasa) (بہار) میں اپنے بیمار والد کے پاس آگئی۔ وہ لقوے کے سبب مفلوج ہوچکے تھے۔ جب ان کی وفات ہوئی، وہ والد کے قریب ہی تھی۔ ماں اور بہن سے اس کی کبھی نہیں نبھی۔ چائے باسا میں اس کے والد کی کھدان اور مکان کو لے کر ان کے درمیان تنازع تھا، لیکن اس سے بھی سنجیدہ کوئی بات اسے اندر اندر کھائے جارہی تھی۔ میرے نام اس کے خط مختصر، اور مختصر ہونے لگے اور اس نے بے حد آزردگی سے شکایت کی۔ پینگوئن وائکنگ نے اس کا تیسرا ناول قبول کرلیا تھا، لیکن اس کے بعد بھی وہ رنج والم کے اس ماحول سے باہر نہ پاسکی۔ عجیب سا اتفاق یہ ہوا کہ اس کے تیسرے ناول کا عنوان Hold My Hand I am Dying تھا۔ ایک صبح وہ بستر پر بے ہوش پائی گئی۔ ڈاکٹر کو بلایا گیا۔ کلکتہ سے اس کے شوہر کو بلایا گیا۔ اگلے روز اس کی وفات ہوگئی کہ اس کا ہاتھ تھامنے والا کوئی نہ تھا۔

وفات سے ایک روز پہلے اندرانی نے مجھے ایک چھوٹا سا خط لکھا تھا۔ یہ مجھے دو دن بعد ملا۔ اس سے اشارہ ملتا تھا کہ کچھ تھا جو اسے پریشان کررہا تھا۔ میرے پاس یہ ماننے کا سبب نہ تھا کہ اس نے خود کی جان لی تھی۔ جب سب کچھ اس کی پسند کے مطابق ہورہا تھا تو وہ اپنا کیریئر کیوں ختم کرتی؟

اس کا ایک ممکنہ جواب مگر کچھ ماہ بعد ملا جب پینگوئن وائکنگ کو ایک قانونی نوٹس ملا کہ Crones Morning کے بعض حصے بیس سال پہلے شائع ہوچکے ایک امریکی ناول سے سرقہ کیے گئے ہیں۔ مجھے لگتا ہے کہ امریکی ناشر کی توجہ اس طرف مبذول ہو، اس سے پہلے اندرانی کو قارئین کے خط ملے ہوں گے جن میں اس پر سرقے کا الزام لگایا گیا تھا۔ اندرانی کو لگا ہوگا کہ محض اب کچھ وقت کی بات ہے جب یہ سرقہ اس کے منہ پر دے مارا جائے گا اور اس کا ایک مشہور ادیب بننے کا خواب ریزہ ریزہ ہوکر بکھر جائے گا۔ میں نے دونوں ناولوں کے متعلقہ حصوں کا موازنہ کیا۔ اس میں کوئی شک نہ تھا کہ اس نے دوسرے ناول سے کچھ حصے ذرا سے پھیر بدل کے ساتھ اڑا لیے تھے۔ یہ بات بھی واضح تھی کہ اس کے لیے ایسا کرنا اس لیے قطعی ضروری نہ تھا کہ زبان پر اسے اتنی ہی قدرت حاصل تھی جتنی کسی بھی اچھے لکھنے والے کو ہوسکتی ہے۔ یہ تو ناول کو آگے بڑھانے اور پورا کرنے کی جلد بازی اور بے صبری تھی

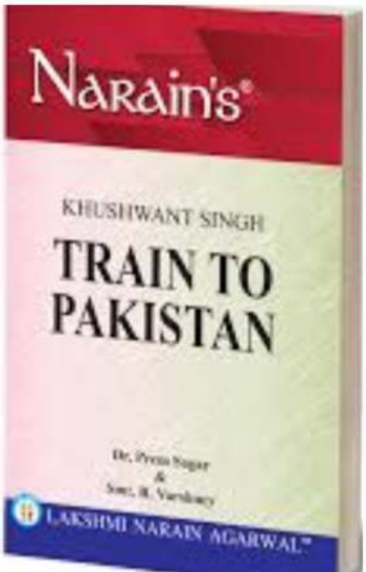

جو اس نے ایسا بیوقوفی بھرا قدم اٹھایا۔ میں اسے بہت پسند کرنے لگا تھا اور اس لیے اس پر دباؤ ڈالنے کے لیے میں خود کو معاف نہیں کرسکتا۔ وہ میری سرپرستی میں تھی، میری بیٹی اور میری پسندیدہ لڑکی بھی تھی۔ میرے مطالعے کے کمرے میں اس کی تصویر ایک فریم میں آویزاں ہے۔

ادیب بننے کے لیے کیا کیا ضروری ہے؟ پہلا، جنون۔ دولت کی ریل پیل اس کی متحرک نہیں ہوسکتی۔ (ہوٹل، پان کی دکان، گیس ڈپو، قانون یا دوا علاج کے پیشے میں اس سے کہیں زیادہ کمائی ممکن ہے) نہ ہی نام اور شہرت کی طلب اس کی محرک ہے، وہ تو سیاست یا فلموں میں کہیں زیادہ آسانی سے مل سکتی ہے۔ درحقیقت بہت سے ادیبوں کے لیے یہی بات واضح نہیں ہے کہ انھوں نے قلم ہاتھ میں کیوں لیا، بس وہ اتنا ہی کہتے ہیں کہ کوئی اندرونی ترغیب ہے جس نے ان کو مجبور کیا۔ زیادہ تر صورتوں میں جب انھیں معلوم ہوتا کہ واقعی ایک مصنف بننے کے لیے خواہش کے علاوہ بھی بہت کچھ درکار ہے تو ان کی تحریک ختم ہوجاتی ہے۔ یہ خواہش بار بار اٹھتی ہے۔ کچھ لوگ چھوٹے چھوٹے مضامین، ادھورے افسانے یا ناول لکھ کر ایک راستہ نکالنے کی سعی کرتے ہیں اور پھر ہار مان لیتے ہیں، یہ سمجھ لیتے ہیں کہ ان کے اندر مصنف بننے کا مادہ ہی نہیں ہے۔ زیادہ تر حساس لوگوں میں شاعری کا ایک ذخیرہ موجود ہوتا ہے جو عنوانِ شباب میں جلا پاکر لفظوں کی صورت اختیار کرتا ہے۔ بعد میں یہ خواہش مرجاتی ہے۔ نثر لکھنا کہیں زیادہ مشکل ہے۔ پہلی شرط یہ ہے کہ آپ نے تمام کلاسکی اور جدید ادب پڑھا ہو، آپ کے پاس الفاظ کا شاندار ذخیرہ موجود ہو اور سب سے بڑھ کر آپ میں یہ قوت ہو کہ کام پورا ہونے تک آپ ہار نہ مانیں۔ مختصر یہ کہ آپ میں استقلال ہو، کورے کاغذ کو تکتے ہوئے گھنٹوں بیٹھے رہیں اور جب تک وہ بھر نہ جائے، آپ ڈٹے رہیں۔ کاغذ پر جو کچھ بھی درج ہوا ہے، ہوسکتا ہے اس میں بہت سی بکواس باتیں بھی ہوں، لیکن یہ ثابت قدمی کارآمد ثابت ہوتی ہے۔ جلد یا بدیر آپ کی تحریر میں بہتری آئے گی، آپ میں جو مصنف چھپا بیٹھا ہے وہ باہر آئے گا۔ دوستوں کے نام لمبے لمبے خط لکھنے سے عمدہ مشق ہوتی ہے۔ میری رائے میں روزانہ ڈائری لکھنا بھی کارآمد ہوسکتا ہے۔ اخبارات میں باقاعدگی سے کالم لکھنا اور وقت کی پابندی کرنا ایک نیک عمل ہوتا ہے۔ اس میں کچھ دنوں کے لیے بھی رخنہ پڑے تو پھر اسے لئے میں لانا مشکل ہوجاتا ہے۔

مجھے لکھ کر کیا ملا ہے؟ جو اخبارات اور رسائل میرے کالم چھاپتے ہیں ان سے ڈھیر ساری رقم ملی ہے۔ اتنا تو مجھے اپنی کتابوں سے نہیں ملا، لیکن ان دو ذرائع سے آنے والی آمدنی نے مجھے ٹیکس ادا کرنے والوں کی پہلی قطار میں لا کھڑا کیا ہے۔ میرا مسئلہ آمدنی کا نہیں، ٹیکس ادا کرنے والوں میں شامل ہونے کا ہے۔ آمدنی سے زیادہ اس بات کی خوشی ہوتی ہے کہ بہت سے لوگ مجھے پڑھتے ہیں اور میں ہندستان میں کہیں بھی رہوں، مجھ سے ملنا چاہتے ہیں۔ اس طرح کی ستائش سے کسی کا دماغ بھی پھر سکتا ہے۔ لیکن دولت اور شہرت سے بڑھ کر مجھے اپنی تحریروں سے خود کی تکمیل کا احساس ہوتا ہے۔ یہ احساس مجھے قانون، سفارت یا درس و تدریس کے پیشوں سے حاصل نہیں ہوا، لیکن جب میں ہر روز قلم چلاتا ہوں تو یہ مجھے بھرپور مقدار میں حاصل ہوتا ہے۔ جب تک قلم میرے ہاتھ سے نیچے نہ گرے، میں یہی کرتے رہنا چاہتا ہوں۔

حواشی

1 خوشونت سنگھ کی خودنوشت سوانح 'Truth Love and Little Malice' کے باب on writing and writers کے منتخب حصوں کا ترجمہ

■

Dr. Javed Alam
Azampur Dehpa, Pilkhuwa,
Hapur, (U.P)
Pin - 245304
Mob.: 9717984657
Email: Javed.alam075@gmail.com

مفتی سہیل ندوی

قومی تعلیمی پالیسی 2020 اور اردو تدریس کے امکانات

تعلیم کسی بھی قوم کی فکری، تہذیبی اور سماجی تشکیل کا بنیادی ذریعہ ہوتی ہے۔ زبان اس تعلیمی عمل کی روح ہے، کیوں کہ زبان ہی کے ذریعے علم منتقل ہوتا ہے، فکر پروان چڑھتی ہے اور تہذیب آگے بڑھتی ہے۔ اردو زبان ہندستانی معاشرے میں صدیوں سے علمی، ادبی اور تہذیبی کردار ادا کرتی چلی آ رہی ہے۔ تاہم بدلتے ہوئے سماجی و تعلیمی حالات میں اردو تدریس کو متعدد چیلنجز کا سامنا ہے، جن میں تعلیمی پالیسیوں سے بے توجہی، روزگار سے وابستگی کا فقدان اور جدید ٹیکنالوجی سے دوری شامل ہیں۔

ایسے وقت میں قومی تعلیمی پالیسی 2020 اردو زبان کے لیے امید کی نئی کرن ثابت ہوتی ہے۔ یہ پالیسی مادری زبان میں تعلیم، کثیر لسانی نظام اور تعلیمی اختراع کو فروغ دیتی ہے، جو اردو تدریس کے لیے نہایت موزوں ہے۔

اردو کی تدریس کا آغاز برصغیر میں مدارس، مکاتب اور بعد ازاں جدید تعلیمی اداروں سے ہوا۔ انیسویں صدی میں اردو نے ایک تدریسی زبان کے طور پر نمایاں مقام حاصل کیا۔ آزادی کے بعد اگرچہ اردو کو آئینی تحفظ حاصل ہوا، لیکن تعلیمی سطح پر اس کی تدریس بتدریج محدود ہوتی چلی گئی۔ نصابی کمزوری، اساتذہ کی کمی اور انتظامیہ کی بے توجہی نے اردو تدریس کو متاثر کیا۔

قومی تعلیمی پالیسی 2020 اس تاریخی خلا کو پُر کرنے کا ایک مؤثر ذریعہ بن سکتی ہے، بشرطیکہ اردو کو محض ایک اختیاری زبان نہیں بلکہ فکری اور تعلیمی اثاثہ سمجھا جائے۔

قومی تعلیمی پالیسی 2020 کی اساس ہندوستانی اقدار، عالمی تعلیمی رجحانات اور جدید تحقیقی نظریات پر قائم ہے۔ یہ پالیسی تعلیم کو:

- طلبا علم مرکوز
- اقدار پر مبنی
- کثیر لسانی
- اور ٹیکنالوجی دوست

بنانے پر زور دیتی ہے۔

NEP 2020 واضح طور پر کہتی ہے کہ ابتدائی تعلیم مادری زبان میں دی جانی چاہیے، کیوں کہ یہی زبان بچے کی فکری بنیاد کو مضبوط بناتی ہے (Government of India, 2020)

قومی تعلیمی پالیسی 2020 کی سب سے نمایاں اور انقلابی شق مادری زبان یا علاقائی زبان میں ابتدائی تعلیم پر زور ہے۔ پالیسی کے مطابق کم از کم پانچویں جماعت تک اور جہاں ممکن ہو آٹھویں جماعت تک، تعلیم مادری زبان میں دی جانی چاہیے۔ تعلیمی نفسیات اور جدید تحقیقی مطالعات اس حقیقت کو تسلیم کرتے ہیں کہ بچہ اپنی مادری زبان میں زیادہ بہتر انداز میں سیکھتا، سمجھتا اور تخلیقی صلاحیتوں کا اظہار کرتا ہے۔

اردو زبان ہندوستان میں کروڑوں افراد کی مادری زبان ہے۔ NEP 2020 کے اس اصول کے تحت اردو کو ابتدائی تعلیم کی زبان بنانے کے وسیع امکانات پیدا ہوتے ہیں۔ اردو ذریعہ تعلیم نہ صرف تعلیمی فہم کو بہتر بناتا ہے بلکہ بچوں کو اپنی تہذیب، اقدار اور ثقافتی شناخت سے بھی جوڑتا ہے۔ اس طرح اردو محض ایک مضمون نہیں بلکہ علم کی ترسیل کا موثر وسیلہ بن سکتی ہے۔

مادری زبان میں تعلیم کا نفاذ اردو کے لیے ایک تاریخی موقع ہے، جس کے ذریعے اردو اسکولوں، مدارس اور سرکاری و غیر سرکاری تعلیمی اداروں میں معیاری اردو تعلیم کو فروغ دیا جا سکتا ہے۔

قومی تعلیمی پالیسی 2020 کثیر لسانی تعلیم (Multilingual Education) کو تعلیمی ترقی کا ایک لازمی جز قرار دیتی ہے۔ پالیسی اس تصور کو فروغ دیتی ہے کہ ایک طالب علم کو بیک وقت ایک سے زائد زبانوں سے واقفیت حاصل ہونی چاہیے، تا کہ اس کی فکری وسعت اور سماجی ہم آہنگی میں اضافہ ہو۔

اردو زبان اس کثیر لسانی نظام میں ایک مضبوط کردار ادا کر سکتی ہے۔ اردو کو ہندی، انگریزی اور دیگر علاقائی زبانوں کے ساتھ مربوط کر کے پڑھانے سے نہ صرف زبانوں کے درمیان ہم آہنگی پیدا ہوگی بلکہ اردو کے بارے میں پائی جانے والی غلط فہمیاں بھی دور ہوں گی۔ کثیر لسانی ماحول میں اردو طلبہ کے لیے ایک ثقافتی اور فکری پل کا کردار ادا کر سکتی ہے۔

NEP 2020 نصاب سازی میں لچک، تخلیق اور عصری تقاضوں کو بنیادی حیثیت دیتی ہے۔ پالیسی کے

مطابق نصاب کو محض امتحان مرکوز نہیں بلکہ مہارت، فہم اور عملی زندگی سے جوڑا جانا چاہیے۔ اردو نصاب کو بھی اسی تناظر میں ازسرنو ترتیب دینے کی ضرورت ہے۔

اردو نصاب میں درج ذیل پہلوؤں کو شامل کیا جا سکتا ہے:

- عصری موضوعات اور سماجی مسائل
- میڈیا، صحافت اور ترجمہ
- تخلیقی تحریر اور تنقیدی فکر
- اردو زبان کا عملی استعمال

اس طرح اردو نصاب طلبہ کے لیے زیادہ مفید، دلچسپ اور روزگار سے ہم آہنگ بن سکتا ہے۔

ڈیجیٹل دور میں قومی تعلیمی پالیسی 2020 ٹیکنالوجی کے مؤثر استعمال پر خصوصی زور دیتی ہے۔ آن لائن تعلیم، ڈیجیٹل مواد، ای-لرننگ پلیٹ فارمز اور ورچوئل کلاس روم اردو تدریس کے لیے نئے امکانات فراہم کرتے ہیں۔

اردو زبان میں ڈیجیٹل نصابی مواد، آڈیو ویژول لیکچرز، ای-کتب اور آن لائن کورسز تیار کر کے اردو کو نئی نسل کے قریب لایا جا سکتا ہے۔ اساتذہ اور طلبہ کے لیے یہ ٹیکنالوجی اردو تدریس کو زیادہ موثر، دلچسپ اور قابلِ رسائی بنا سکتی ہے۔

قومی تعلیمی پالیسی 2020 اساتذہ کو تعلیمی نظام کی بنیاد قرار دیتی ہے۔ اردو اساتذہ کی مسلسل تربیت، جدید تدریسی طریقوں سے واقفیت اور ٹیکنالوجی کی مہارت اردو تدریس کے معیار کو بلند کر سکتی ہے۔

اساتذہ کی تربیت میں درج ذیل امور کو شامل کرنا ضروری ہے:

- جدید تدریسی طریقے
- ڈیجیٹل ٹولز کا استعمال
- تحقیقی و تنقیدی صلاحیت
- نصاب سازی اور تشخیص

یہ اقدامات اردو اساتذہ کو عصری تقاضوں سے ہم آہنگ بنا سکتے ہیں۔

زبان محض اظہار کا ذریعہ نہیں بلکہ کسی بھی قوم کی تہذیبی شناخت، فکری روایت اور تاریخی شعور کی امین ہوتی ہے۔ اردو زبان ہندوستانی تہذیب کی ایک جامع علامت ہے، جس میں مختلف ثقافتوں، مذاہب اور تہذیبی عناصر کی ہم آہنگی پائی جاتی ہے۔ قومی تعلیمی پالیسی 2020

اردو زبان اس کثیر لسانی نظام میں ایک مضبوط کردار ادا کر سکتی ہے۔ اردو کو ہندی، انگریزی اور دیگر علاقائی زبانوں کے ساتھ مربوط کر کے پڑھانے سے نہ صرف زبانوں کے درمیان ہم آہنگی پیدا ہوگی بلکہ اردو کے بارے میں پائی جانے والی غلط فہمیاں بھی دور ہوں گی۔ کثیر لسانی ماحول میں اردو طلبہ کے لیے ایک ثقافتی اور فکری پل کا کردار ادا کر سکتی ہے۔

زبان کو ثقافتی ورثے کے تحفظ اور فروغ کا ایک اہم وسیلہ قرار دیتی ہے، جو اردو کے لیے نہایت اہم ہے۔

اردو تدریس کے ذریعے طلبہ کو اپنی تہذیبی روایت، ادبی ورثے اور فکری سرمایے سے جوڑا جا سکتا ہے۔ ادب، تاریخ، اخلاقیات اور سماجی اقدار اردو زبان کے توسط سے نئی نسل تک منتقل ہو سکتی ہیں۔ NEP 2020 اردو کو صرف ایک لسانی مضمون کے بجائے ثقافتی شناخت کے تحفظ کا ذریعہ بننے کا موقع فراہم کرتی ہے۔

عالمی سطح پر ترقی یافتہ ممالک اپنی مادری زبانوں میں تعلیم کو ترجیح دیتے ہیں۔ فن لینڈ، جاپان، جرمنی اور فرانس جیسے ممالک کی تعلیمی پالیسیاں اس حقیقت کی گواہ ہیں کہ مادری زبان میں تعلیم قومی ترقی کی بنیاد ہوتی ہے۔ قومی تعلیمی پالیسی 2020 بھی اسی عالمی رجحان کی پیروی کرتی ہے۔

اردو زبان کو عالمی زبانوں کے ساتھ ہم آہنگ کر کے پڑھایا جا سکتا ہے۔ ترجمہ، بین الاقوامی ادب اور بین الثقافتی مکالمے کے ذریعے اردو کو عالمی سطح پر بھی مستحکم مقام دلایا جا سکتا ہے۔ اس تناظر میں اردو تدریس عالمی منظرنامے سے جڑنے کی صلاحیت رکھتی ہے۔

اگرچہ قومی تعلیمی پالیسی 2020 اردو کے لیے متعدد امکانات فراہم کرتی ہے، لیکن عملی سطح پر کئی چیلنجز بھی درپیش ہیں۔ ان میں چند مندرجہ ذیل ہیں:

1 اردو اساتذہ کی کمی اور غیر معیاری تربیت
2 جدید اور معیاری نصابی مواد کا فقدان
3 ڈیجیٹل اردو مواد کی کمی
4 اردو کو روزگار سے جوڑنے میں دشواری
5 سماجی اور تعلیمی سطح پر اردو کے بارے میں غلط فہمیاں

ان چیلنجز کا حل منظم منصوبہ بندی اور سنجیدہ تعلیمی اقدامات کے بغیر ممکن نہیں۔

NEP 2020 اردو تدریس کے لیے کئی عملی امکانات فراہم کرتی ہے، جن میں:

- اردو میڈیم اسکولوں کا فروغ
- کثیر لسانی نصاب میں اردو کی شمولیت
- آن لائن اردو کورسز اور ڈیجیٹل پلیٹ فارمز
- اردو کو ہنر، ترجمہ اور میڈیا سے جوڑنا
- تحقیق اور اختراع کی حوصلہ افزائی

یہ امکانات اردو کو عصری تعلیم کے دھارے میں شامل کرنے کا مؤثر ذریعہ بن سکتے ہیں۔

اس مطالعے سے یہ واضح ہوتا ہے کہ قومی تعلیمی پالیسی 2020 اردو تدریس کے لیے ایک جامع اور امید افزا فریم ورک فراہم کرتی ہے۔ اگر اس پالیسی کو دیانت داری اور منصوبہ بندی کے ساتھ نافذ کیا جائے تو اردو زبان تعلیمی، ثقافتی اور فکری سطح پر ایک بار پھر مستحکم مقام حاصل کر سکتی ہے۔

اس تحقیق کی روشنی میں درج ذیل سفارشات پیش کی جاتی ہیں:

1 اردو کو مادری زبان کے طور پر فروغ دیا جائے
2 جدید اور عملی اردو نصاب تیار کیا جائے
3 اردو اساتذہ کی مستقل تربیت کا نظام قائم کیا جائے
4 اردو تدریس میں ٹیکنالوجی کو لازمی جز بنایا جائے
5 اردو کو روزگار اور ہنر سے جوڑا جائے

یہ مقالہ اس امر کی کوشش ہے کہ قومی تعلیمی پالیسی 2020 کے تناظر میں اردو تدریس کے امکانات کو ایک منظم، علمی اور تحقیقی انداز میں پیش کیا جائے۔ اردو زبان اگر جدید تعلیمی تقاضوں سے ہم آہنگ ہو جائے تو وہ نہ

صرف اپنی تہذیبی شناخت برقرار رکھ سکتی ہے بلکہ مستقبل کی تعلیمی ضروریات کو بھی پورا کرسکتی ہے۔

تعلیم میں زبان کا کردار محض معلومات کی ترسیل تک محدود نہیں بلکہ یہ طالب علم کی ذہنی، جذباتی اور فکری نشوونما سے گہرا تعلق رکھتا ہے۔ تعلیمی نفسیات کے ماہرین اس بات پر متفق ہیں کہ بچہ اپنی مادری زبان میں نہ صرف جلد سیکھتا ہے بلکہ اس کی تخلیقی اور تنقیدی صلاحیتیں بھی بہتر طور پر پروان چڑھتی ہیں۔ قومی تعلیمی پالیسی 2020 اسی نفسیاتی اصول کو بنیاد بنا کر مادری زبان میں تعلیم پر زور دیتی ہے۔

اردو زبان چونکہ کروڑوں ہندوستانیوں کی مادری زبان ہے، اس لیے اردو میں تدریس طلبہ کی ذہنی ساخت کو مضبوط کرنے میں مؤثر ثابت ہوسکتی ہے۔ اردو تدریس کے ذریعے طلبہ میں اعتماد، خود اعتمادی اور فکری آزادی پیدا کی جاسکتی ہے، جو جدید تعلیم کے بنیادی مقاصد میں شامل ہے۔

قومی تعلیمی پالیسی 2020 نظام تعلیم کو نوٹ کر سیکھنے کے بجائے طالب علم کو تنقیدی و تجزیاتی صلاحیتوں پر مرکوز نظام کی طرف لے جاتی ہے۔ اردو زبان وادب اس مقصد کے حصول کے لیے غیر معمولی صلاحیت رکھتا ہے۔ اردو ادب میں افسانہ، ناول، شاعری اور تنقیدی مضامین طلبہ کو سوال کرنے، غور و فکر کرنے اور مختلف زاویوں سے مسائل کو دیکھنے کی تربیت دیتے ہیں۔

اردو تدریس کو اگر محض نصابی حد تک محدود نہ رکھا جائے بلکہ اس میں مباحثہ، مکالمہ، تخلیقی تحریر اور تجزیاتی مطالعہ شامل کیا جائے تو یہ طلبہ کی فکری تربیت میں کلیدی کردار ادا کرسکتی ہے۔

قومی تعلیمی پالیسی 2020 اعلیٰ تعلیم میں کثیر لسانی نظام کو فروغ دیتی ہے۔ اس تناظر میں اردو کو اعلیٰ تعلیم اور تحقیق کی زبان کے طور پر مستحکم کرنے کے وسیع امکانات موجود ہیں۔ اردو میں سوشل سائنسز، انسانی علوم، تاریخ، فلسفہ اور مذہبیات جیسے شعبوں میں معیاری تحقیق کی جاسکتی ہے۔

اگر یونیورسٹی سطح پر اردو میڈیم پروگرامز، ترجمہ بیوروز اور تحقیقی مراکز قائم کیے جائیں تو اردو زبان علمی دنیا میں اپنا موثر مقام دوبارہ حاصل کرسکتی ہے۔

اردو تدریس کا ایک اہم مسئلہ یہ ہے کہ اسے روزگار سے کم جوڑا جاتا ہے۔ قومی تعلیمی پالیسی 2020 ہنرمندی (Skill Development) کو تعلیم کا لازمی جز قرار دیتی ہے۔ اردو زبان کو ترجمہ، میڈیا، صحافت، موادنویسی، ڈیجیٹل مارکیٹنگ اور تدریس جیسے شعبوں سے جوڑ کر روزگار کے نئے مواقع پیدا کیے جاسکتے ہیں۔

اس طرح اردو محض ادبی زبان نہیں بلکہ عملی زندگی سے وابستہ ہوکر ایک موثر ذریعہ بن سکتی ہے۔

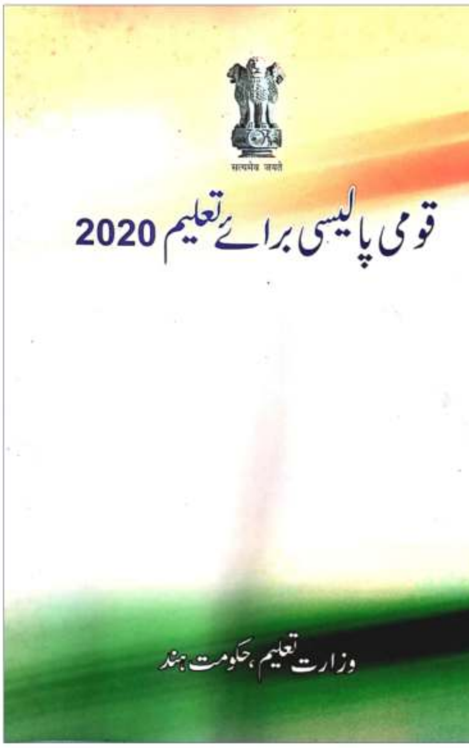

NEP 2020 امتحان پر مبنی نظام کے بجائے مسلسل اور جامع جائزہ (Continuous and Comprehensive Evaluation) کی حوصلہ افزائی کرتی ہے۔ اردو تدریس میں بھی اساتذہ کو چاہیے کہ وہ طلبہ کی صلاحیتوں کو جانچنے کے لیے تخلیقی سرگرمیاں، پروجیکٹس، زبانی اظہار اور عملی سرگرمیوں کو شامل کریں۔

یہ طریقہ اردو زبان کے فطری مزاج سے ہم آہنگ ہے اور طلبہ کی ہمہ جہتی ترقی کو یقینی بناتا ہے۔

اردو تدریس کے فروغ کے لیے تعلیمی اداروں، جامعات، مدارس اور سرکاری تنظیموں کو مشترکہ طور پر کام کرنا ہوگا۔ قومی تعلیمی پالیسی 2020 ادارہ جاتی خود مختاری اور اختراع کی حمایت کرتی ہے، جس سے اردو کے لیے نئے تعلیمی ماڈلز تشکیل دیے جاسکتے ہیں۔

قومی تعلیمی پالیسی 2020 تعلیم کو صرف معلومات کی ترسیل کا ذریعہ نہیں بلکہ اقدار انسانی کی تشکیل کا وسیلہ قرار دیتی ہے۔ اس پالیسی کے مطابق تعلیم کا مقصد ایسے باشعور، بااخلاق اور ذمہ دار شہری تیار کرنا ہے جو معاشرے میں مثبت کردار ادا کرسکیں۔ اردو زبان وادب اس ضمن میں غیر معمولی اہمیت رکھتے ہیں، کیونکہ اردو ادب میں اخلاقی اقدار، انسانی ہمدردی، رواداری، سماجی انصاف اور روحانی بالیدگی جیسے عناصر وافر مقدار میں موجود ہیں۔

اردو تدریس کے ذریعے طلبہ میں احترام انسانیت، برداشت، مکالمہ اور اخلاقی شعور پیدا کیا جاسکتا ہے۔ غالب، اقبال، پریم چند، شبلی اور حالی جیسے ادیبوں کی تخلیقات نہ صرف ادبی ذوق کو جلا بخشتی ہیں بلکہ اخلاقی اور سماجی شعور کو بھی بیدار کرتی ہیں۔ NEP 2020 کے اقدار پر مبنی تعلیمی تصور کے تحت اردو ادب ایک موثر ذریعہ ثابت ہوسکتا ہے۔

قومی تعلیمی پالیسی 2020 سماجی شمولیت، مساوات اور تعلیمی انصاف کو مرکزی اہمیت دیتی ہے۔ اردو زبان تاریخی طور پر ایک عوامی زبان رہی ہے، جس نے مختلف سماجی طبقات کو آپس میں جوڑنے کا کام کیا ہے۔ اردو تدریس سماجی طور پر پسماندہ طبقات، اقلیتوں اور محروم طبقوں کے لیے تعلیمی مواقع فراہم کرسکتی ہے۔

اردو میڈیم اسکول اور ادارے ایسے طلبہ کے لیے تعلیم کو قابلِ رسائی بناتے ہیں جو دوسری زبانوں میں تعلیم حاصل کرنے سے قاصر ہوتے ہیں۔ اس طرح اردو تدریس NEP 2020 کے سماجی انصاف اور مساوی تعلیم کے وژن کو عملی جامہ پہنا سکتی ہے۔

ہندوستان ایک کثیر ثقافتی اور کثیر لسانی ملک ہے، جہاں قومی یکجہتی کا انحصار مختلف زبانوں اور ثقافتوں کے درمیان ہم آہنگی پر ہے۔ اردو زبان اس ہم آہنگی کی ایک روشن مثال ہے۔ قومی تعلیمی پالیسی 2020 قومی اتحاد اور ثقافتی ہم آہنگی کو تعلیم کا بنیادی مقصد قرار دیتی ہے۔

اردو تدریس کے ذریعے مختلف تہذیبوں، مذاہب اور ثقافتوں کے درمیان مکالمہ فروغ پاسکتا ہے۔ اردو زبان کی مشترکہ تہذیبی روایت طلبہ کو قومی یکجہتی اور ہم آہنگی کا شعور عطا کرتی ہے، جو عصری ہندستان کی ایک اہم ضرورت ہے۔

قومی تعلیمی پالیسی 2020 تخلیقی صلاحیت (Creativity) کو تعلیم کا مرکزی عنصر قرار دیتی ہے۔

اردو زبان اور ادب تخلیقی اظہار کے بے شمار مواقع فراہم کرتے ہیں۔ شاعری، افسانہ، ڈرامہ، مضمون نویسی اور ترجمہ اردو تدریس کے ایسے شعبے ہیں جو طلبہ کی تخلیقی صلاحیتوں کو نکھار سکتے ہیں۔

اگر اردو تدریس میں تخلیقی سرگرمیوں کو شامل کیا جائے تو طلبہ زبان کو محض امتحانی مضمون نہیں بلکہ اظہار ذات کا ذریعہ سمجھنے لگتے ہیں۔ یہ رجحان اردو زبان کے مستقبل کے لیے نہایت مفید ثابت ہوسکتا ہے۔

قومی تعلیمی پالیسی 2020 تحقیق کو اعلیٰ تعلیم کا بنیادی ستون قرار دیتی ہے۔ اردو زبان میں تحقیق کے فروغ کے لیے نئے تحقیقی موضوعات، بین الموضوعاتی (Interdisciplinary) مطالعات اور عصری مسائل پر تحقیق کی ضرورت ہے۔

اردو تحقیق کو اگر سماجیات، تعلیم، میڈیا، مذہب اور فلسفے جیسے شعبوں سے جوڑا جائے تو اردو زبان تحقیقی دنیا میں ایک مضبوط مقام حاصل کرسکتی ہے۔ NEP 2020 اردو تحقیق کے لیے ایک سازگار ماحول فراہم کرتی ہے۔

ڈیجیٹل دور میں زبانوں کی بقا اور فروغ کا انحصار ان کی ڈیجیٹل موجودگی پر ہے۔ قومی تعلیمی پالیسی 2020 ڈیجیٹل ثقافت اور آن لائن تعلیم کو فروغ دیتی ہے۔ اردو زبان کو ڈیجیٹل پلیٹ فارمز پر مضبوط بنانے کی اشد ضرورت ہے۔

آن لائن جرائد، ڈیجیٹل کتب خانے، یوٹیوب لیکچرز، پوڈکاسٹس اور ای لرننگ پلیٹ فارمز اردو تدریس کے لیے نئے افق کھول سکتے ہیں۔ یہ اقدامات اردو کو عالمی سطح پر متعارف کرانے میں بھی مددگار ثابت ہوں گے۔

مندرجہ بالا مباحث سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ قومی تعلیمی پالیسی 2020 اردو تدریس کے لیے صرف ایک پالیسی دستاویز نہیں بلکہ ایک فکری و عملی منشور ہے۔ اردو زبان اگر اس پالیسی کے تحت دیے گئے مواقع سے بھرپور استفادہ کرے تو وہ نہ صرف تعلیمی میدان میں اپنی بقا کو یقینی بنا سکتی ہے بلکہ سماجی، ثقافتی اور قومی سطح پر بھی موثر کردار ادا کرسکتی ہے۔

قومی تعلیمی پالیسی 2020 تعلیم میں بین الموضوعاتی مطالعہ کو فروغ دیتی ہے، جس کے تحت مختلف مضامین کو ایک دوسرے سے مربوط کرکے پڑھایا جاتا ہے۔ اردو زبان و ادب اس ضمن میں غیر معمولی صلاحیت رکھتا ہے، کیونکہ اردو ادب میں تاریخ، سماجیات، فلسفہ، مذہب، نفسیات اور سیاسیات جیسے موضوعات وافر مقدار میں پائے جاتے ہیں۔

اردو تدریس کو اگر بین الموضوعاتی انداز میں پیش کیا جائے تو طلبہ زبان کو محض ادبی متن کے طور پر نہیں بلکہ سماجی حقیقت کے آئینے کے طور پر سمجھنے لگتے ہیں۔ یہ طریقہ تدریس اردو کو عصری علوم سے جوڑنے میں نہایت معاون ثابت ہوسکتا ہے۔

اردو تدریس کا مستقبل قومی تعلیمی پالیسی 2020 کے موثر نفاذ سے وابستہ ہے۔ اگر اردو زبان کو تعلیمی پالیسیوں میں مرکزی حیثیت دی جائے تو آنے والے وقت میں اردو نہ صرف زندہ رہے گی بلکہ ترقی بھی کرے گی۔

ترجمہ نگاری اردو زبان کے فروغ اور علمی وسعت کا ایک اہم ذریعہ رہی ہے۔ قومی تعلیمی پالیسی 2020 مختلف زبانوں کے درمیان علمی تبادلے پر زور دیتی ہے۔ اردو ترجمہ نگاری کے ذریعے عالمی علوم، سائنسی تحقیق اور عصری نظریات کو اردو زبان میں منتقل کیا جا سکتا ہے۔ اردو تدریس میں ترجمہ کو ایک عملی مہارت کے طور پر شامل کرنے سے طلبہ کے لیے روزگار کے نئے مواقع پیدا ہو سکتے ہیں۔ اس طرح اردو زبان علمی اور معاشی دونوں سطحوں پر مضبوط ہوسکتی ہے۔

قومی تعلیمی پالیسی 2020 نصابی اور غیر نصابی سرگرمیوں کے امتزاج پر زور دیتی ہے۔ اردو تدریس میں مشاعرے، مباحثے، ڈرامہ، تقریری مقابلے اور ادبی نشستیں طلبہ میں زبان سے رغبت پیدا کرتی ہیں۔ غیر نصابی سرگرمیوں کے ذریعے اردو زبان زندہ اور متحرک شکل میں طلبہ کے سامنے آتی ہے، جو زبان سیکھنے کے عمل کو فطری اور دلچسپ بنا دیتی ہے۔

قومی تعلیمی پالیسی 2020 اساتذہ کو محض ایک تدریسی عملہ نہیں بلکہ تعلیمی رہنما (Educational Leaders) قرار دیتی ہے۔ اردو اساتذہ اگر تحقیقی، فکری اور انتظامی سطح پر قائدانہ کردار ادا کریں تو اردو تدریس کا معیار بلند ہوسکتا ہے۔ اساتذہ کی قیادت اردو زبان کے فروغ میں ایک فیصلہ کن کردار ادا کرسکتی ہے، خصوصاً تعلیمی پالیسیوں کے نفاذ میں۔

تعلیم ایک سماجی عمل ہے، جس میں کمیونٹی کی شراکت ناگزیر ہوتی ہے۔ قومی تعلیمی پالیسی 2020 مقامی برادری کی شمولیت کو تعلیمی ترقی کا اہم جز قرار دیتی ہے۔ اردو تدریس میں والدین، ادبی تنظیموں اور سماجی اداروں کی شرکت اردو زبان کے فروغ میں مددگار ثابت ہوسکتی ہے۔

اگرچہ قومی تعلیمی پالیسی 2020 اردو تدریس کے لیے امید افزا امکانات فراہم کرتی ہے، لیکن پالیسی کے عملی نفاذ میں کئی رکاوٹیں درپیش ہیں، جیسے:

- وسائل کی کمی
- انتظامی پیچیدگیاں
- تربیت یافتہ اساتذہ کا فقدان

ان مسائل کے حل کے لیے جامع منصوبہ بندی اور پالیسی سطح پر سنجیدہ اقدامات کی ضرورت ہے۔

اردو تدریس کا مستقبل قومی تعلیمی پالیسی 2020 کے موثر نفاذ سے وابستہ ہے۔ اگر اردو زبان کو تعلیمی پالیسیوں میں مرکزی حیثیت دی جائے تو آنے والے وقت میں اردو نہ صرف زندہ رہے گی بلکہ ترقی بھی کرے گی۔

حواشی

1 کلیم، سلیم۔ (2018)۔ اردو تدریس کے جدید رجحانات۔ نئی دہلی: ایجوکیشنل پبلشرز۔
2 قریشی، احمد۔ (2019)۔ اردو زبان اور تعلیمی مسائل۔ اردو تحقیق، 12(2)، 45–60۔
3 فاروقی، شمیم حنفی۔ (2015)۔ اردو زبان اور تہذیبی شناخت۔ نئی دہلی: نیشنل کونسل فار پروموشن آف اردو لینگویج۔
4 سعیدی، اسلم۔ (2017)۔ اردو نصاب اور تدریسی مسائل۔ علی گڑھ: ایجوکیشنل بک ہاؤس۔
5 اقبال، محمد۔ (2012)۔ تشکیلِ جدید الٰہیاتِ اسلام۔ لاہور: اقبال اکیڈمی۔
6 پریم چند۔ (2010)۔ منتخب افسانے۔ نئی دہلی: راج کمل پرکاشن۔

■

Dr. Mufti Sohail Nadwi
Principal, MESCO Junior College
Mesco Educational Complex,
Mustaidpura, Karwan Road
Telangana-500006
Email: msanadvi93900@gmail.com

اردو کی تدریس اور ٹیکنالوجی کا استعمال

محمد مشہور احمد

اکیسویں صدی زندگی کے تمام شعبوں میں نت نئ اختراعات و ایجادات کے لیے جانی جاتی ہے۔ اس صدی میں حیات انسانی کے تمام پہلو جس برق رفتاری کے ساتھ جدید سے جدید تر ٹیکنالوجی کے زیر اثر آئے وہ محیر العقول ہیں۔ اس کے استعمال سے جہاں زندگی ایک طرف پہلے کے مقابلے آسان ترین ہوگئی وہیں اس کے منفی طریقۂ استعمال نے صدیوں پرانے انسانی مسلّمات و معتقدات پر کاری ضرب بھی لگائی ہے۔ لیکن بایں ہمہ تکنیکی ارتقا کا یہ عمل خلائی سیاروں کی مانند پیہم گردش میں ہے۔ اس کے علاوہ علوم وفنون کے وہ تمام سرچشمے جو وجودِ انسانی کے ساتھ منسلک ہیں اور جن کی مدد سے فطرت انسانی یعنی آدم خاکی نے حیات و کائنات کے اسرار ورموز سے پردہ کشائی کی ہے اسے دیکھ کر ہے چرخِ کُہن کے انجمِ تاباں اس خیال سے انگشت بہ دنداں ہیں کہ یہ ٹوٹا ہوا تارہ جو کبھی اپنی ذات کے نشیب وفراز میں الجھ کر رہ گیا تھا آج سورج کی شعاؤں کو گرفتار اور ستاروں کی گزرگاہوں کی حدیں مقرر کر رہا ہے۔ جس کے لیے کبھی خط استوا پر پابہ رکاب ہونا دشوار تھا آج دنیا کی پیچیدہ ترین گزرگاہوں کو دریافت کر رہاہے۔ فطرتِ انسانی کے اسی اختراعی اور تسخیریت پسند جذبۂ عمل کی اہمیت کو تسلیم کرتے ہوئے غالب نے کہا تھا:

ہے کہاں تمنا کا دوسرا قدم یا رب
ہم نے دشت امکاں کو ایک نقش پا پایا

کائنات کی تمام حدود کو اپنے تصرف واختیار میں لانے کے لیے فطرت انسانی ہر لحظہ سرگرم عمل ہے۔ جس کے مقاصد کثیرہ میں سے ایک بنیادی مقصد حیات انسانی کے تمام شعبوں کو آسان ترین آلات سے مزین کرنا اور نت نئ ٹیکنالوجی کے استعمال سے خاکدان گیتی کے ہر ذرۂ سیاہ کو علم وعرفان کی روشنی عطا کرنا ہے۔

اکیسویں صدی میں زندگی کے جن شعبوں میں سب سے زیادہ ترقی ہوئی ان میں انفارمیشن ٹیکنالوجی بھی سرفہرست ہے۔ اس شعبے کی اہمیت کو دیکھتے ہوئے بعض ماہرین نے یہاں تک کہہ دیا ہے کہ Information is the wealth یعنی اب معلومات ہی وہ واحد سرمایۂ حقیقی ہے جسے آنے والے وقت میں دیگر مقاصد کے حصول کے لیے استعمال کیا جائے گا۔ معلومات سے مراد یہاں صرف اشیا و اشخاص کے بارے میں مجرد معلومات کا حصول ہی نہیں بلکہ حاصل ہونے والی معلومات کے مطابق چیزوں کی ازسرنو تشکیل وترتیب اور حیات وکائنات کے سربستہ اسرار ورموز کا مطالعہ کر کے انھیں روزمرہ کی زندگی میں قابل منفعت بنانا بھی ہے۔ فطرت انسانی روز ازل سے یہ فریضہ انجام دے رہی ہے اور حالات کے مطابق اپنے اعمال کو ڈھال کر زندگی اور اس سے وابستہ معاملات کو آسان بنا رہی ہے۔ انفارمیشن ٹکنالوجی کے میدان میں جس چیز کی وجہ سے سب سے عظیم انقلاب برپا ہوا وہ انٹرنیٹ کی ایجاد اور دنیا کے کونے کونے میں اس کا کثرت استعمال ہے۔ آج کے اس ترقی یافتہ دور میں کسی گاؤں میں بیٹھ کر گوکہ وہاں پکی سڑک نہ ہو، آرام وآسائش سے بھرپور زندگی گزارنے کے لیے سہولیات موجود نہ ہوں لیکن دنیا کے کسی کونے میں پیش آنے والے چھوٹے سے چھوٹے واقعات تک نہ صرف ہم رسائی حاصل کر سکتے ہیں بلکہ مختلف تصاویر اور ویڈیوز کے توسط سے وہاں کے حالات کا اپنی آنکھوں سے جائزہ لے کر اپنی رائے بھی قائم کر سکتے ہیں۔ یہ اگر ممکن ہو سکا تو اس کی سب سے بڑی وجہ انسانیت کو قدرت کے خزانہ علم سے عطا کیا جانے والا وہ ادنی سا جوہر ہے جو کہ انٹرنیٹ کے معرض وجود میں لانے کا سبب بنا۔ انفارمیشن اینڈ کمیونکیشن ٹیکنالوجی کے نظام میں انٹرنیٹ کی ایجاد اور بعد کے زمانے میں اس میں ہونے والی ترقی ببانگ دہل اس بات کا علان کر رہی ہے کہ سمندر کی تہوں میں خاموشی سے صدف وخزف بنانے والے اے ابرنیساں، دریاؤں کی موج مضطر میں سکون سے سونے والے طوفان اور آسمان کی لامحدود خلاؤں میں سورج کی کرنوں کو سمیٹ کر قوت وتوانائی حاصل کرنے والی خلائی شعاؤں! اپنی نا قابل تسخیر قوت پر اب زیادہ نازاں نہ ہونا کیوں کہ فطرت انسانی علم و آگہی کی روشنی سے کائنات کو مسخر کرنے نکل چکی ہے۔ مظاہر فطرت کو تسخیر و زیر کرنے کا یہ عمل ہنوز نہ صرف جاری ہے بلکہ اس کے اندر روزافزوں ترقی بھی ہو رہی ہے، شاعر مشرق علامہ اقبال کا یہ شعر کچھ اسی فکر کی نمائندگی کر رہا ہے:

گرچہ اسکندر رہا محروم آب زندگی
فطرت اسکندری اب تک ہے گرم ناؤ ونوش

آج کے اس ترقی یافتہ دور میں نہ صرف حصول علم کے حوالے سے تکنیکی ارتقا (Technological Advancement) کا پہلو اہمیت حاصل کر چکا ہے بلکہ تدریس کا شعبہ بھی اس کی درافشانیوں سے مہر منور کی طرح چمکتا اور دمکتا دکھائی دیتا ہے۔ تدریس کے میدان میں ہونے والی تکنیکی ترقی نے تعلیم و تدریس کے مرحلے کو نہ صرف یہ کہ بہت دلچسپ بنا دیا ہے بلکہ الگ الگ موضوعات پر مشتمل اپلیکیشن تشکیل دے کر اساتذہ کو پڑھانے اور طلبہ کو پڑھنے کے سلسلے میں بڑی حد تک آسانی بھی پیدا کر دی ہے۔ اس مضمون میں سب سے پہلے مطلق تدریس کے حوالے سے ٹیکنالوجی یا تکنیکی ارتقا کے سبب سامنے آنے والی خصوصیات اور اس کے ضمن میں پیدا ہونے والی آسانیوں کا احاطہ کیا جا رہا ہے اس کے بعد اردو تدریس کے حوالے سے تکنیکی ترقی کی ذرہ نوازیوں پر گفتگو کی جائے گی۔ تدریس کے میدان میں جن آلاتِ ٹیکنالوجی کا استعمال آج بکثرت مروج ہے ان میں سے چند کو ذیل میں پیش کیا جاتا ہے۔

1 (Learning Managemnt System) اس تکنیکی نظام کے تحت آج کے جدید دور میں جن Applications کے استعمال سے نظام تعلیم و تدریس کو دلچسپ اور طلبہ کے لیے مفید و کارآمد بنایا جا رہا ہے اس میں Google Class Room، Moodle اور Canvas جیسے تکنیکی پلیٹ فارم سر فہرست ہیں۔ ان پلیٹ فارمز کے توسط سے تعلیمی مواد کو منظّم، سرعت اور آسانی کے ساتھ منتقل کیا جا سکتا ہے۔ یہ پلیٹ فارم اساتذہ کے لیے اس بات کی سہولت پیدا کرتے ہیں کہ وہ کسی بھی وقت پردہ مجاز میں رہتے ہوئے حقیقی و عملی طور پر تعلیمی مواد کو طلبہ تک پہونچا سکیں، وقت پر طلبہ کا امتحان لے سکیں اور طلبہ کے لیے اگر کوئی امر یا سبق تفصیل طلب ہو تو اس پر بات کر سکیں اور تدریس کے بعد طلبہ کی رائے بھی جان سکیں۔ گو کہ یہ پلیٹ فارم پہلے سے ہی موجود تھے لیکن بالخصوص ہندوستانی نظام تدریس کے حوالے سے کورونا کے بعد ان کے افادی پہلوؤں پر زیادہ زور دیا جانے لگا ہے۔ مروجہ تدریسی نظام کے ساتھ اگر ان تکنیکی وسائل کا استعمال بھی کیا جائے تو تعلیم و تدریس کے معیار کو مزید بہتر بنایا جا سکتا ہے۔

2 Interactive Presentation Tools کا استعمال۔ یہ تدریس کے میدان میں اختراع کیے جانے والے اہم آلات میں سے ایک ہے۔ اس تکنیک کی مدد سے مروجہ تدریسی نظام کو طلبہ کی طبعی موزونیت کے مطابق ڈھالا جا سکتا ہے۔ اس پلیٹ فارم کے استعمال سے تدریسی مواد میں کسی قسم کی کمی نہیں کی جاتی بس دوران کلاس طلبہ کی توجہ کو مرکوز رکھنے کے لیے کچھ امدادی تکنیکی آلات کا استعمال کیا جاتا ہے۔ مثلاً کلاس کے دوران ہی زیر بحث موضوع پر کوئز مقابلہ رکھنا اور دوران کلاس ہی ایک متعینہ وقت کے بعد اس کے نتائج کا اعلان کرنا وغیرہ۔ اس کے لئے Mentimeter Nearpod، اور Pear Deck وغیرہ جیسے تکنیکی پلیٹ فارمز کا استعمال کیا جا سکتا ہے۔

> اکیسویں صدی میں زندگی کے جن شعبوں میں سب سے زیادہ ترقی ہوئی ان میں انفارمیشن ٹیکنالوجی بھی سرفہرست ہے۔ اس شعبے کی اہمیت کو دیکھتے ہوئے بعض ماہرین نے یہاں تک کہہ دیا ہے کہ Information is the wealth یعنی اب معلومات ہی وہ واحد سرمایۂ حقیقی ہے جسے آنے والے وقت میں دیگر مقاصد کے حصول کے لیے استعمال کیا جائے گا۔

3 Virtual Meeting Platforms کا استعمال: موجودہ دور کے تناظر میں تدریس کے حوالے سے یہ پلیٹ فارم بہت اہمیت کا حامل ہے۔ اس کے ضمن میں Google Meet, Zoom & Microsoft Teams وغیرہ جیسی اپلیکیشنز کا استعمال کیا جاتا ہے۔ اس کے ذریعے کلاس روم میں پڑھائے جانے والے سبق سے متعلق ہر طالب علم کی آگاہی و ذہن رسیدگی کا اندازہ بخوبی لگایا جا سکتا ہے۔ دوران تدریس اگر کوئی نکتہ کسی طالب علم کی سمجھ میں نہیں آ سکا اور وہ کلاس میں اس کے بارے میں کسی وجہ سے دریافت کرنے سے قاصر رہا تو ان پلیٹ فارمز کی مدد سے وہ استاد سے جڑ کر اپنے شکوک وشبہات کا ازالہ بھی کر سکتا ہے۔

اس کے علاوہ تدریس کے میدان میں ٹیکنالوجی کے ذریعے جن وسائل کو فراہم کیا گیا ان میں Digital Content Creation، Whiteboards کی توضیح Tools کی تشکیل اور Artificial Intelligence جیسی تکنیک آج کے روز افزوں ترقی پذیر دور میں تدریسی عمل کو سنوارنے اور اسے دلچسپ بنانے میں کافی اہمیت کے حامل ہیں۔ میرے نزدیک ان تینوں میں سے جس ٹیکنالوجی نے شعبۂ تعلیم و تدریس ہی کیا بلکہ تمام شعبہ ہائے حیات کو سب سے زیادہ متاثر کیا ہے وہ Arificial Intelligence یعنی مصنوعی ذہانت ہے۔ مثال کے طور پر Automatic Vehicles کا چلن، Computerized Command کے ساتھ Robots سے انسانی خدمات کی انجام دہی، اور ایک ایسی دنیا میں رہنے والے انسان نما تصوراتی کرداروں سے حقیقی دنیا میں بسنے والے انسانوں کا Interaction جو کہ فی الواقع موجود ہی نہیں۔ اس کے علاوہ Medical, Science, Social Science, Anthropology, Aeronotics, Space Science وغیرہ جیسے میدانوں میں تو اس کی اہمیت سے کسی کو بھی مجال انکار نہیں لیکن ادب اور لسانیات کے میدان میں بھی اس کے افادی پہلوؤں کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ ادب کے میدان میں Artificial Intelligence کے جن وسائل کا استعمال کیا جا رہا ہے یا کیا جا سکتا ہے ان میں ChatGPT، Grok، Grammarly اور Quillbot وغیرہ کا استعمال کثرت سے مروج ہے۔ مثال کے طور پر یہ وہ پلیٹ فارم ہے جہاں کسی موضوع سے متعلق آپ کا ایک چھوٹا سا تحریری یا زبانی اشارہ اس پر مشتمل ایک معتد بہ ذخیرہ آپ کے سامنے پیش کر دے گا۔

یہاں تھوڑی دیر رک کر ذرا غور کریں کہ ایک زمانہ وہ بھی تھا جب کسی موضوع سے متعلق مواد یا معلومات تک رسائی حاصل کرنے میں کتنی دشواریوں کا سامنا ہوتا تھا اور آج ہمیں معلومات کا یہ بحر بے کراں ایک کلک پر دستیاب ہے۔

اب رہی بات کہ اردو تدریس کو ٹیکنالوجی سے کس طرح سے ہم آہنگ کر کے اسے طلبہ کے لیے زیادہ سے زیادہ کارآمد بنایا جائے۔ تو اس سوال کا جواب یہ ہے کہ دیگر مضامین کی طرح اردو بھی ایک مضمون ہے۔ اگر ہندی، انگریزی، عربی، فارسی اور دنیا کی سرکردہ زبانوں میں متذکرہ بالا تکنیکی وسائل کا استعمال کر کے تدریس کے عمل کو بہتر اور آسان بنایا جا رہا ہے تو اس کی مدد سے اردو تدریس کے میدان میں بھی انقلاب برپا کیا جا سکتا ہے۔ یہاں اس بات کو تسلیم کرنے میں کوئی حرج نہیں کہ اردو دنیا کی اہم اور کثرت سے بولی جانے والی زبانوں میں سے ایک ہے۔ کسی بھی زبان کے زندہ رہنے کی ایک بڑی وجہ یہ بھی ہے کہ اس زبان کے بولنے اور سمجھنے والے کتنے ہیں۔ جب ہم اس تناظر میں اردو کو دیکھتے ہیں تو ہمیں خوشی ہوتی ہے کہ تعداد میں اضافہ ہی ہوا ہے۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ رسم الخط جاننے والوں کی تعداد میں کسی حد تک کمی واقع ہوئی ہے۔ مگر اس کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ آج سے ایک یا دو دہائی قبل اگر اردو کے اخبارات و رسائل کی تعداد کو دیکھیں تو مایوسی ہوتی ہے لیکن اس شکوہ سنجی کے دور میں اردو کے اخبارات، رسائل، آن لائن اردو پورٹل، آن لائن جرائد، اردو کی مفید اور خوبصورت ویب سائٹس اور دیگر برقی ذرائع ابلاغ میں اضافہ ہی ہوا ہے۔ اسی طرح نئے تکنیکی وسائل مثلاً کمپیوٹر، اسمارٹ فون اور ٹیبلیٹ وغیرہ میں اردو فونٹ کا ان بلٹ ہونا اپنے آپ میں اس حقیقت کا غماز ہے کہ اردو کا چلن بڑھ رہا ہے۔ ایسا اس لیے نہیں ہے کہ Consumerism یعنی صارفیت پسندی کے اس دور میں بڑے بڑے صنعتی اداروں کو اردو سے محبت ہے بلکہ بازار کی ضرورت کے تحت دیگر متداول زبانوں کے ساتھ ساتھ انھیں اردو کو بھی شامل کرنا ہی پڑ رہا ہے۔ معلومات کے ذخائر اب اردو رسم الخط کے ساتھ بھی آن لائن دستیاب ہیں لیکن ان معلومات کو ٹیکنالوجی کی مدد سے دوران تدریس نفع بخش بنانے کے لیے ایک اردو مدرس کی حیثیت سے ہمیں اس ٹیکنالوجی کے استعمال کا طریقہ سیکھنا ہوگا اور اس کے لیے کمال مہارت تک نہ سہی لیکن اس حد تک انگریزی زبان سیکھنا اور اس کے عملی اطلاق کا سلیقہ ہمارے لیے لازمی ہے کہ ہم کسی اپلیکیشن کو قابل استعمال بنانے کی راہ میں درپیش مسائل کو از خود حل کر سکیں۔

اردو تدریس کو ٹیکنالوجی کی مدد سے کس طرح سے دلچسپ اور موثر بنایا جا سکتا ہے اس بات کو سمجھنے کے لیے آیئے ایک چھوٹا سا تجربہ کرتے ہیں۔ فرض کیجیے ہم کلاس میں طلبہ کو کوئی ناول، افسانہ، انشائیہ یا نظم پڑھا رہے ہیں۔ ظاہر ہے اصناف ادب میں منظر نگاری کی بڑی اہمیت ہوتی ہے۔ ناول یا افسانے میں الفاظ کے توسط سے تخلیق کیے جانے والے مناظر کو ہم عالم تصورات میں جا کر طلبہ کو سمجھا رہے ہیں لیکن چونکہ طلبہ کا ذہن ابھی اس طرح بالغ نہیں کہ وہ بعینہٖ اپنے استاد کی طرح ان مناظر کو تصور میں لا کر انھیں اپنے چشم تخیل سے احاطہ ادراک میں لا سکیں۔ مثلاً افسانہ کفن میں گھیسو اور مادھو جس بجھے ہوئے الاؤ کے سامنے آلو کے پکنے کا انتظار کر رہے ہیں اور بدھیا دردزہ کی شدت سے پچھاڑیں کھا رہی ہے لیکن دونوں میں سے کوئی بھی اس خیال سے اسے دیکھنے نہیں جاتا کہ دوسرا اس کے حصے کا آلو چٹ کر جائے گا۔ یا ناول گئودان میں گائے کے غم میں بستر مرگ پر لیٹا ہوا ہوری اور بعد مرگ پنڈت کی طرف سے گئودان کا مطالبہ کیا جانے والا منظر، یا افسانہ پوس کی رات میں شدید ٹھنڈ سے ٹھٹھرتے ہوئے ہلکو کا اپنے کتے سے مخاطب ہونا اور اسے اپنی غریبی و حرماں نصیبی کی روداد سنانا یا علامہ شبلی نعمانی کی نظم عدل جہانگیری میں ہر چیز کو جس نفاست و فنی ہنرمندی کے ساتھ ایک ڈرامائی انداز میں پیش کیا گیا ہے، وہ بے مثال ہے۔ اس نظم کا ایک بند پیش خدمت ہے:

قصر شاہی میں ممکن نہیں غیروں کا گزر
ایک دن نور جہاں بام پہ تھی جلوہ فگن
کوئی شامت زدہ رہگیر ادھر آ نکلا
گرچہ تھی قصر میں ہر چار طرف سے قدغن
غیرت حسن سے بیگم نے طمانچہ مارا
خاک پر ڈھیر تھا اک کشتہ بے گور و کفن

ان تمام مناظر کو ہم ٹیکنالوجی کی مدد سے طلبہ کے لیے کچھ اس حد تک موثر اور دلچسپ بنا سکتے ہیں کہ یہ مناظر کبھی بھی ان کی آنکھوں سے اوجھل نہیں ہوں گے۔ اس کے لیے Artificial Intelligence کا سہارا لے کر ہم OpenArt AI ، Leonardo AI ، Photoroom، ChatGPT Image Generator اور You Cam AI Pro وغیرہ جیسی Applications کی مدد سے ہم ان مناظر کو تجسیم کے مرحلے سے گزار سکتے ہیں۔ محسوسات کو مجسم شکل میں پیش کر دینا نہ صرف تدریس کو موثر و دلچسپ بنا دے گا بلکہ جماعت میں طلبہ کی باضابطہ حاضری کا بھی ضامن ہوگا۔ آج کے موجودہ دور میں جبکہ ٹیکنالوجی کی سہولیت ہمیں دستیاب ہے اگر ہم کلاس روم کی تدریس کو طلبہ کے لیے Interesting نہیں بناتے تو ممکن ہے کہ ہم ان کے اندر پڑھائی کا جذبہ پیدا نہ کر سکیں کیونکہ آج ایسے بہت سے وسائل وافر مقدار میں موجود ہیں جو سامان فرحت و انبساط اور علم و آگہی مہیا کرانے کے پردے میں انھیں تضیع اوقات پر مجبور کر دیتے ہیں۔ آج ہم اس بات سے انکار نہیں کر سکتے کہ ہماری نوجوان نسل کس طرح گھنٹوں ریلز دیکھنے، آن لائن گیمز کھیلنے اور طرح طرح کے غیر ضروری و غیر اخلاقی ویڈیوز دیکھنے میں اپنا قیمتی وقت برباد کر رہی ہے۔ یہ سب دیکھ کر کبھی کبھی تو ہم یہ سوچنے لگ جاتے ہیں کہ:

یہ مشت خاک، یہ صرصر یہ وسعت افلاک
کرم ہے یا کہ ستم تیری لذت ایجاد

نوجوان نسل آج جسے شاخ نبات سمجھ کر چبا رہی ہے اسے پتہ ہی نہیں کہ یہ تو دراصل برگ حشیش ہے اور جب اس کا نشہ ٹوٹتا ہے اور ہوش آتا ہے تب تک کچھ بننے، کرنے یا خود کو سنوارنے کی عمر ختم ہو چکی ہوتی ہے۔

بطور ایک اردو استاد کے ہماری پیشہ ورانہ اور ساتھ ہی ساتھ اخلاقی ذمے داری بھی ہے کہ موجودہ دور میں دستیاب ٹیکنالوجی کی مدد سے ہم تدریس کو کچھ اس قدر دلچسپ اور آسان بنا دیں کہ طلبہ کو تضیع اوقات کا موقع ہی نہ مل سکے۔ دیگر زبانوں میں تکنیکی وسائل کا استعمال کرتے ہوئے تدریس کے مرحلے کو جس طرح سے آسان اور دلچسپ بنایا جا رہا ہے اردو زبان و ادب کی تدریس میں بھی ان کا اطلاق کرتے ہوئے ہم اس زبان کی تدریس کو موثر بنا سکتے ہیں۔

■

Dr. Mohd Mashhoor Ahmad
Assistant Professor
M.S. College Motihari, (Bihar)
Pin-845401

بی بی رضا خاتون

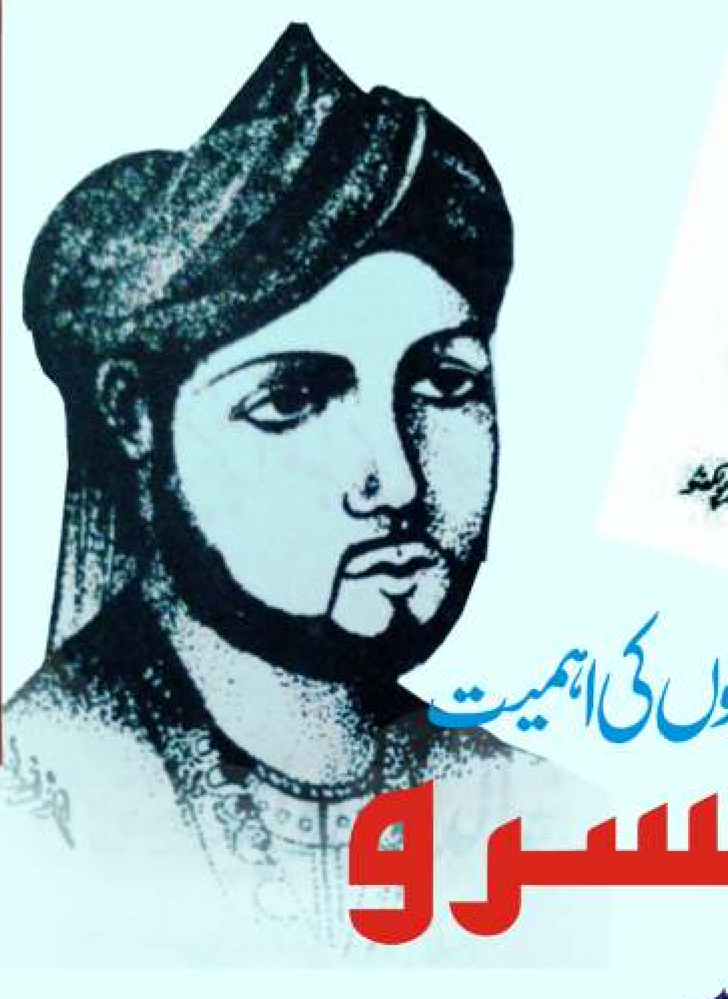

زبان کی تدریس میں پہیلیوں کی اہمیت
امیر خسرو
کے حوالے سے

پہیلیاں صدیوں سے انسانی تہذیب وثقافت کا اہم حصہ رہی ہیں۔ تفنن طبع کے لیے کہی جانے والی پہیلیاں ہمیں تفکر وتفہم کی طرف لے جاتی ہیں۔ پہیلیاں زبانی ادب کی روایتی شکل میں نسل در نسل تہذیبی وثقافتی اقدار اور عقائد کی عکاسی کرتی رہی ہیں۔ اسی طرح سے پہیلیوں کی لسانی اہمیت بھی مسلمہ ہے۔ پہیلی لفظی کھیل کی ایک قسم ہے جس میں استعاراتی زبان، علامتی انداز یا ذومعنی الفاظ (پن) کے استعمال سے ایسے جملے وضع کیے جاتے ہیں جن میں ہم قافیہ وہم وزن الفاظ آہنگ پیدا کرتے ہیں۔ جس کے سبب انھیں بہ آسانی یاد بھی کیا جاسکتا ہے۔

پہیلی ایسا بیانیہ ہوتی ہے جس میں ایک سوال معمے کی شکل میں ہوتا ہے۔ سننے یا پڑھنے والے کے لیے اس کا حل تلاش کرنا ایک چیلنج ہوتا ہے۔ پہیلی تجسس کی کیفیت پیدا کرتی ہے ۔ پہیلیوں کے حل کرنے کی عادت سے معلومات کا تجزیہ کرنے، منطقی طور پر سوچنے اور مسائل کے تخلیقی حل تلاش کرنے کے لیے تنقیدی سوچ کی نشوونما ہوتی ہے۔ مختلف طریقوں اور حکمت عملیوں پر غور وفکر کرنے کی صلاحیت کو جلا ملتی ہے، تخیل کو پرواز ملتی ہے ، پہیلیاں افکار کے ارتکاز اور یادداشت کو بہتر بنانے میں معاون ہوتی ہیں۔

پہیلیاں زبانی لوک ادب کا حصہ تھیں اور سینہ بہ سینہ منتقل ہوتی تھیں۔ امیر خسرو کا یہ بہت بڑا کارنامہ ہے کہ انھوں نے پہیلیوں کو تحریری شکل میں پیش کیا۔ (محققین میں اختلاف ہے کہ یہ پہیلیاں امیر خسرو کی ہیں یا ان سے منسوب کی گئی ہیں) یہ ان کی خصوصیت و انفرادیت ہے کہ انھوں نے پہیلی کو ایک صنف کا درجہ عطا کیا اور بہت سی خوبصورت اور دلچسپ پہیلیاں تخلیق کیں۔ جن کا مطالعہ پہلے تو قاری کو متجسس کرتا ہے اور جب وہ منطقی استدلال کے ساتھ پہیلی کا حل تلاش کرلیتا ہے تو حظ وطمانیت سے مسرور ہوجاتا ہے۔

پہیلیوں کا تعلق زبان کے تخلیقی استعمال سے ہے۔ اس مضمون میں ہم دیکھیں گے کہ امیر خسرو کی پہیلیاں کیسے طلبا اور زبان کے نئے سیکھنے والوں کے لیے نئے نئے الفاظ ان کے اندر پوشیدہ معنوی جہتوں کو سمجھنے اور سیکھنے کے مواقع فراہم کرتی ہیں۔ اس طرح ان کے ذخیرۂ الفاظ میں اضافہ ہوتا ہے اور اسے تقویت حاصل ہوتی ہے۔

1. لفظی کھیل (ورڈ پلے)

پہیلیاں لفظوں کا کھیل ہیں۔ اس لفظی کھیل سے بچوں کو سکھایا جاسکتا ہے کہ الفاظ کے کیسے ایک سے زیادہ اور مختلف معنی مراد لیے جاسکتے ہیں۔ سیاق وسباق کے لحاظ سے کیسے معنی بدلتے ہیں۔ ذومعنی الفاظ والی پہیلیوں کے ذریعے لفظ کی معنوی جہتوں کو تلاش کرنے کے گُر سکھائے جاسکتے ہیں جیسے یہ پہیلی دیکھیں:

کھیت میں اُپجے ہر کوئی کھائے
گھر میں ہووے گھر کھا جائے

اس پہیلی کا جواب 'پھوٹ' ہے۔ کھیت میں اگنے والی چیز پھوٹ (ککڑی کی ایک قسم ہے) ہے جسے ہر کوئی کھاتا ہے۔ پھوٹ کے ایک اور معنی 'نا اتفاقی'، 'تفرقہ' ہے۔ جس سے فتنہ فساد پھیلتا ہے۔ پھوٹ جب گھر میں ہوتی ہے تو گھر کے لوگوں میں اتحاد واتفاق باقی نہیں رہتا وہ آپس میں لڑائی جھگڑا کرتے ہیں جس سے گھر ٹوٹ جاتے ہیں۔ گھر صرف عمارت نہیں ہوتا

> پہیلی ایسا بیانیہ ہوتی ہے جس میں ایک سوال معمے کی شکل میں ہوتا ہے۔ سننے یا پڑھنے والے کے لیے اس کا حل تلاش کرنا ایک چیلنج ہوتا ہے۔ پہیلی تجسس کی کیفیت پیدا کرتی ہے۔ پہیلیوں کے حل کرنے کی عادت سے معلومات کا تجزیہ کرنے، منطقی طور پر سوچنے اور مسائل کے تخلیقی حل تلاش کرنے کے لیے تنقیدی سوچ کی نشوونما ہوتی ہے۔

بلکہ اس میں رہنے والے لوگوں کے آپسی پیار ومحبت، عزت واحترام اور اتحاد واتفاق سے گھر بنتا ہے۔ جب نااتفاقی ہوگی تو گھر بکھر جائے گا۔ بھائیوں میں گھر کا بٹوارہ ہوجائے گا۔ پھوٹ گھر کو کھاجائے گی۔ یہاں 'کھاجانا' محاورہ ہے، کسی چیز کو ختم کردینے یا برباد کردینے کے معنوں میں اس کا استعمال ہوتا ہے۔ جیسے ہم کہتے ہیں فلاں شخص کو بیٹے کا غم کھا گیا۔ اس کے معنی ہیں اس شخص کو بیٹے کی جدائی کے سبب جو دکھ ہوا ہے اس سے وہ بیمار اور ضعیف و لاغر ہوگیا ہے اور اسی غم میں مرگیا۔ گویا اس غم نے اسے ختم کردیا۔

'ذو معنی' لفظ کی ایک پہیلی دیکھیے:

جل کر بنے جل میں رہے
آنکھوں دیکھا خسرو کہے

اس پہیلی کا جواب 'کاجل' ہے۔

اس پہیلی کا کلیدی لفظ جل ہے جو ذو معنی لفظ ہے۔ جل کر بنے، کاجل لکڑی یا کوئلہ کو جلا کر اس کے دھوئیں سے بنایا جاتا ہے۔ خواتین اسے آنکھوں کے بناؤ سنگھار کے لیے استعمال کرتی ہیں۔ لہٰذا جل کر بنے تو حل ہوگیا۔ جل میں رہے کو حل کرنا ہے۔ سائنس کے مطابق آنکھوں میں ہمیشہ پانی رہتا ہے جو آنکھوں کی سطح کو نمی فراہم کرتا ہے۔ یہ نمی آنکھوں کو خشکی اور خارش سے بچاتی ہے۔ آنکھوں میں پانی کی موجودگی آنکھوں کو صاف رکھنے میں مدد کرتی ہے۔ یہ پانی آنکھوں میں جمع ہونے والی گندگی اور ذرات کو صاف کرتا ہے۔ آنکھوں میں پانی کی مقدار مختلف عوامل پر منحصر ہوتی ہے جیسے کہ آنکھوں کی صحت، موسم اور آنکھوں کا استعمال، عام طور پر آنکھوں میں پانی کی مقدار 2.1 ملی لیٹر کے درمیان ہوتی ہے۔ یہ واضح ہوگیا کہ آنکھوں میں پانی رہتا ہے اور پانی کو جل بھی کہتے ہیں۔ اس طرح پہیلی حل ہوگئی کہ وہ کاجل ہے جو جل کر بنتا ہے اور جل میں رہتا ہے۔

2. ہم صوت اور ہم آواز الفاظ کو سمجھانا

بہت سی پہیلیاں ہم صوت (وہ الفاظ جو ایک جیسے لگتے ہیں لیکن مختلف معنی رکھتے ہیں) پر مشتمل ہوتی ہیں۔ اس قسم کی پہیلیوں کو حل کرنے سے طلبا میں اس بات کی گہری سمجھ پیدا ہوگی کہ زبان کیسے کام کرتی ہے۔ کیسے ایک جیسے لکھے جانے والے الفاظ کے معنی مختلف ومنفرد ہوتے ہیں نیز ایک جیسے لکھے جانے والے الفاظ پر الگ الگ طرح سے اعراب لگا کر پڑھا جائے تو ان کا تلفظ اور معنی دونوں بدل جاتے ہیں۔ جیسے شاعری کی صنعت تجنیس میں ہوتا ہے۔

فارسی بولی آئی نہ
ترکی ڈھونڈی پائی نہ
ہندی بولوں آرسی آئے
خسرو کہے کوئی نہ بتائے

اس پہیلی کا جواب آئینہ ہے۔ آئی نہ۔ اس طرح لکھا جائے تو کسی کے نہ آنے کا ذکر ہے جو کہ ایک فعل ہے۔ اس کو ملا کر لکھا جائے تو آئینہ مراد ہوگا۔ وہ شیشہ جس میں عکس نظر آتا ہے۔ آئینہ کو ہندی میں آرسی کہا جاتا ہے۔

اسی نوع کی ایک اور پہیلی دیکھیے:

کھڑا بھی لوٹا پڑا بھی لوٹا
ہے بیٹھا اور کہیں ہے لوٹا
خسرو کہے سمجھ کا ٹوٹا

اس پہیلی کا جواب لوٹا ہے۔ اردو میں لفظ لوٹا کے چار مختلف معنی ہیں۔ پہلا۔ لوٹا (اسم) ٹوٹی کا برتن، آفتابہ کو کہتے ہیں جس میں پانی بھر کر استعمال کرتے ہیں۔ دوسرا۔ لوٹا (فعل) کے معنی ہیں زمین پر لیٹنا یا تڑپنا، لڑھکنا وغیرہ اور تیسرے اور چوتھے میں اسے تلفظ کے فرق کے ساتھ اسے لُوٹا (فعل) پڑھیں گے تو اس کے معنی ہیں دوسرے کا مال زبردستی چھین لینا، کسی کے مال پر قبضہ کرنے کے ہیں، ایک اور طرح سے پڑھا جائے تو لَوٹا (فعل) واپس آنے کے معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔

مترادف الفاظ

بہت سی پہیلیاں مترادفات یعنی ایک ہی معنی کو پیش کرنے والے مختلف الفاظ یا ملتے جلتے معنی والے الفاظ پر مشتمل ہوتی ہیں۔ اس سے طلبا یہ سیکھیں گے کہ کس طرح مختلف الفاظ کو ایک دوسرے کے بدلے یا نئے سیاق وسباق میں استعمال کیا جاسکتا ہے۔ جیسے ذیل کی پہیلی میں رین، اور رات جیسے الفاظ استعمال ہوئے ہیں دونوں کے معنی شب کے ہی ہیں یعنی ایک ہی ہیں۔

رین دنا وہ آوے جاوے
یہی جنم سے کام بناوے
بوجھ فکر سے اتنی بات
کس پر بندھے دن اور رات

اس پہیلی کا جواب سورج ہے، اس کے مترادف الفاظ ہیں آفتاب، شمس، خورشید وغیرہ۔ مترادفات لکھنے

والے میں زبان کی ایسی قابلیت پیدا کرتے ہیں کہ وہ ایک پھول کے مضمون کو سو ڈھنگ سے باندھ سکتا ہے۔ نثر ہو یا نظم ایک ہی بات کو مختلف انداز میں بیان کرنے کے ہنر سے طلبا میں ادبی تخلیقیت کو جلا ملے گی۔

استعارہ اور علامت کا استعمال

زبان میں استعاروں اور علامتوں کی بھی بڑی اہمیت ہوتی ہے۔ استعارے میں لفظ لغوی معنوں کے بجائے مجازی اور مُراد لیے گئے معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔ جیسے اس پہیلی میں تھال اور موتی استعارے ہیں۔ تھال آسمان کے لیے اور موتی تاروں کے لیے استعمال ہوئے ہیں۔

ایک تھال موتیوں سے بھرا
سب کے سر پر اوندھا دھرا
چاروں اور وہ تھال پھرے
موتی اس سے ایک نہ گرے

قافیہ/ ہم وزن الفاظ

قافیہ ایسے الفاظ کو کہتے ہیں جن میں ایک طرح کی صوتی مماثلت ہوتی ہے۔ الفاظ ہم وزن ہونے کی وجہ سے آہنگ پیدا ہوتا ہے۔ جیسے اس پہیلی میں رنگ اور سنگ قافیے ہیں۔

ایک ناری کے دو بالک دونوں ایک ہی رنگ
ایک پھرے ایک ٹھارا رہے پھر بھی دونوں سنگ

اس پہیلی کا جواب چکی ہے۔ چکی کے دو پاٹ ہوتے ہیں دونوں ایک ہی جیسے ہوتے ہیں۔ اناج پیستے وقت اوپر کا پاٹ لکڑی کے کھوٹے کے ذریعے گھمایا جاتا ہے۔ اس طرح اوپر والا پاٹ گھومتا ہے نیچے والا ٹھہرا رہتا ہے۔ لیکن رہتے دونوں ساتھ ہی ہیں۔

زبان میں استعاروں اور علامتوں کی بھی بڑی اہمیت ہوتی ہے۔ استعارے میں لفظ لغوی معنوں کے بجائے مجازی اور مُراد لیے گئے معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔ جیسے اس پہیلی میں تھال اور موتی استعارے ہیں۔ تھال آسمان کے لیے اور موتی تاروں کے لیے استعمال ہوئے ہیں۔

کچھ اور پہیلیوں سے مثالیں دیکھیے:

بالا تھا جب سب کو بھایا
بڑھا ہوا کچھ کام نہ آیا
خسرو کہہ دیا اس کا ناؤں
ارتھ کرو نہیں چھوڑو گاؤں
(دیا)

اس پہیلی میں بھایا، آیا اور ناؤں اور گاؤں قوافی ہیں۔

اک ناری کے سر پر نار
پی کے لگن میں کھڑی لاچار
سیس دُھنے اور چلے نہ زور
رو رو کروہ کرے ہے بھور
(شمع)

درج بالا پہیلی میں نار اور لاچار، زور اور بھور قوافی ہیں۔ اس پہیلی میں امیر خسرو نے لفظوں کے ذریعے بے حد خوبصورت پیکر تراشے ہیں۔ شمع کی مناسبت سے اس کے لیے ناری (عورت) کو استعارے کے طور پر استعمال کیا ہے۔ شمع کے سر پر جو آگ ہے اس کی اصل وجہ بیان نہ کر کے حسن تعلیل کے ذریعے یہ کہتے ہیں کہ وہ اپنے محبوب کے ہجر میں جل رہی ہے۔ اور شمع جلتی ہے تو موم پگھلتا ہے جسے اس کے آنسو قرار دے رہے ہیں۔ شمع چوں کہ رات کو جلائی جاتی ہے اور صبح تک جلتی رہتی ہے تو اس امر کو رات کو رو رو کر صبح کر دینا سے تعبیر کیا ہے گویا امیر خسرو نے غزل کی عشقیہ رسومیات کو پیش نظر رکھ کر یہ پہیلی کہی ہے۔

ذیل میں امیر خسرو کی کچھ اور پہیلیاں پیش کی جا رہی ہیں جن میں زبان کے ذریعے محاکات نگاری کے ہنر دکھائے گئے ہیں۔ اس پہیلی میں متحرک تصویریں زبان میں موجود مصورانہ استعداد سے روشناس کراتی ہیں۔

اپنے سے اک پنچھی آئے
ٹک دِکھے اور پھر چھپ جائے
بوجھ کے اٹھیو قسم ہے تم پر
آگ بنا اُجیارا دُم پر
(جگنو)

دھوپوں سے وہ پیدا ہووے چھاؤں دیکھ مُرجھاوے
(پسینہ)
اے ری سکھی میں تجھ سے پوچھوں ہوا لگے مر جاوے

ان پہیلیوں کے ذریعے طلبا کو سکھایا جاسکتا ہے کہ الفاظ کے ذریعے کسی بھی منظر کی تصویر کشی کیسے کی جاتی ہے۔ مناظر کو قارئین کے سامنے کیسے ہو بہو پیش کیا جاسکتا ہے۔

غرض کہ اردو زبان کی تدریس میں امیر خسرو کی پہیلیوں کو ایک تعلیمی ٹول کے طور پر استعمال کیا جاسکتا ہے۔ یہ نہ صرف تفریحی ہیں بلکہ زبان سیکھنے اور مسائل حل کرنے کی لیاقت وصلاحیت کو پروان چڑھانے میں مدد کرسکتی ہیں۔ پہیلیاں زبان سیکھنے کے مرحلے کو پُرلطف بناتی ہیں جو طلبا میں سیکھنے کے جذبے اور دلچسپی کو برقرار رکھتی ہیں۔ نیز تخلیقی اور تخیلاتی انداز میں زبان کا استعمال زبان میں مہارت کو فروغ دینے میں اہم رول ادا کرتا ہے۔ نیز پہیلی میں دیے گئے قرینوں سے جواب تک پہنچنے کے لیے طلبا میں غور و خوض کرنے، لفظ و معنی کے رشتے کو سمجھنے، اور کڑی سے کڑی جوڑ کر حل تلاش کرنے کی صلاحیت پیدا ہوگی۔ اس طرح کی پہیلیوں کو حل کرنے سے منطقی اور استدلالی طرز فکر کو فروغ ملے گا۔

■

Dr. Bi Bi Raza Khatoon
Deptt. of Urdu
MANUU
Hyderabad

نظم جدید میں عورت کا تصور

سائرہ خاتون

عجیب حقیقت ہے کہ ایک طرف عورت کو مرد کی بہ نسبت کمزور، کم عقل، بزدل و جلد باز، حقیر و ذلیل تصور کیا جاتا ہے، وہیں دوسری طرف تصویر کائنات کے سارے رنگ وجود زن کے رہین منت سمجھے جاتے ہیں جبکہ حقیقت یہی ہے کہ مرد عورت کے بغیر ادھورا، معاشرہ عورت کے بغیر نامکمل اور کائنات عورت کے بغیر بے رنگ ہے۔ نسل انسانی کا تسلسل اور بقا عورت کے دم سے ہے۔ حوا کی تخلیق بنی آدم کی افزائش اور رنگینی کونین کا باعث بنی۔ مردوں نے بلاشبہ عورت کے حسن و جمال کے قصیدے لکھے، لیکن مرد اساس معاشرے نے اپنی طاقت کے زعم میں ظلم وجور کا بازار گرم کیا۔ اس میں عورت کا حصہ بہت معمولی ہے اور وہ بھی مرد کی ترغیب وتحریص اور جبر واشتعال کے باعث۔ جب مرد کی شخصیت کو اس کی خامیوں کے سبب گہن لگنے لگا تو اس نے عورت کو اپنا حریف جانا اور اپنی توانائیاں عورت کو کمتر ثابت کرنے میں صرف کردیں، حالانکہ عورت' خالق کائنات کی خوبصورت تخلیق ہے۔ اس عالم رنگ و بو کی ساری رونق اسی کے دم سے ہے۔ باوجود اس کے مختلف علاقوں اور اقوام وقبائل کی قدیم معاشرت کی جو تصویر سامنے آتی ہے، اس میں عورت کی حالت ناگفتہ بہ تھی اور آج بھی ہے۔

جب دنیا میں مختلف مذاہب کا ظہور ہوا تو عورت نے بجاطور پر ان سے اچھی امیدیں وابستہ کی ہوں گی، عین ممکن ہے ان مذاہب نے عورت کی مظلومیت کے خلاف آواز بھی اٹھائی ہو مگر یہ آواز بہت جلد دب گئی۔ یہی وجہ ہے کہ عورت مذہبی عالموں اور سماجی مفکرین کے درمیان موضوع بحث بنی رہی۔ ادب عالم کا ایک بڑا حصہ بھی عورت سے متعلق ہے۔ اردو شعروادب میں بھی عورت اہم موضوع کے طور پر موجود ہے۔ ہر علاقے اور ہر دور کے اردو شعرا نے اپنی شاعری کے چراغ عورت کی ذات سے روشن کیے۔ دکن، شمالی ہند، دبستان دہلی اور دبستانِ لکھنؤ کے بیشتر شعرا نے عورت کے ہر روپ ماں، بیٹی، بہن، بیوی اور طوائف کو شاعری میں پیش کیا۔ انھوں نے عورتوں کے تقدس اور عظمت کے ساتھ ساتھ اس کی تعلیم وتربیت، آزادی، بے راہ روی اور حجاب کے مسائل بھی اجاگر کیے۔

1857 تا 1947 کا عہد مشرقی اور مغربی تہذیبوں کی کشاکش اور تصادم سے دوچار تھا کیونکہ ایک طبقہ جدید نظریات کا حامی اور ہندوستان میں تبدیلیوں کی فضاؤں کو قبول کر رہا تھا۔ دوسرا طبقہ ماضی پرستی کے حصار میں مقید تھا اور اپنی روایات چھوڑنے پر کسی طرح تیار نہ تھا۔

1857 تا 1947 کا عہد مشرقی اور مغربی تہذیبوں کی کشاکش اور تصادم سے دوچار تھا کیونکہ ایک طبقہ جدید نظریات کا حامی اور ہندوستان میں تبدیلیوں کی فضاؤں کو قبول کر رہا تھا۔ دوسرا طبقہ ماضی پرستی کے حصار میں مقید تھا اور اپنی روایات چھوڑنے پر کسی طرح تیار نہ تھا۔ برصغیر کے نئے حکمرانوں کی آمد کے ساتھ ہندوستانی معاشرے کے اندر تحرک اور ٹوٹ پھوٹ کا عمل شروع ہو گیا۔ صدیوں کی روایات نے اپنی بساط لپیٹنا شروع کر دی۔ نئی روایات اور نئی اقدار معاشرتی زندگی کا حصہ بننے لگیں۔ مغربی تہذیب اپنے ساتھ عورت کی آزادی اور عورت کے لیے تعلیم کا پیغام لے کر آئی۔ ہندوستانی معاشرے کے لیے یہ نئی صورت حال قبول کرنا آسان نہ تھا۔ یہی وجہ ہے کہ قوم عجیب کشمکش کا شکار تھی۔ کسی نے اسے عورت کے لیے باعث رحمت گردانا اور کسی نے اسے عورت کی بے راہ روی کا منشور قرار دیا۔ عورت جو پہلے ہی سے بہت سارے مسائل و مصائب کا شکار تھی، معاشرتی انحطاط کے اس عہد میں افراط وتفریط کا شکار ہوگئی۔ وہ ایک طرف سخت معاشرتی جکڑ بندیوں کا شکار ہوئی تو دوسری طرف محض کھیل تماشے کی شے بن کر رہ گئی۔ 1857 کی ناکامی کے بعد یہ صورت حال مزید دگرگوں ہو گئی، خاندان بکھر گئے، معاشرہ ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہو گیا اور نوبت یہاں تک پہنچی:

''ناز ونعم میں پلے ہوئے لوگ نان شبینہ کے محتاج تھے۔ شہزادے در در کی ٹھوکریں کھا رہے تھے اور بعضے بھیک مانگ کر پیٹ بھرنے پر مجبور تھے۔ بدترین اقتصادی بدحالی، رسوائی،

ذلت، فاقہ کشی، خوف اور دہشت لوگوں کا مقدر بن چکا تھا۔''[1]

انگریزوں نے ہندوستان کے اقتدار پر مکمل قبضہ کرنے کے بعد اپنے تسلط کو مستحکم کرنے کے لیے دستوری اور تعلیمی اصلاحات کا سلسلہ شروع کیا اور مفتوح قوم پر غلبہ پانے کے لیے اپنی تہذیب وتمدن اور علوم وفنون کا خوب پرچار کیا۔ برصغیر کی تاریخ میں 1857 کا سال عظیم مغلیہ سلطنت کے خاتمے کی دردناک کہانی ہی پیش نہیں کرتا، بلکہ یہ ایک تہذیب کے زوال اور ایک نئی تہذیب کے تسلط کا اشاریہ بھی ہے۔ یہ زمانہ معاشرتی قدروں کی تبدیلی، فرد کے اندر کی کشاکش اور دو تہذیبوں کے تصادم سے عبارت ہے۔ جب کوئی قوم پستیوں میں گھر جاتی ہے یا کوئی معاشرہ زوال پذیر ہو جاتا ہے تو قدرت اصلاح احوال کی صورت بھی پیدا کر دیتی ہے۔ اس صورت حال میں درد دل رکھنے والے بعض افراد نے حالات کی نزاکت کو بھانپتے ہوئے قوم کو شکست خوردگی کے اثرات سے نکالنے اور ان کی اصلاح کا بیڑا اٹھایا۔ بعضوں کا خیال تھا کہ اب قوم میں دم خم نہیں ہے، اس لیے ٹکراؤ اور مقاومت سے زیادہ مصالحت اور تقدیر کی ضرورت ہے۔ سرسید بھی اسی خیال کے موید تھے۔ چند ایسے افراد بھی تھے کہ اگر چہ اس دور ابتلا میں کوئی بڑا کردار ادا نہیں کر سکتے تھے لیکن وہ مصالحت کے لیے بھی کسی طرح تیار نہ تھے، اکبر انھی کے نمائندہ تھے۔ بعض نے درمیانی راستہ اختیار کیا جیسے شبلی اور حالی۔

چنانچہ انھی متضاد نظریات کی تشہیر کے لیے ہر دو نظریے کے حامی افراد نے کوششیں کیں، سرسید نے اپنے رسالے تہذیب الاخلاق کے ذریعے تو اکبر نے اپنی شاعری کے ذریعے اصلاحی امور انجام دیے۔ نثر اور شاعری میں بھی کہیں تعلیم نسواں کے خلاف تو کہیں اس کی حمایت میں آوازیں بلند کی گئی ہیں۔ تعلیم نسواں کی حمایت میں شاعری کرنے والوں میں حالی، محمد حسین آزاد، اسمٰعیل میرٹھی، شبلی نعمانی اور اکبر الہ آبادی کے نام قابل ذکر ہیں۔ بظاہر یوں لگتا ہے جیسے حالی، آزاد اور اسمٰعیل تو ایک مکتبہ فکر کے علم بردار تھے نیز شبلی اور اکبر دوسرے رخ کے عکاس، لیکن حقیقت یہ ہے کہ مقصد دونوں گروہوں کا ایک ہی تھا یعنی قوم کی اصلاح۔ حالی نے قوم کے ایک ایک دکھ کو محسوس کیا اور اسے دلسوزی کے ساتھ اپنی شاعری میں پیش کیا۔ انھوں نے محسوس کیا کہ ہندوستان میں عورت کی حیثیت ایک کھلونے سے زیادہ نہیں تھی، وہ مرد کی ہوسناکی کا شکار اور اس کے تعیش کا ذریعہ تھی۔ اس کی فریاد سننے والا کوئی نہیں تھا۔ حالی اس کی مظلومیت اور بے کسی سے متاثر ہوئے، اس کے جائز حقوق کی پامالی کے خلاف آواز بلند کی، اس کی بے کسی اور بے بسی پر خون کے آنسو بہائے، اردو شاعری میں جس نے سب سے پہلے صنف نازک کی مظلومیت کو اپنے سوز جگر کے ساتھ پیش کیا وہ حالی ہیں۔ حالی کی کوششوں سے ہندوستان میں عورت کے تئیں ایک نرم گوشہ پیدا ہوا۔ چنانچہ عورت ایک کھلونا اور ایک محبوبہ کے روپ سے نکل کر پہلی بار ماں، بہن، بیوی اور بیٹی کی مقدس اور معزز حیثیت میں نمودار ہوئی۔ ان کی نظموں

حالی کی اس آواز نے ایسا ارتعاش پیدا کیا کہ ہندستان کا سنجیدہ طبقہ عورت کے تئیں مرد کے فکر وعمل پر غور کرنے پر مجبور ہو گیا۔ یہاں تک کہ اقبال جیسا مفکر بھی یہ اعتراف کیے بغیر نہ رہ سکا کہ مجھے بھی عورتوں کی مظلومیت کا رنج ہے، لیکن یہ ایک ایسی گرہ ہے جسے کھولا نہیں جاسکتا۔

چپ کی داد، مناجات بیوہ اور بیٹیوں کی نسبت میں عورتوں کی سماجی مظلومیت کو عیاں کیا گیا اور لوگوں کو ان کے تئیں غور وفکر کرنے پر مجبور کیا گیا۔ صالحہ عابد حسین لکھتی ہیں:

''واقعہ یہ ہے کہ اس زمانے میں ہندوستانی عورت کے حقوق کی حفاظت کی سب سے پہلی آواز جس شخص نے بلند کی اور اس کی سماجی مظلومی کا سب سے پہلے اعتراف کیا اور اس کی حمایت کا علم اٹھایا، وہ حالی ہی تھے۔''[2]

حالی نے عورت کو ماں، بہن اور بیٹی کی شکل میں دیکھا اور پیش کیا۔ ان کی نظم ''چپ کی داد'' اس کا بین ثبوت ہے، جو 1906 میں لکھی گئی اور ترتیب بند کی شکل میں لکھی گئی ہے۔ اس میں حالی نے ہندستانی عورت کی خصوصیات بیان کرتے ہوئے مرد کی زندگی میں ان کی اہمیت کو بیان کیا ہے۔ عورت کی صفات کی تعریف کرتے ہوئے حالی نے اس کی بے نفسی، ایثار اور قربانیوں کا بھی اعتراف کیا ہے۔ وہ عورت کی فطری محبت و شفقت، وفاشعاری، خلوص، شرم وحیا اور خدمات کو انسانیت کے بلند مقام پر تصور کرتے ہیں۔ زیر نظر نظم کے بعض حصے ملاحظہ کیجیے:

اے ماؤ، بہنو، بیٹیو دنیا کی زینت تم سے ہے
ملکوں کی بستی ہو تمھی قوموں کی عزت تم سے ہے
تم گھر کی ہو شہزادیاں شہروں کی ہو آبادیاں
غمگیں دلوں کی شادیاں دکھ سکھ میں راحت تم سے ہے
نیکی کی تم تصویر ہو عفت کی تم تدبیر ہو
ہو دین کی تم پاسباں ایماں سلامت تم سے ہے

''چپ کی داد'' کے سلسلے میں ڈاکٹر افتخار احمد صدیقی لکھتے ہیں:

''چپ کی داد'' میں حالی نے نہ صرف عورتوں کے مظلوم طبقے کی وکالت کی ہے، بلکہ خاتون مشرق کے کردار کی ایک مثالی تصویر بھی کھینچ دی ہے۔''[3]

حالی کی اس آواز نے ایسا ارتعاش پیدا کیا کہ ہندستان کا سنجیدہ طبقہ عورت کے تئیں مرد کے فکر وعمل پر غور کرنے پر مجبور ہو گیا۔ یہاں تک کہ اقبال جیسا مفکر بھی یہ اعتراف کیے بغیر نہ رہ سکا کہ مجھے بھی عورتوں کی مظلومیت کا رنج ہے، لیکن یہ ایک ایسی گرہ ہے جسے کھولا نہیں جاسکتا۔ وہ لکھتے ہیں:

میں بھی مظلومی نسواں سے ہوں غم ناک بہت
نہیں ممکن مگر اس عقدۂ مشکل کی کشود

حالی نے ہندوستان میں بیوہ کے خلاف ہونے والی مروجہ رسومات وتوہمات کے خلاف بھی احتجاجی آواز بلند کی اور اس کی حمایت میں ایک نظم ''مناجات بیوہ''، تخلیق کی، جس کے بارے میں شجاعت علی سندیلوی لکھتے ہیں:

''یہ مناجات نہیں ہے بلکہ بیوہ کے قلب وجگر کے ٹکڑے ہیں، جو الفاظ میں ظاہر ہوئے ہیں۔ کم سن بیوہ کی حالت زار جس سوز وگداز کے ساتھ حالی نے پیش کی ہے، اس کو سن کر سخت سے سخت دل بھی موم ہو جاتا ہے کیوں نہ ہو ہندوستانی سماج میں بیوہ کی زندگی موت سے بدتر ہو جاتی ہے۔ اپنے اور پرائے سب اس کو ٹھکراتے ہیں۔ سب اس کو منحوس اور بدنصیب قرار دیتے ہیں۔

لوگ اس کے سایے تک سے بچتے ہیں۔‘‘[4]

اس نظم میں حالی نے بیوہ کے درد کو اس کی زبان سے اس پُر درد انداز میں بیان کیا ہے کہ پتھر کا دل بھی پگھل جاتا ہے۔ حالی نے مرد ہوتے ہوئے بیوہ عورتوں کے جذبات واحساسات کو جس دل گرفتگی اور دلسوزی کے ساتھ پیش کیا، وہ صرف انھی کا حصہ ہے۔ کوئی دردمند دل اور حساس طبع شخص ہی کسی کم سن بیوہ کی زندگی کے سوز وساز کو پورے سوز وساز کے ساتھ رقم کرسکتا ہے۔ چند اشعار دیکھیے:

دن یہ جوانی کے کٹے ایسے
باغ میں پنچھی قید ہو جیسے
رہ گیا دے کر چاند دکھائی
چاند ہوا پر عید نہ آئی
رُت بدلی پر ہوئی نہ برکھا
بادل گرجا اور نہ برسا
پھل کی خاطر برچھی کھائی
پھل نہ ملا اور جان گنوائی

حالی کی اسی روایت کو آگے بڑھاتے ہوئے جوش نے بھی اپنی نظم ’’سہاگن بیوہ‘‘ میں بیوہ کے درد کو اس طرح بیان کیا ہے:

پوچھیے اس سے کہ دنیا کیا تھی اورکیا ہوگئی
جس نے گھونگھٹ ابھی الٹا تھا کہ بیوہ ہوگئی
پھنک گئیں میری بہاریں جل گیا میرا سنگار
تیری بند آنکھیں ہیں میری زیب وزینت کا مزار
گھر مرے ہم جولیاں، مل جل کے گانے آئی تھیں
مالنیں، پھولوں کا گہنا کل پہنانے آئی تھیں
آج قرباں گاہ عبرت پر چڑھانے کے لیے
موت آئی ہے مرا زیور بڑھانے کے لیے
زندگی! جا دور ہو دنیا ہے آنکھوں میں اجاڑ
موت! جلدی کر کہ ٹوٹا ہے رنڈاپے کا پہاڑ

جوش کی نظم میں دکھ ودرد اور سوز وساز کی جو لے ہے وہ دلوں کو زیادہ جھنجھوڑ کر رکھ دیتی ہے۔ حالی اور جوش کی ان کوششوں کا یہ نتیجہ نکلا کہ بیوہ کے عقد نکاح کے حوالے سے لوگوں کے رویوں میں تبدیلیاں آنی شروع ہوئیں اور بیوہ کے ستی ہونے کی مروجہ رسم کا خاتمہ ہونے لگا۔ بیوہ کے عقد نکاح کے سلسلے میں عرش ملسیانی کی نظم ’’سہاگن بیوہ‘‘ اسی سلسلے کی ایک عمدہ نظم ہے۔ وہ اپنی نظم ’’خاتون مشرق‘‘ میں کہتے ہیں کہ اعلیٰ تعلیم کی چاٹ سے اطفال کی جبینیں عورت کے لبوں کی گرمی کے لیے ترستی رہ جاتی ہیں۔ اس علم کے باعث شوہر کے حقوق پامال ہوجاتے ہیں۔ یہ علم حسن نسواں کو ’جا گیر عام‘ بنادیتا ہے لہٰذا ایسا علم جہل پرور ہے اور اسے دور سے ہی سلام۔

اقبال کو عورت کے جدید تعلیم کے حصول سے خدشہ یہ تھا کہ اس سے وہ اپنے حقیقی جوہر کھو بیٹھے گی اور اس میں عورت پن باقی نہیں رہے گا۔ اس لیے وہ کہتے ہیں کہ اگر عورت کا مدرسہ دین کی تعلیم سے بے تعلق رہے تو وہ عورت کو اس کے حقیقی فرائض سے بیگانہ بنا

یہ درست ہے کہ اگر عورت کے وجود میں تخلیق کی لذت نہ ہوتی تو دنیا کا سلسلہ قائم نہ رہ سکتا، لیکن یہ کہنا کہ قدرت نے عورت کو پیدا ہی اس غرض سے کیا ہے اور زندگی میں صرف یہی اس کا فریضہ ہے، غلط ہے۔ حالی اور اقبال کی شاعری میں عورت کو خاص مقام حاصل ہے۔

دے گا۔ اقبال کے نزدیک عورت کے حقیقی فرائض ’امومت‘ ہیں اور اگر عورت میں یہ جذبہ فنا ہوجائے تو انسان کے لیے ایسی تہذیب کا ثمر موت ہے۔ ’’عورت اور تعلیم‘‘ کے عنوان سے اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے وہ کہتے ہیں:

تہذیب فرنگی ہے اگر مرگ امومت
ہے حضرت انساں کے لیے اس کا ثمر موت

در اصل اقبال مغرب کی بعض خواتین کے پروپیگنڈے کا شکار ہوگئے تھے، جنھوں نے یہ نعرہ لگایا تھا کہ بچے کی پیدائش پر عورت کا اختیار ہونا چاہیے، کیوں کہ مرد ’’مامتا‘‘ کے جذبے کو اپنے مقاصد کے لیے استعمال کررہے ہیں اور خواتین کو اپنا مطیع بنا رہے ہیں۔ حالانکہ عورت نے تحفظ نسلی کے لیے ہمیشہ اپنا فرض ادا کیا ہے۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو آج نسل آدم معدوم ہو چکی ہوتی۔ جب کوئی مذہب اور اس کے ماننے والے عالم اور پروہت نہیں ہوتے تھے تب بھی بچے پیدا ہوتے تھے۔ اقبال عورت کی زندگی کا مقصد ہی امومت کو قرار دیتے ہیں اور عورت کی کل کائنات اسی لذت تخلیق سے محفوظ ہونا سمجھتے ہیں۔ ’’عورت‘‘ کے عنوان کے تحت وہ لکھتے ہیں:

راز ہے اس کے تپ غم کا یہی نکتۂ شوق
آتشیں، لذت تخلیق سے ہے اس کا وجود
کھلتے جاتے ہیں اس آگ سے اسرار حیات
گرم اسی آگ سے ہے معرکہ بود و نبود

یہ درست ہے کہ اگر عورت کے وجود میں تخلیق کی لذت نہ ہوتی تو دنیا کا سلسلہ قائم نہ رہ سکتا، لیکن یہ کہنا کہ قدرت نے عورت کو پیدا ہی اس غرض سے کیا ہے اور زندگی میں صرف یہی اس کا فریضہ ہے، غلط ہے۔ حالی اور اقبال کی شاعری میں عورت کو خاص مقام حاصل ہے۔ ان کے کلام میں عورت کو ادب واحترام اور عزت واہمیت کے ساتھ پیش کیا گیا ہے۔ اقبال نے جس طرح اپنی شاعری میں ’وجود زن‘ کے تصور کو پیش کیا، اس سے ان کی فکر اور عورت کی ان کے نزدیک اہمیت کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے۔ انھوں نے محسوس کیا کہ دنیا کے شاعروں خصوصاً ہندوستانی شعرا نے عورت کی ناز وادا، حسن وجمال اور عشوہ وناز وادا کو ہر زاویے اور ہر نوعیت سے تلذذ کے ساتھ پیش کیا ہے، یہی وجہ ہے کہ وہ کہہ اٹھے:

آہ بیچاروں کے اعصاب پہ عورت ہے سوار

گویا اقبال کو ایسے تمام فنکاروں سے شکایت تھی، جو عورت کے نام کو غلط استعمال کرکے ادب کی پاکیزگی اور اس کی روح کو پامال کررہے تھے۔ عورت کے تقدس کے سلسلے میں اقبال نے فاطمہ بنت عبداللہ اور والدہ مرحومہ کی یاد میں جیسی نظمیں تخلیق کیں۔ اس کے علاوہ عورت کے موضوع کے تحت تین رباعیاں بھی لکھیں۔ ’ضرب کلیم‘ میں عورت کے عنوان سے نو نظموں پر مشتمل ایک پورا باب موجود ہے۔ ’ارمغان حجاز ‘(فارسی) میں دختران ملت کے عنوان سے آٹھ رباعیاں اور’رموز بیخودی‘ میں تین عنوانات عورت کے متعلق ہیں۔ ’مثنوی پس چہ باید کرد، کی فصل پنجم میں بھی

اس موضوع پر اقبال نے روشنی ڈالی ہے۔ اس کے علاوہ 'جاوید نامہ' میں افلاک کی سیر کے دوران مختلف انداز اور طریقوں سے عورت کا تصور پیش کیا ہے۔ اس قبیل کی ان کی نظموں میں درمعنی اینکہ سیدۃ النساء فاطمۃ الزہراؓ، اسوۂ کاملہ ایست برای نساءِ اسلام اور انجمن خواتینِ اسلام مدراس اہمیت کی حامل ہیں۔ ان نظموں میں انھوں نے عورت کا تصور محض جمالیاتی زاویۂ نگاہ تک محدود رکھا ہے۔ اقبال کو عورت کی عظمت اور اس کی اہمیت کا بخوبی علم تھا، اسی لیے انھوں نے عورت کے ہر روپ کو خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے یہ اشعار کہے۔ وہ کہتے ہیں:

وجود زن سے ہے تصویر کائنات میں رنگ
اسی کے ساز سے ہے زندگی کا سوز دروں

اقبال 'ضرب کلیم' میں عورت کے عنوان کے تحت لکھتے ہیں کہ یہ درست ہے کہ عورت افلاطون کی کتاب 'مکالمات' جیسی کوئی کتاب نہ لکھ سکی، لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ افلاطون کی چنگاری بھی عورت ہی کے شعلے سے پیدا ہوئی تھی۔ گویا اقبال کے نزدیک عورت کا منصب یہ ہے کہ وہ تربیت اولاد کامل توجہ اور تندہی سے کرے یہاں تک کہ اس کی آغوش تربیت میں افلاطون جیسے فلسفی پیدا ہوں:

مکالمات فلاطوں نہ لکھ سکی، لیکن
اسی کے شعلے سے ٹوٹا شرارِ افلاطوں

اقبال کی نظم 'والدہ مرحومہ کی یاد میں' کا شمار امتیازی نظموں میں ہوتا ہے۔ اقبال کے کلام میں چونکہ عورت ماں جیسی عظیم ہستی بن کر ابھری ہے، اس لیے اس ماں میں فاطمۃ الزہرا کی حیات طیبہ کی شبیہ ہے۔ اقبال وجود زن کی عظمت، اولاد کی تربیت میں مضمر سمجھتے ہیں۔ یہ نظم اقبال نے اس وقت لکھی جب وہ لندن میں قیام پذیر تھے اور ان کی والدہ کا انتقال ہوگیا تھا۔ یہ نظم ایک نوحہ بھی ہے اور مرثیہ بھی۔ اس میں ماں جیسی ہستی کے بچھڑ جانے کا ماتم ہے اور دعائے نیم شب کے لیے بلند ہوتے ہوئے ہاتھوں کے چھن جانے کا دکھ بھی۔ اس میں یہ اعتراف بھی ہے کہ یہ میری ماں ہی کی تربیت کا فیض ہے کہ مجھے ستاروں جیسی بلندی نصیب ہوئی۔ اپنی اس نظم میں اقبال کہتے ہیں:

کس کو اب ہوگا وطن میں آہ میرا انتظار
کون میرا خط نہ آنے سے رہے گا بے قرار

شبلی کی فکر میں عورت ماں کے طور پر ایک مربی اور معلم کی حیثیت رکھتی ہے۔ ان کا خیال ہے کہ اگر عورتوں کی تعلیم وتربیت درست ہو تو پوری قوم کا اخلاق وکردار بہتر ہوسکتا ہے۔ ان کی نظر میں عورت قوم کی روح ہے اور اس کی تربیت سے ہی معاشرے کی اصلاح ہوتی ہے۔

خاک مرقد پر تری لے کر یہ فریاد آؤں گا
اب دعائے نیم شب میں کس کو میں یاد آؤں گا
تربیت سے تیری میں انجم کا ہم قسمت ہوا
گھر مرے اجداد کا سرمایہ عزت ہوا
دفتر ہستی میں تھی زریں ورق تیری حیات
تھی سراپا دین و دنیا کا سبق تیری حیات
عمر بھر تیری محبت میری خدمت گر رہی
میں تری خدمت کے قابل جب ہوا تو چل بسی

کلام اقبال میں تعلیم نسواں، تربیت نسواں، تصور نسواں جیسے اہم موضوعات ملتے ہیں، جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان کے نزدیک عورت کا وہ حقیقی مقام ہے جس سے امت اسلامیہ کی تعمیر وترقی کی امیدیں وابستہ رکھی جاسکتی ہیں۔ ان کے نزدیک نہ تو اندھی تقلید کے تحت عورت کو جہالت میں مقید رکھنا ہے اور نہ ہی عورت کو تہذیب کی قربان گاہ پر بھینٹ چڑھانا، بلکہ حقیقی مقصد شرف نسوانیت ہے۔

حالی اور اقبال کے علاوہ دیگر شعرا نے بھی عورت کے وجود کی تحسین وآفریں کی اور اسے تخلیق کائنات کا سب سے خوبصورت اور دلربا شاہکار قرار دیا۔ سیماب اکبر آبادی کی نظم ''خواتین وطن سے خطاب'' کا ایک ٹکڑا دیکھیے:

ہے تمھاری خلقت نازک خدا کے نور سے
تم بنی ہو امتزاج نکہت و کافور سے
بعدِ آدم مصدر اولاد آدم ہو تمھیں
رونقِ افزائے بساط بزم عالم ہو تمھیں

شبلی نعمانی کی شاعری میں عورت کا تصور اُن کے فکری، مذہبی اور تہذیبی شعور کا پیش خیمہ ہے۔ وہ ایک طرف مشرقی روایات اور اسلامی اقدار کے حامی ہیں، تو دوسری طرف مغربی تعلیم وتہذیب سے بھی متاثر ہیں۔ ان کے نزدیک عورت صرف حسن وعشق کا موضوع نہیں بلکہ تمدن، اخلاق اور روحانی اقدار کی محافظ ہے۔ شبلی عورت کو محض جسمانی حسن کے تناظر میں دیکھنے کے قائل نہیں، بلکہ وہ اسے اخلاقی بلندی، وفاداری، حیا اور ایثار کا پرتو سمجھتے ہیں۔ ان کی شاعری میں عورت کا تصور اس پاکیزہ ہستی کے طور پر ابھرتا ہے جو گھر اور معاشرے کی بنیاد کو مضبوطی فراہم کرتی ہے۔ ان کے نزدیک عورت کا اصل اختصاص اس کا اخلاص، ایثار اور خاندانی تقدس ہے، نہ کہ محض ظاہری حسن وجمال۔ شبلی کی عشقیہ شاعری میں عشق مجازی کے ساتھ عشق حقیقی کی جھلک بھی موجود ہے۔ ان کے یہاں عورت عشق الٰہی کی راہ میں ایک علامت یا وسیلہ بن جاتی ہے۔ وہ عورت کے حسن میں جمال الٰہی کی جھلک دیکھتے ہیں۔ مثلاً ان کے بعض اشعار میں عورت کی دلکشی روحانی کشش میں ڈھل جاتی ہے، جو صوفیانہ رنگ رکھتی ہے۔ شبلی مغربی تہذیب کے اثرات کے باوجود عورت کی روایتی مشرقی حیثیت کو بہتر سمجھتے ہیں۔ وہ عورت کی آزادی کے مخالف نہیں، مگر بے پردگی یا اخلاقی انارکی کے مخالف ہیں۔ ان کے نزدیک عورت کی تعلیم ضروری ہے، لیکن ایسی تعلیم جو عفت، کردار اور دینی شعور کو برقرار رکھے۔ شبلی کی فکر میں عورت ماں کے طور پر ایک مربی اور معلم کی حیثیت رکھتی ہے۔ ان کا خیال ہے کہ اگر عورتوں کی تعلیم و تربیت درست ہو تو پوری قوم کا اخلاق وکردار بہتر ہوسکتا ہے۔ ان کی نظر میں عورت قوم کی روح ہے اور اس کی تربیت سے ہی معاشرے کی اصلاح ہوتی ہے۔ ان کے نزدیک عورت کا تصور روحانی، اخلاقی اور تہذیبی توازن کا مظہر ہے۔ وہ عورت کو عزت، احترام اور تقدس کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ ''اہل بیت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی'' اور ''خواتین عرب کا ثبات و استقلال'' اسی قبیل کی نظمیں ہیں، جن میں ازواج

مطہرات اور خواتین اسلام کی بہادری وشجاعت اور ان کے مرتبے کو بیان کیا ہے۔اول الذکر نظم کا یہ بند دیکھیے :

افلاس سے تھا سیدہ پاک کا حال
گھر میں کوئی کنیز نہ کوئی غلام تھا
گھس گھس گئی تھیں ہاتھ کی دونوں ہتھیلیاں
چکی کے پیسنے کا جو دن رات کام تھا
سینہ پہ مشک بھر کے جو لاتی تھی بار بار
گو نور سے بھرا تھا مگر نیل نام تھا
اٹ جاتا تھا لباسِ مبارک غبار سے
جھاڑو کا مشغلہ بھی جو ہر صبح وشام تھا

اکبر کی شاعری کا بڑا حصہ مشرقی تہذیب و معاشرت کو مغربی تہذیب و معاشرت کے تند و تیز ریلوں سے محفوظ رکھنے کے لیے وقف ہوا۔انھوں نے جدید تعلیم کے خلاف اس لیے محاذ کھڑا کیا کہ اس کے ساتھ کفر والحاد بھی چلا آ رہا ہے۔مغربی تہذیب اس لیے ناپسندیدہ ٹھہری کہ اس کی اساس مادیت پر تھی۔ دراصل انھیں اپنے دینی عقائد اور اخلاقی تصورات بہت عزیز تھے۔اکبر کو خوف تھا کہ مغرب اس کی نظریاتی اساس پر حملہ آور ہو رہا ہے، اس لیے وہ ان کے ہر عمل کو شک کی نظر سے دیکھتے تھے۔عورت کی تعلیم اور آزادی کے حوالے سے حالی اور اکبر کی رائے میں اختلاف پایا جاتا ہے۔حالی عورت کو علم و دانش سے محروم رکھنے کے سخت خلاف تھے۔ان کے مطابق عورت کی گود بچے کی پہلی درس گاہ ہے۔اگر وہاں جہالت کا راج ہوگا تو بچہ کس طرح معاشرے کا مصلح فرد بنے گا۔عورت معاشرے کا ایک اہم اور فعال رکن ہے۔تہذیب و معاشرت میں کسی بھی قسم کی تبدیلی کے لیے اس کا کردار اہمیت کا حامل ہے۔

ہندستان کا ایک بڑا طبقہ عورت کی تعلیم کا محض اس قدر حامی تھا کہ یہ شوہر اور اطفال کی خاطر ہو۔اگر یہ تعلیم کسی قومی ضرورت کے پیش نظر ہو تو وہ اس کے خلاف تھا۔اس طبقے کی نمائندگی اکبر الہ آبادی نے کی۔ اکبر کے نزدیک عورت کی تعلیم اس حد تک روا ہے کہ وہ نیک بخت رہے۔اپنے میاں سے ملائم اور شیطان سے سخت ہو اور یہ محض دینی تعلیم سے ممکن ہے۔اگر چہ اکبر عورت کی تعلیم کے مخالف نہ تھے، لیکن وہ جس تعلیم کی بات کرتے ہیں اس کے بنیادی دو مقاصد ہیں:

اول: تعلیم ایسی ہو کہ جس سے عورت مذہبی معاملات کو صحیح طور پر سمجھ سکے۔

دوم: اس کی تعلیم عورت کے لیے گھر داری میں معاون ثابت ہو۔گویا اسے شوہر کی مریدہ، بچوں کی خادمہ، گھر کا حساب کتاب رکھنے، کھانے میں مہارت اور سینا پرونا میں ماہر ہونے کے ساتھ صحت کے بنیادی اصولوں سے آگاہی ہو۔

محمد حسین آزاد بھی عورتوں کے تقدس اور ان کی عظمت کے قائل تھے۔وہ عورت کے ہر روپ کو قدر کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔انھوں نے زمانہ جاہلیت کی رسم دختر کشی کے خلاف ایک نظم 'دختر کشی' تحریر کی جوان کے ڈراما 'دختر کشی 1869' کے ابتدائی حصے میں شامل ہے۔ اس میں انھوں نے بیٹی کی پیدائش کو گوارہ بنانے کی کوشش کی ہے۔بیٹی کے حوالے سے اہل ہند کے ذہن میں یہ بات پختہ ہو چکی تھی کہ اس کی وجہ سے ان کی نام نہاد غیرت کو بٹا لگتا ہے، یہی وجہ ہے کہ بیٹی کی پیدائش پر ہی اس کو قتل کر دیا جاتا تھا اور اسے اپنی غیرت مندی کا نشان سمجھا جاتا۔آزاد کہتے ہیں:

مہاراج جی! آپ نے سچ کہا
یہ ذلت اٹھانی نہیں ہے روا
کسی کو جو بیٹی بہن کوئی دے
تو سسرا بنے یا وہ سالا بنے
یہ بے غیرتی چاہتا جی نہیں
یہ گالی اٹھانی تو اچھی نہیں

وہیں اپنی نظم ''مری پیاری اماں'' میں آزاد نے ایک ماں کی ان تکالیف کا ذکر کیا ہے جو وہ بچے کی پرورش و پرداخت کے لیے برداشت کرتی ہے۔نظم میں جہاں ماں، جو ایک عورت بھی ہے کے لیے اظہار ممنونیت ہے، وہاں یہ اعتراف بھی ہے کہ نسل آدم کی پرورش و پرداخت صرف عورت ہی کر سکتی ہے۔نظم کے یہ بند ملاحظہ کیجیے:

نہ کچھ مجھ میں طاقت تھی جس آن اماں
نہ اچھے برے کی تھی پہچان اماں
تمھیں سب طرح تھیں نگہبان اماں
تمھیں کو تھا ہر دم مرا دھیان اماں
مری پیاری اماں، مری جان اماں

اسی قبیل کی ایک دیگر نظم ''شام کی آمد اور رات کی کیفیت'' میں بھی آزاد نے ماں کی بے لوث محبت کی تعریف کی ہے کہ وہ گھر کے کاموں سے تھک کر چور ہو جاتی ہے لیکن بچے کے لیے اپنا آرام قربان کر دیتی ہے اور سوتے جاگتے اسی کا دھیان رکھتی ہے۔

اردو کے بیشتر شعرا نے عورت کے تقدس، اس کی عصمت وعفت، اس کی عظمت اور اس کے وقار کے کردار کو بیان کیا ہے اور اس کردار میں نکھار پیدا کرنے کے لیے اس کی تعلیم کو ضروری قرار دیا ہے۔سرور جہان آبادی کی نظم ''پیاری بہنو'' میں عورت کے جذبۂ ہمدردی اور اس کی خوبیوں کو اجاگر کر کے اسے تعلیم سے محروم رکھنے کو قوم کی ذلت و خواری سے تعبیر کیا گیا ہے۔ نظم کے چند اشعار دیکھیے :

پیار کیوں کر نہ کریں ہم تمھیں پیاری بہنو!
تم مصیبت میں ہو تم خوار ہماری بہنو!
آڑے آتی ہو برے وقت میں پیاری بہنو!
ہم پہ شفقت ہے فزوں حد سے تمہاری بہنو!
تم سے دیکھی نہیں جاتی ہے ہماری ایذا
دل پہ اک ہول سا ہوجاتا ہے طاری بہنو!
نہیں جس قوم میں تعلیم تمہاری رائج
اس کی تقدیر میں ذلت وخواری بہنو!

اسمٰعیل میرٹھی نے ادب اطفال کے ساتھ ساتھ عورت کے تقدس اور اس کی عظمت کو بھی سراہا ہے۔ان کی نظم ''ماں کی مامتا'' اسی طرح کے احساسات کی حامل ہے:

مامتا ماں کی جانتے ہیں سب
ماں ہے بچے کی پرورش کا سبب
بھوک بچے کو ہے ستاتی جب
ماں سے کرتا ہے رو کے دودھ طلب
لوری دیتی ہے پیار کرتی ہے
جان اس پر نثار کرتی ہے
اس کا 'ہپّا' جدا پکاتی ہے
انگلیوں سے اسے چٹاتی ہے
باتیں کرنا اسے بتاتی ہے
پاؤں چلنا اسے سکھاتی ہے
ماں کو بچہ سے جو محبت ہے
درحقیقت خدا کی رحمت ہے

چونکہ طوائف بھی عورت کا ہی ایک روپ ہے اور طوائف ہر دور اور ہر خطے میں رہی ہے، کہیں انفرادی سطح پر اور کہیں باقاعدہ ایک ادارے کی شکل میں، لیکن وقت کے ساتھ اس کی حیثیت میں تبدیلی آتی رہی ہے۔ طوائف بننے کا عمل بسا اوقات مجبوری یا معاشی تنگ دستی

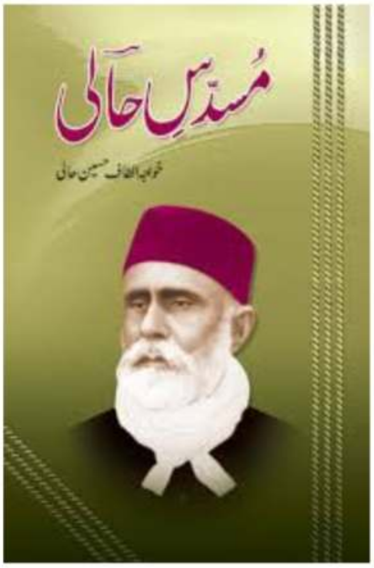

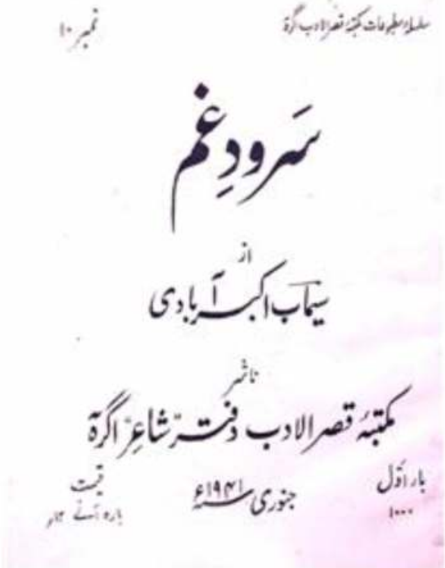

کے سبب عمل پذیر ہوتا ہے، کبھی یوں ہوتا ہے کہ والدین کا سایہ سر سے اٹھ جانے کے بعد کسمپرسی ایک عورت کو ایسے ہاتھوں تک پہنچا دیتی ہے جو اسے پیشہ ور بنا دیتے ہیں۔ چنانچہ ہندستان میں 1857 کے بعد نوابین اور امرا کا وہ طبقہ جو طوائفوں کی سرپرستی کرتا تھا، خود گردش دوراں کی نذر ہوگیا۔ اس لیے طوائف معاشی بدحالی کا شکار ہوگئی۔ چنانچہ اس کی وہ حیثیت ختم ہوگئی جو اسے پہلے حاصل تھی۔ اس سلسلے میں مخمور جالندھری کی نظم ''بیسوا'' طوائف کی حیثیت میں تبدیلی کی غماز ہے:

رنگ و بو کا اک جہاں ہے اس کے کوٹھے کا سنگار
پڑ رہی ہے بجلیوں کی جس پر اک رنگیں پھوار
چھپ کے بیٹھی ہے انھیں پردوں میں عصمت کی اجل
دل نشیں لفظوں میں جیسے ابتذال آگیں غزل
یوں سجی بیٹھی ہے رخساروں پہ رکھ کر انگلیاں
جس طرح بازار میں باسی پھلوں کی اک دکاں
سرخیِ لب سے عیاں عصمت کا خونِ ناب ہے
ہر ادا عریانیوں کا تیز رو سیلاب ہے
بن کے بیٹھی ہے نسائیت کا زیور بیچنے
جسم و لب، یعنی نشاط خلد و کوثر بیچنے

متذکرہ بالا شعرا کے علاوہ سیماب اکبرآبادی کی نظم ''جنت سے چھٹا خط'' بیوہ کے دکھ درد اور اس کے عقد ثانی کے لیے نصیحتوں اور ترغیبوں کو پیش کرتی ہے۔ چکبست کی نظم ''برق اصلاح''، کشمیری پنڈتوں کے فرقے میں پہلی مرتبہ ایک بیوہ لڑکی کی شادی کی نوید سناتی ہے۔ اسی طرح سوتن کے کردار کو بھی شعرا نے پیش کیا، اس طرح ہندوستانی عورت کے دو روپ سامنے آئے۔ شادی میں بیٹیوں کی رضامندی اور بے جوڑ شادی کے خلاف صدا بھی سنائی دی۔ اس حوالے سے اختر شیرانی کی نظم ''نارضامندی کی شادی'' اور مخمور جالندھری کی نظم ''شادی'' میں ازدواجی زندگی کی غیر طمانیت کا نوحہ ہے۔ شعرا نے لڑکیوں کی شادی کو ترقی کا زینہ بنانے اور جہیز کی لعنت کے خلاف بھی نظمیں لکھیں، ''بملا کا جہیز'' (مخمور جالندھری) اس حوالے سے اچھی نظم ہے۔

عورتوں کی تعلیم بھی اس دور کے شعرا کا اہم موضوع رہا ہے۔ اس معاملے میں شعرا اختلاف کا شکار ہیں۔ حالی عورت کو علم و دانش سے محروم رکھنے کے خلاف جب کہ اکبر ایک محدود تعلیم کے حق میں تھے۔ اقبال بھی اکبر کے ہم نوا ہیں، ان کا خیال تھا کہ عورت کی تعلیم قومی ضرورت سے مشروط ہے۔ اکبر کی نظمیں ''تعلیم نسواں، مغربی طرزِ تعلیم اور ہندی لڑکیاں'' اسی نظریے کی تبلیغ کرتی ہیں۔ جو لوگ عورت کی تعلیم کے خلاف تھے، ان کا خیال تھا کہ جدید تعلیم سے جذبۂ امومت سرد پڑ جائے گا۔ اقبال اسی خوف کا شکار ہیں۔ ان کے نزدیک عورت کا کمال یہ نہیں کہ وہ علم و فضل میں ارسطو اور افلاطون بن جائے بلکہ اس کا اصل کمال یہ ہے کہ وہ ارسطو اور افلاطون پیدا کرے۔ جوش کی نظم 'خاتون مشرق' میں بھی اسی رائے کا اعادہ کیا گیا ہے تاہم عورت کی تعلیم کے حق میں بھی شعرا نے نظمیں کہیں، سرور جہان آبادی کی نظم ''پیاری بہنو'' عورت کی تعلیم کو ضرورت قرار دینے کی عمدہ کوشش ہے۔ ماں کے تقدس اور اس سے والہانہ محبت کے اظہار کے سلسلے میں آزاد کی نظم میری پیاری اماں، مولوی اسمٰعیل میرٹھی کی ماں کی مامتا اور اقبال کی نظم والدہ مرحومہ کی یاد میں عمدہ احساسات کی حامل ہیں۔ عورت کی آزدای اور جدید تہذیب کے خلاف ردعمل بھی اردو شعرا کے یہاں دیکھا جا سکتا ہے۔ اکبر کی نظم 'برق کلیسا' اور اقبال کی نظم 'آزادیِ نسواں' میں ردعمل کی تند و تیز لہر صاف نظر آتی ہے تاہم چکبست کی نظم 'پھول مالا' میں مغرب کی تقلید کو برا نہیں کہا گیا، البتہ اندھا دھند تقلید سے اجتناب کرنے کی تاکید ضرور ہے۔ عورت کے حجاب کے سلسلے میں اکبر کا ماننا ہے کہ عورت کے لیے پردہ لازم ہے، اقبال بھی پردے کے حامی ہیں، ان کی نظم 'خلوت' اور اختر شیرانی کی نظم 'عورت اور پردہ' اسی نظریے کو پیش کرتی ہے۔ چکبست عورت کے ترک پردہ پر سیخ پا نہیں ہوتے البتہ شرم و حیا کو زیور بنانے پر زور دیتے ہیں۔ سیماب اکبرآبادی کے یہاں تبدیل شدہ ہندستان نظر آتا ہے۔ ان کی نظم 'خواتینِ وطن' سے عورت کے 'چراغ خانہ' کے تصور کے برعکس وطن کی آزادی کے لیے عملی جدوجہد پر تحسین پیش کرتی ہے۔ مجاز کی نظم 'نوجوان خاتون سے' میں ایک ایسی عورت کا تصور ہے جو مردوں کے ساتھ جنگ میں حصہ لے سکے۔

الغرض جدید نظم نگار شعرا نے اپنی سوچ اور فکر کو بروئے کار لا کر عورت کے مسائل سمجھنے اور ان کا حل پیش کرنے کی سعی کی۔ انھوں نے اپنی نظموں میں ایک ایسی عورت کا تصور پیش کیا جس کا وجود ان کے نزدیک کامیاب زندگی بسر کرنے اور اس عہد کے تہذیبی تقاضوں کو پورا کرنے کے لیے ناگزیر ہے، جس سے توقع کی جا سکتی ہے کہ عورت کا مستقبل درخشاں ہوگا۔

حواشی

1 ڈاکٹر خواجہ محمد زکریا، اکبرالہ آبادی: تحقیقی وتنقیدی مطالعہ، لاہور سنگ میل پبلی کیشنز، 1986، ص:74

2 صالحہ عابد حسین، یادگار حالی، لاہور آئینہ ادب، 1966، ص:227

3 مولانا الطاف حسین حالی، کلیات نظم حالی، جلد اول، مرتبہ ڈاکٹر افتخار احمد صدیقی، لاہور مجلس ترقی ادب، طبع اول 1968، ص:60

4 ڈاکٹر شجاعت علی سندیلوی، حالی بحیثیت شاعر، سرفراز پریس لکھنؤ، 1960، ص:220

■

Dr. Sayara Khatoon
Assistant Professor
Department of Urdu
Mahila Mahavidyalaya Bahraich

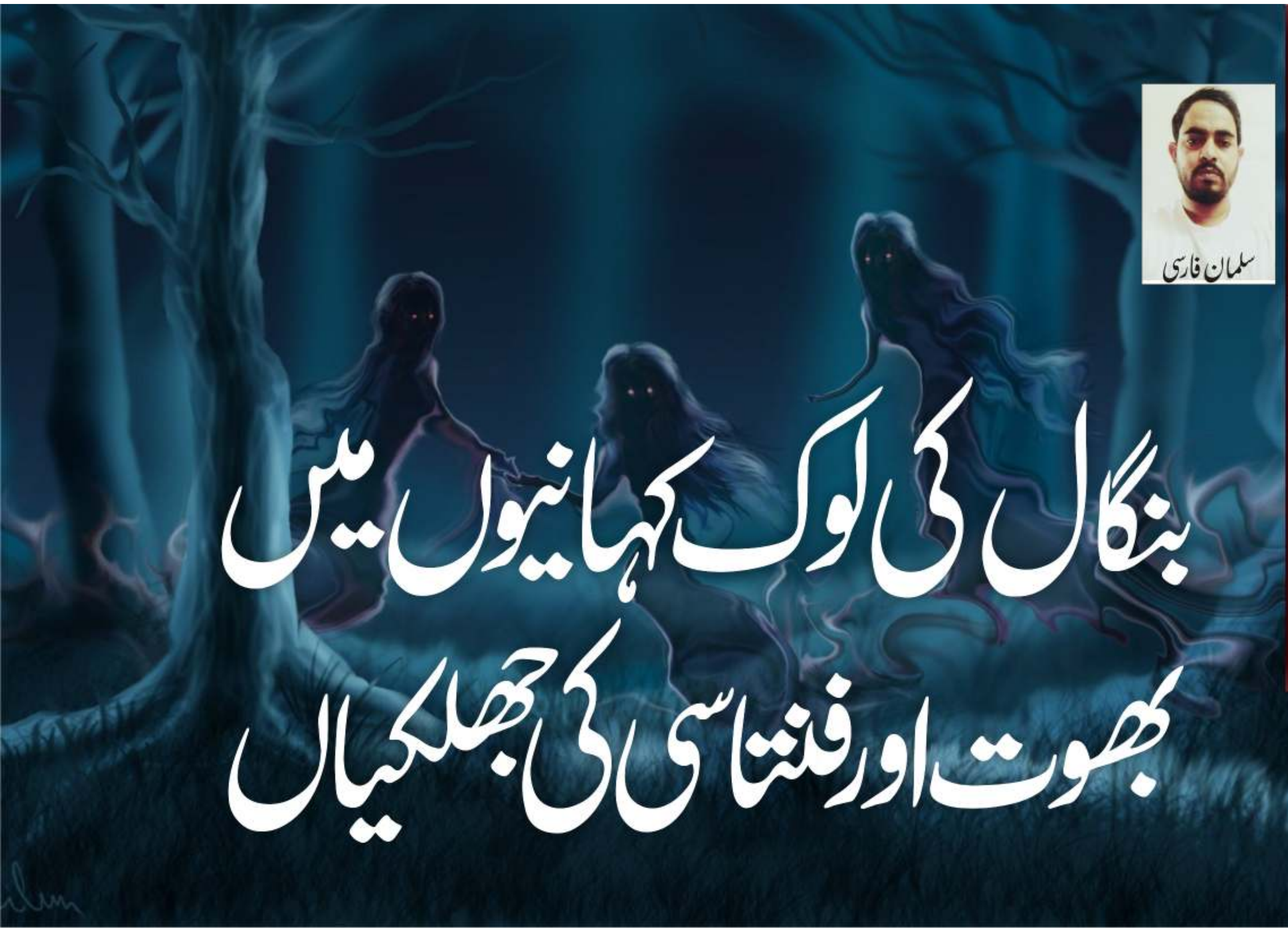

سلمان فارسی

بنگال کی لوک کہانیوں میں بھوت اور فنتاسی کی جھلکیاں

بنگال برصغیر کی وہ سرزمین ہے جس نے ہمیشہ اہلِ نظر کو اپنی طرف متوجہ کیا ہے۔ تہذیب و تمدن کے آئینے میں اگر کسی خطے کی رنگارنگی کی جھلک نظر آتی ہے تو وہ بنگال بھی ہے۔ دوسرے خطے کی طرح یہ بھی اپنے جلو میں مرکز نگاہ کی حیثیت رکھتا ہے۔ بنگلہ کے علاوہ اردو زبان کی خدمات اور فروغ اردو میں اس خطے کا نام سرفہرست ہے۔ ملک کی آزادی میں اس خطے کے جاں فروشوں کا قائدانہ کردار رہا ہے۔ ریاستی سطح پر اگرچہ بنگلہ زبان کو ترجیح دی جاتی ہے۔ لیکن اردو کی بقا کے لیے اہل بنگال کی خدمات قابل ذکر ہیں۔ اسی خطے میں مصنفوں، شاعروں، ناول نگاروں اور افسانہ نگاروں کی کھیپ موجود ہے۔ یہ ایک ایسا خطہ ہے جہاں تاریخ اور ثقافت ایک ساتھ جلوہ گر ہوتی ہیں۔ یہاں کے قدرتی اور فطرت کے مناظر جیسے ندیوں کی روانی، شاداب کھیت، خوش رنگ پھول، دلنشیں مناظر، خوردونوش کے لیے مختلف طرح کے ذائقہ دار کھان پان، زندگی کے غموں کے بوجھ کو ہلکا کرنے کے لیے رقص وموسیقی، تفریح وتفنن کے لیے عوام کا میلوں میں جانے کا اہتمام یہاں مختلف طرح کی خرید وفروخت کے سامان کے علاوہ تاریخی، قدیم اور نایاب چیزوں کی نمائش جو اس خطے کی تہذیب وثقافت کا لازمی حصہ ہے۔ اس سے واقفیت ہوتی ہے۔ پرکھوں کی یاد تازہ ہونے کے ساتھ اس وقت کے سماج وتہذیب اور ابھی کے سماج وتہذیب کا فرق نمایاں نظر آتا ہے۔ میلوں کے ساتھ تہواروں میں مختلف قبیلے، مختلف علاقے اور مختلف زبان بولنے والے کی موجودگی سے ہندستان کی حقیقت اور اصلیت جو کہ مشترکہ تہذیب وثقافت ہے، اس کی عملی شکل اور بہترین مثال نظروں کے سامنے ہوتی ہے۔ کھیت کھلیانوں سے اڑنے والی مٹی کی خوشبوؤں اور جنگلوں کے پتوں کی سرسراہٹ سے خوبصورت گیت کا سماں بنتا ہے۔ یہاں کی پوشاک، زیورات اور دیگر تمام چیزوں کی جاذبیت اس خطے کو ایک مکمل اور دلکش تصویر عطا کرتی ہے۔

بنگالی عوام اپنی فطرت میں محنتی، حساس اور جذباتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ وہ اپنے مسائل اور خیالات کا اظہار کھلے عام سڑکوں پر احتجاج کے ذریعے کرتے ہیں۔ یہ جذبہ ان کے اجتماعی شعور اور بیداری کی واضح دلیل ہے۔ وہ غریبوں کی مدد کو باعث سعادت سمجھتے ہیں اور اپنی مہمان نوازی کو لذیذ مچھلی کے پکوانوں اور خوشگوار محفلوں سے یادگار بناتے ہیں۔ بنگال نہ صرف ثقافت، ادب اور موسیقی کا مرکز ہے، بلکہ تجارت، روزگار اور معاشی مواقع کے حوالے سے بھی ہمیشہ نمایاں رہا ہے۔ اپنی عظیم شخصیات کو عزت وتوقیر دینا بنگالی تہذیب کی نمایاں روایت ہے۔ رابندر ناتھ ٹیگور کی عالمی سطح پر پذیرائی اس کا سب سے روشن ثبوت ہے۔ یوں بنگال اور اہلِ بنگال اپنی تہذیبی رنگارنگی اور گوناگوں خصوصیات کی بنا پر عالمی منظرنامے پر ہمیشہ سے ایک منفرد اور نمایاں مقام رکھتے ہیں۔

لوک کہانیاں یا لوک کتھائیں کسی بھی خطے یا علاقے کی ثقافت کا لازمی جز وسمجھی جاتی ہیں۔ اس علاقہ کی زبان کا عظیم سرمایہ ہوتی ہیں۔ اس کو وہاں کی زبان وتہذیب کے دور تک پھیلنے کا اہم ذریعہ سمجھا جاتا ہے۔ افسانے، پریوں کی کہانیاں، بزرگ خواتین کی روایتی کہانیاں وغیرہ لوک کہانیوں کے چند عام زمرے ہیں۔ ہر انسانی معاشرے کی اپنی مخصوص لوک داستانیں ہوتی ہیں جو نسل درنسل زبانی طور پر منتقل ہوتی آرہی ہیں۔ یہ کہانیاں علمی معلومات، اقدار اور تاریخی حقائق کی منتقلی کا

ایک اہم ذریعہ بھی ہیں۔

لوک کہانیوں کی سب سے خاص بات یہ ہے کہ یہ ناممکن اور غیر معمولی واقعات کو آسان اور دلچسپ انداز میں بیان کرتی ہیں، جس کی جانب سامعین، خصوصاً بچے، بے حد متوجہ ہوتے ہیں۔ ان کہانیوں کے ذریعے نہ صرف تفریح حاصل ہوتی ہے بلکہ بچوں میں تہذیب، ثقافت، اخلاقیات اور تاریخی شعور بھی پروان چڑھتا ہے۔ اس طرح لوک کہانیاں بچوں کو نہایت موثر طریقے سے معلومات فراہم کرنے، ان کی فکری نشوونما اور معاشرتی تربیت کا ایک ستون بنتی ہیں۔

بنگال اپنی خوبصورت تہذیب، رنگین ثقافت اور تاریخی ورثے کی وجہ سے دنیا بھر میں مشہور ہے۔ اس کی لوک کہانیاں بھی خاص اہمیت کی حامل ہیں کیوں کہ یہ نہ صرف لوگوں کی تفریح کا ذریعہ ہیں۔ بلکہ زندگی کے اچھے اخلاق اور معاشرتی روایات سکھانے کا بھی کردار ادا کرتی ہیں۔ "Rev.Lal Behari Day" بنگال کی لوک کہانیاں' اور دکشنارنجن مترا مجمدار نے' ٹھاکر مار جھولی' نامی کتابیں ترتیب دی ہیں، جن میں بنگال کی قدیم زبانی روایت کی خوبصورت کہانیاں جمع کی گئی ہیں۔ بنگال کی لوک کہانیوں میں ان دونوں کے نام اورا ن کی کہانیاں کافی اہمیت اور معنویت رکھتی ہیں۔ یہ کہانیاں عام طور پر "ٹھاکر مار جھولی" یعنی دادی کے سنائے ہوئے قصے یا' بنگال کی لوک کہانیاں' کے عنوان سے مشہور ہیں۔ صدیوں سے یہ کہانیاں بچوں کی پسندیدہ سرگرمی رہی ہیں، جن سے نہ صرف وہ تفریح پاتے ہیں بلکہ زندگی کی سادہ اور گہری سبق آموز باتیں بھی سیکھتے ہیں۔ ان کی اہمیت اس لیے بھی ہے کہ یہ نسل در نسل منتقل ہوتی آ رہی ہیں اور سماجی، اخلاقی اور ثقافتی اقدار کو زندہ رکھتی ہیں۔

ان مشہور کہانیوں کے مطالعے سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ بنگالی لوک کہانیاں بنیادی طور پر خواتین کی کہانیاں ہیں۔ ان کہانیوں کی سب سے اہم خصوصیت یہ ہے کہ یہ خواتین ہی ہوتی ہیں جو کہانیاں سناتی ہیں، جیسے دادی، مائیں، خالہ، بڑی بہنیں وغیرہ۔ عموماً یہ کہانیاں رات کو بچوں کے ساتھ بستر پر یا کچن میں سنائی جاتی ہیں تاکہ بچے جلدی سو جائیں۔ ان کہانیوں کا زیادہ تر محور بچوں کی تربیت اور اخلاقی سبق ہوتا ہے، جن میں یہ پیغام دیا جاتا ہے کہ بغیر والدین کی

یہ ایک ایسا خطہ ہے جہاں تاریخ اور ثقافت ایک ساتھ جلوہ گر ہوتی ہیں۔ یہاں کے قدرتی اور فطرت کے مناظر جیسے ندیوں کی روانی، شاداب کھیت، خوش رنگ پھول، دلنشیں مناظر، خورد ونوش کے لیے مختلف طرح کے ذائقے دار کھان پان، زندگی کے غموں کے بوجھ کو ہلکا کرنے کے لیے رقص و موسیقی، تفریح و تفنن کے لیے عوام کا میلوں میں جانے کا اہتمام یہاں مختلف طرح کی خرید وفروخت کے سامان کے علاوہ تاریخی، قدیم اور نایاب چیزوں کی نمائش جو اس خطے کی تہذیب وثقافت کا لازمی حصہ ہے۔ اس سے واقفیت ہوتی ہے۔

اجازت کے رات کے وقت گھر سے باہر نہ نکلیں۔

بھوت، جو کہ نظر آنے والی یا نظر نہ آنے والی مخلوق کے طور پر جانا جاتا ہے۔ اختلاف نظریات کے ساتھ بنگالی سماج ومعاشرت میں اس کے اچھے اور برے اثرات کے تئیں اس کو راضی وخوش کرنے کا اہتمام کیا جاتا ہے۔ یہ سب بنگالی سماج ومعاشرت میں ایک اہم عنصر ہے۔ بنگالی تہذیب وثقافت میں بھوت کے وجود اور اس کی طاقت پر گہرا یقین پایا جاتا ہے۔ بھوت کی پوجا پاٹ اور اس کے نام سے مختلف طرح کی نذر و نیاز کی روایت صدیوں سے چلی آ رہی ہے۔ یہ عقیدہ ہے کہ بھوت نذر و نیاز سے خوش ہوتا ہے اور لوگوں کے کام میں معاونت کرتا ہے، لیکن اگر اس کی پوجا پاٹ نہ کی جائے تو وہ ناراض ہو کر مشکلات پیدا کر دیتا ہے۔ ایسے حالات سے نجات پانے کے لیے پنڈت یا اوجھا سے رجوع کیا جاتا ہے، جو مخصوص منتر وعملیات کے ذریعے بھوت کی سرکشی کو قابو میں لاتا ہے۔

بنگالی لوک کہانیوں میں بھوت کا کردار دلچسپی اور تنوع کا حامل رہا ہے۔ یہ کردار مثبت ومنفی دونوں روپ میں پیش کیا جاتا ہے۔ روایت کے مطابق، بھوت ہمیشہ اندھیرے، موت اور خوف کے جذبات سے جڑا ہوتا ہے۔ جب بھی بھوت کا ذکر ہوتا ہے تو لوگوں کی توقع ہوتی ہے کہ وہ ایک خوفناک مخلوق ہوگی، جس کے لمبے ناخن، لمبے بال، خوفناک شکل اور رات کے اندھیروں میں نظر آنے والے روپ سے خوف پھیلانے کی خصوصیت ہوگی، مگر دلچسپ بات یہ ہے کہ بنگالی لوک کہانیوں میں بھوت کا کردار صرف ڈرانے تک محدود نہیں بلکہ اس کے ذریعے معاشرتی تعلیمات، ثقافت، عقائد اور تفریح کے پہلوؤں کو بھی اجاگر کیا جاتا ہے۔

زیر بحث کہانیوں میں بھوتوں کی مختلف اقسام شامل ہیں، جیسے بر ہمدیت، پٹانی یا کمپنی، ڈائنی، راکشش، نیل کمل، لال کمل وغیرہ، جو اپنی مخصوص خصوصیات اور کردار کے ساتھ پیش کیے جاتے ہیں۔ یہ کردار نہ صرف بچوں اور بڑوں کو محظوظ کرتے ہیں بلکہ ایک خاص تہذیبی ورثے کی عکاسی بھی کرتے ہیں۔

Rev.Lal Behari Day کے کہانیوں کا مجموعہ' بنگال کی لوک کہانیاں' میں شامل' بر ہمدیت' کی کہانی اس کہانی میں بھوت ایک بر ہمدیت ہے۔ ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ ایک غریب برہمن اپنی بیوی کے ساتھ انتہائی پریشانی کی زندگی گزار رہا تھا۔ وہ اتنا غریب تھا کہ انھیں دو وقت کا کھانا بھی میسر نہیں ہوتا، نہ زمین یا فصل۔ روزانہ در در جا کر بھیک مانگتا اور کچھ چاول اور سبز پتوں سے گزارہ کرتا تھا۔

ایک دن گاؤں کا مالک بدل گیا۔ نیا زمیں دار اعلان کرتا ہے کہ جو کوئی رات کو گاؤں کے باہر واقع پراسرار برگد کے درخت سے ایک شاخ کاٹ کر لے آئے گا، اسے سو بیگھا بغیر کرائے کی زمین انعام دی جائے گی۔ بہت سے لوگ خوف سے ہچکچائے، کیوں کہ پہلے بھی کئی لوگوں نے ایسا کرنے کی کوشش کی تھی اور

اپنی جانیں گنوا چکے تھے۔غریب برہمن نے اپنی حالت دیکھ کر چیلنج قبول کرلیا۔ برہمن کے لیے بہتر زندگی کا یہی واحد موقع تھا- وہ بغیر کسی خوف کے نکل پڑا اور واکولہ درخت تک پہنچ گیا جہاں ایک مہربان اور طاقتور برہمدیت سے اس کی ملاقات ہوئی، جو انسانوں کی دنیا اور روحانی دنیا کے درمیان پل کی مانند تھا۔ برہمدیت نے برہمن کی مدد کرنے کی پیشکش کی۔ جب برہمن برگد کے درخت کی شاخ کاٹنے لگا، تو سیکڑوں خوفناک بھوت اُمڈ آئے، لیکن برہمدیت کے حکم پر وہ سب بھوت نہ صرف برہمن کو نقصان نہ پہنچا سکے بلکہ خود شاخ کاٹ کر برہمن کے ہاتھ میں دے دی۔ تاکہ اس کو انعام مل جائے اور غربت دور ہو جائے۔

اگلی صبح واپسی پر برہمن کو ہاتھ میں برگد کی شاخ لیے زندہ دیکھ کر سب حیران رہ گئے۔ زمیندار نے خود جا کر شاخ کی تصدیق کی اور یقین کر کے برہمن کو مستقل بغیر کرایے کی سو بیگھا زمین عطا کر دی۔ برہمن کی خوشی کا کوئی ٹھکانہ نہ رہا، البتہ جو زمینیں دی گئی تھیں، وہ ایک خوبصورتی سے لہراتا ہوا سنہری دھان، جو مکمل طور پر کٹنے کو تیار تھا، لیکن برہمن کے پاس نہ مزدور تھے، نہ وسائل کہ وہ اس سنہری دھان کو کاٹ سکے۔ اس مشکل وقت میں پھر اس کا مددگار برہمدیت سامنے آتا ہے۔ اس نے برہمن سے کہا کہ گاؤں کے لوگوں سے سو درانتی ادھار لے کر واکولا درخت کے نیچے رکھ دو۔ رات کے وقت برہمدیت نے سو بھوتوں کو حکم دیا کہ وہ کام سنبھالیں۔ یہ بھوت اتنی تیز رفتاری سے فصل کاٹتے، دھان کے سنہری تنے زمین پر گر جاتے، پھر ان کو اٹھا کر برہمن کے گھر لے جاتے، جہاں اناج اور تنکا الگ کیا جاتا اور گودام میں ترتیب سے محفوظ کیا جاتا۔

صبح کے وقت برہمن اور اس کی بیوی کی خوشی کا کوئی ٹھکانہ نہ رہا۔ سنہری دھان سے بھرا گودام اور خوبصورت ریکس ان کی آنکھوں کے سامنے تھے۔ گاؤں کے لوگ حیرت سے اسے خداؤں کی کرامت سمجھ بیٹھے۔ بعد ازاں برہمن نے اپنی سخاوت سے ایک ہزار برہمنوں کے لیے بھوج کا اہتمام کرنا چاہا۔ برہمدیت کی عنایت سے ایک دن میں تمام ضروری اشیا مکمل ہو گئیں: ایک سو برتن گھی، آٹے کے بڑے ڈھیر، ایک سو برتن شکر، دودھ، دہی اور ہزاروں دیگر اشیا۔ اگلی صبح ایک ہزار برہمنوں نے شاندار طریقے سے کھانا کھایا، لیکن خود برہمن نے کچھ نہ کھایا، کیوں کہ برہمدیت نے بتایا کہ اس کی مخلص مدد برہمن کی اچھی خدمت کر کے وقت مکمل ہو چکا ہے اور اسے آسمانی پوشپاک گاڑی سے واپس بلایا جا چکا ہے۔ یوں برہمدیت آسمان کی طرف روانہ ہو جاتا ہے اور برہمن خوشحالی کی زندگی گزارنے لگتا ہے۔ اپنی زمین پر محنت کی، نسلوں کو پروایا اور سکون و اطمینان سے زندگی گزاری۔ ایک بھوت کا ایک غریب کی مدد کے لیے بہترین خدمات انجام دینے کا خیال نہ صرف ایک برہمادیتیہ کے لیے ترس اور احترام کو جنم دیتا ہے بلکہ ساتھ ہی یہ بھی ظاہر کرتا ہے کہ اچھی چیزیں آخر کار محنت اور قسمت پر پڑتی ہیں۔

> **بنگالی لوک کہانیوں میں بھوت کا کردار دلچسپی اور تنوع کا حامل رہا ہے۔ یہ کردار مثبت و منفی دونوں روپ میں پیش کیا جاتا ہے۔ روایت کے مطابق، بھوت ہمیشہ اندھیرے، موت اور خوف کے جذبات سے جڑا ہوتا ہے۔**

دوسری کہانی Dakshinaranjan Mitra Majumdar کی تصنیف 'ٹھاکر مار جھولی' میں شامل کہانی 'نیل کمل اور لال کمل' ایک دلچسپ اور عبرت آموز داستان ہے۔ اس کہانی میں بھوت ایک ڈائنی کی شکل میں پیش کیا گیا ہے، جسے راکشسی رانی جو راجہ کی دوسری بیوی کے طور پر بیان کیا گیا ہے۔ عام طور پر بنگال کے دیہاتوں میں 'ڈائنی' سے مراد وہ ہوشیار بوڑھی خواتین ہوتی ہیں جو کالا جادو یا دیگر مافوق الفطرت صلاحیتوں کی ماہر سمجھی جاتی ہیں۔ مقامی عقیدے کے مطابق یہ ڈائنی سو سال تک زندہ رہنے کے لیے بچوں کو اغوا کرتی ہیں، انھیں قتل کر کے ان کا خون چوس لیتی ہیں۔ یہی تشویشناک تصور ڈاکشن رنجن مترا نے اپنی تحریر میں نہایت دلچسپ انداز میں پیش کیا ہے۔ یہ کہانی ایک بادشاہ کی ہے جس کی دو بیویاں تھیں۔ ایک نیک اور مہربان انسانی رانی اور دوسری چالاک راکشسی رانی، جس کی اصلیت پوشیدہ تھی انسانی رانی کا بیٹا کسم تھا اور راکشسی رانی کا بیٹا اجیت۔ اجیت اور کسم بھائیوں کی طرح ایک دوسرے کے قریب رہتے گہرے دوست کی مانند تھے۔ اور ایک دوسرے کو گرم جوشی سے گلے لگاتے تھے لیکن راکشسی رانی اپنے سوتن کے بیٹے کسم سے حسد کرتی تھی اور اسے کھانے کی خواہش رکھتی تھی۔ کیوں کہ اسے انسانی گوشت کھانے کی عادت تھی۔ لیکن اس کا اپنا بیٹا اجیت کبھی کسم کا ساتھ نہ چھوڑ تا۔ راکشسی رانی کے شیطانی منصوبوں کو ناکام بناتے۔ غصے میں اس کے دانت کٹکٹاتے اس کی روح تاریک خواہشات سے کانپتی تھی۔

ایک دن جب راکشسی رانی کسم کو کھانے میں کا میاب ہو گئیں، رانی خوشی سے قہقہے لگاتی رہی۔ اجیت کی نیند کھلی۔ اس کا دل رات کے زہر سے بھاری تھا۔ میرا بھائی کہاں ہے؟ وہ چیخا گھبراہٹ میں اٹھتے ہوئے اس نے دیکھا کہ کمرے میں افراتفری ہے رانی کے کنگن اور پازیب شیطانی طور پر بج رہے ہیں۔ راکشسی رانی کسم کو کھا رہا تھا۔ اجیت کا جسم کانپ اٹھا اس کی آنکھیں دہشت سے دھندلا گئیں۔ وہ آگے بڑھا اور راکشسی رانی کے سر پر وار کیا 'آہ آہ' کی چیخ کے ساتھ راکشسی رانی گھوما اور رانی نے محسوس کیا کہ اس کا اپنا بیٹا اس کا دشمن بن گیا اپنے جلتے غصے میں اس نے ممتا کا احساس کھو دیا اور اپنے بیٹے اجیت کو کھا لیا۔ اسے چبا کر ٹکڑے ٹکڑے کر دیا، لیکن وہ اسے ہضم نہ کر سکے۔ اس کے گلے سے لوہے کی گیند نکل آئی جو انڈے کی شکل میں تھی رانی نے لڑکھڑاتی ہوئی لوہے کی گیند اٹھائی اور بھاگ گئی۔ ندی کے کنارے لوہے کی گیند کو بانس جھاڑیوں میں دفن کیا ایک بے جان راکشسی رانی بن کر واپس آئی۔ ندی کے کنارے، بانس جھاڑ ہوا میں لہراتا تھا۔ ایک کسان بانس کاٹ رہا تھا اور اس جھاڑ کے اندر کسان نے دو بڑے انڈے دیکھے، جو نہ کسی سانپ کے تھے اور نہ کسی جانور کے۔ خوفزدہ ہو کر اس

نے انڈوں کو پھینک دیا، لیکن انڈے ٹوٹے اور دو شہزادے سامنے آئے: لال کمل (کسم کی دوبارہ پیدائش) اور نیل کمل (اجیت کی دوبارہ پیدائش)۔ دونوں نے خوبصورت لباس پہنا اور تلواریں تھامیں، اور اپنی سلطنت کو راکشسیوں کے ظلم سے آزاد کرنے کے لیے نکل کھڑے ہوئے۔

شہزادوں نے راکشسی رانی کے قلعے تک پہنچ کر اپنی بہادری کا مظاہرہ کیا۔ انھوں نے شیطانی مخلوقات کو شکست دی، راکشسی رانی کے قلعے میں داخل ہوئے اور آخر کار نیل کمل نے راکشسی رانی کا سر قلم کر کے بادشاہ کی بیماری اور سلطنت پر لعنت ختم کی۔ بادشاہ کو اپنے بیٹوں کی اصلیت معلوم ہوئی۔ نیل کمل اور لال کمل نے سلطنت کو دوبارہ خوشحال اور طاقتور بنایا۔ دونوں شہزادے اپنی بہادرانہ خدمات کے ذریعے تاریخ میں امر ہو گئے۔ یہ بنگالی کہانیوں میں سب سے زیادہ پسند کی جانے والی کہانیوں میں سے ایک ہے۔ ہیرو بچے ہیں اور پھر بھی کسی نہ کسی طرح ان کی بہادری بے مثال ہے۔

بچے فنتاسی کی دنیا میں رہتے ہیں، جو بالغوں کی دنیا سے بالکل مختلف ہوتی ہے۔ اس خیالی دنیا میں بھوت، جن، پریت، کا کردار لازمی ہوتے ہیں اور بچے انھی خوفناک کہانیوں کے ذریعے اپنے تخیل کی پرواز کرتے ہیں۔ وہ خوف زدہ ہونا پسند کرتے ہیں، بشرطیکہ بزرگ ان کے لیے حفاظتی جال بچھا کر انھیں تحفظ فراہم کریں۔ بھوت اور دیگر خوفناک عناصر بچوں کو

”بچے فنتاسی کی دنیا میں رہتے ہیں، جو بالغوں کی دنیا سے بالکل مختلف ہوتی ہے۔ اس خیالی دنیا میں بھوت، جن، پریت، کا کردار لازمی ہوتے ہیں اور بچے انھی خوفناک کہانیوں کے ذریعے اپنے تخیل کی پرواز کرتے ہیں۔ وہ خوف زدہ ہونا پسند کرتے ہیں، بشرطیکہ بزرگ ان کے لیے حفاظتی جال بچھا کر انھیں تحفظ فراہم کریں۔“

نہ صرف ڈر کا تجربہ دیتے ہیں بلکہ زندگی کے مشکل حالات اور ان سے نمٹنے کے طریقے سیکھنے میں بھی مددگار ثابت ہوتے ہیں۔ یہ کہانیاں بچوں کو یہ سمجھاتی ہیں کہ دنیا ہمیشہ اچھائی اور برائی کا مرکب ہوتی ہے اور اچھائی کی جیت یقیناً ہوتی ہے۔ اس کے ساتھ یہ کہانیاں زندگی کے اتار چڑھاؤ اور چیلنجز کو قبول کرنے کی تعلیم بھی دیتی ہیں۔ بنگالی لوک کہانیاں، جیسے 'برہمدیت' کی کہانی اور 'نیل کمل اور لال کمل' کی کہانی بچوں کو ان کے آباؤ اجداد کی ثقافت اور ورثے سے روشناس کراتی ہیں۔ وہ نسل در نسل منتقل ہونے والی دانائی، بہادری اور سبق آموز موضوعات کی حامل ہوتی ہیں۔ مثلاً نیل کمل اور لال کمل کی کہانی میں دوستوں، بھائی چارے اور نیک و برے کے درمیان جدوجہد کے اصول واضح ہیں، جو بچوں کے اخلاقی شعور کو بڑھاتے ہیں۔ یہ کہانیاں آج بھی بچوں اور بڑوں میں مقبول ہیں کیوں کہ ان میں دلچسپ کردار، شاندار بہادری اور سبق آموز موضوعات شامل ہیں جو ہر نسل کو محظوظ اور تعلیم یافتہ کرتے ہیں۔ لوک کہانیاں نہ صرف تفریح فراہم کرتی ہیں بلکہ آنے والی نسلوں کو اپنے ثقافتی ورثے کی حفاظت اور آگے بڑھانے کی تلقین بھی کرتی ہیں۔

ہم کہہ سکتے ہیں لوک کہانیاں کسی بھی خطے کی ہو ں وہاں کی زبان کے علاوہ وہاں کی تہذیب وثقافت کی ترجمان ہوتی ہیں۔ سماجی اور معاشرتی انفرادیت ہوتی ہے ۔ ایسی کتنی ہی لوک کہانیاں ہیں جو بنگلہ زبان میں ہیں اسے صرف اردو زبان وتہذیب اور اردو داں طبقے تک رسائی کے لیے کوشش کرنا بہترین کوشش ہوگی۔ اردو زبان کے دامن میں ایک اور خطے کی تہذیب وثقافت کا اضافہ ہوگا۔

حواشی

1 ہماری لوک کہانیاں، پریم پال اشک، ترقی اردو بیورو، نئی دہلی 1991

2 ٹھاکر مار جھولی ،دکشنا رنجن مترا مجمدار، 1907 ص:121.(http://dhakeshwari.com/thakurmarjhuli)

3 FolkTales of Bangal by Rev.Lal Bihari. Macmilan,and Co-limited, st.Martins.StreetLondon,1912,Page NO:192

■

Salman Farsi
Scholar: Center for Urdu Culture Studies
Boys: Hostal 04/ Room No : 07
Maulana Azad National Urdu University
Hyderabad (T.S.) 500032
Mob: 8297868804
Email: Sfarsi08@gmail.com

مصنوعی ذہانت اور تخلیقی ادب

جاوید احمد شاہ

دور حاضر میں انسان بے انتہا ترقی کر چکا ہے۔ ابھی معلوم نہیں اس کی پرواز کہاں تک ہو گی۔ روز بروز سائنس انسان کی رہنمائی کرتا ہوا نظر آتا ہے جس کی بدولت زندگی کے ہر شعبے میں معلومات میں اضافہ ہو رہا ہے۔ موجودہ دور کو مصنوعی ذہانت Artificial Intelligence کے دور سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ مصنوعی ذہانت دراصل ڈیٹا + الگورتھم + کمپیوٹنگ پاور کا مجموعہ ہے جس کے ذریعے مشینیں ''ذہانت'' جیسا عمل انجام دیتی ہیں۔ آسان الفاظ میں مصنوعی ذہانت وہ صلاحیت ہے جو مشینوں کو سوچنے، سمجھنے، فیصلہ کرنے اور سیکھنے کے قابل بناتی ہے۔ مصنوعی ذہانت کی برق رفتار پیش رفت نے انسانی زندگی کے تقریباً ہر شعبے کو اپنی لپیٹ میں لے لیا ہے۔ ٹیکنالوجی کے مسلسل ارتقا نے نہ صرف ہمارے تخلیقی اظہار بلکہ زبان کی تشکیل اور متن کی تفہیم کے طریقوں میں بھی بنیادی تبدیلیاں پیدا کر دی ہیں۔

گزشتہ چند برسوں میں بڑے لسانی ماڈلز (Large Language Models) پر مبنی — AI خصوصاً GPT-4، DEEP SEEK,GROK, GEMINI, Perplexity اور ان کے جدید تر ورژنز نے زبان کے تجزیے، فہم اور تخلیق کے میدان میں ایسے امکانات روشن کیے ہیں جنھوں نے انسان اور متن کے باہمی رشتے کو ایک نئی جہت عطا کی ہے۔ یہ جدید ماڈلز انسانی اسلوب، ساخت اور تخلیقی منطق تک کی تقلید کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ انسانی ہدایات اور ڈیٹا کے امتزاج سے یہ ایسے متون تخلیق کر سکتے ہیں جو نہ صرف معنی کے اعتبار سے سنجیدہ ہوتے ہیں بلکہ اظہار و بیان میں بھی انسان کی تحریر کے قریب محسوس ہوتے ہیں۔ جب ٹیکنالوجی رفتار کے ساتھ ترقی کر رہی ہو تو لازم ہو جاتا ہے کہ ہم ادب، تخلیق اور تحریر سے وابستہ تمام شعبوں کو نئی نظر سے پرکھیں اور دوبارہ سمجھنے کی کوشش کریں۔ جس طرح صنعتی انقلاب نے زندگی کے مادی خدوخال کو نئی شکل دی تھی، اسی طرح مصنوعی ذہانت بھی ادب اور زبان کے دامن میں ایک ایسے غیر محسوس مگر طاقتور انقلاب کو پروان چڑھا رہی ہے جو آنے والے زمانوں کا رخ بدل سکتا ہے۔ بڑا لسانی ماڈل دراصل ایک ایسا خود بہ خود چلنے والا نظام ہے جو دنیا بھر کے متون کو پڑھ کر، اُن کا تجزیہ کر کے اور ڈیپ لرننگ Deep Learning کی مدد سے اُن کے نظام کو سمجھ کر مسلسل نیا متن تخلیق کرتا رہتا ہے۔ فہم اور تخلیق کے اسی مسلسل تبادلے میں یہ ماڈلز انسانی تحریر کی باریکیوں، آہنگ اور ساخت کو اس طرح سمیٹ لیتے ہیں کہ قاری کو ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے وہ کسی حساس اور تجربہ کار ادیب کو پڑھ رہے ہیں۔ الفاظ کی نشست و برخاست، جملوں کی ساخت اور اندازِ بیان اس قدر شفاف اور واضح ہوتا ہے کہ یہ اندازہ کرنا مشکل ہو جاتا ہے کہ یہ سب ایک مشین کی تخلیق ہے۔

بڑے لسانی ماڈلز میں سب سے بڑی رکاوٹ یہ ہے کہ ''ڈیپ لرننگ'' کے ذریعے زبان سازی کا جو طریقۂ کار اپنایا جاتا ہے وہ ہر ماڈل میں مختلف ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ایک جیسا مقصد رکھنے کے باوجود ان ماڈلز کے نتائج میں واضح فرق دکھائی دیتا ہے۔ مثال کے طور پر (Generative Pre-Trained Transformer) GPT ماڈل کو دیکھیں۔ یہ ایک ایسا تربیت یافتہ لسانی ماڈل ہے جو الفاظ کو باہمی ربط کے ساتھ سلسلہ وار جوڑ کر متن تخلیق کرتا ہے۔ نیا لفظ چننے سے پہلے یہ نہ صرف پچھلے لفظ کو دیکھتا ہے بلکہ اس کے پورے میکانزم — جملے، اقتباس اور موضوع — کو بھی پرکھتا ہے، پھر ممکنہ نتائج میں سے سب سے موزوں لفظ منتخب کرتا ہے۔ اگر صارف کوئی خاص ہدایت دے دے، مثلاً یہ کہ جملے میں خوشحال زندگی کا تصور لازماً شامل ہو، تو ماڈل غیر ضروری نتائج کو الگ کر دیتا ہے اور وہی الفاظ منتخب کرتا ہے جو مطلوبہ موضوع سے میل رکھتے ہوں، جیسے: ''آرام و سکون کی زندگی'' یا اس سے ملتی جلتی تراکیب۔

جب آپ کسی مصنوعی ماڈل کو کوئی سوال یا پرامپٹ بھیجتے ہیں، تو یہ پہلے آپ کے انپٹ کا تجزیہ کرتا ہے، مطلب جاننے کی کوشش کرتا ہے، پس منظر سمجھتا ہے اور جذبات یا انداز (tone) کی پہچان بھی کر سکتا ہے۔ اس کے بعد ڈیٹا اور ریئل-ٹائم معلومات (Real Time Information) کو ملا کر مناسب اور معنی خیز جواب تیار کرتا ہے۔ بڑے لسانی ماڈلز کے بارے میں عام غلط فہمی یہ ہے کہ وہ زبان کو انسان کی طرح سمجھتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ ان کے پاس فہم (Understanding) نہیں ہوتی — صرف محاسباتی

اندازہ سازی (Statistical Prediction) ہوتی ہے۔ یعنی یہ معنی نہیں سمجھتا، صرف پیٹرن اور سابقہ ڈیٹا کے ذریعے متوقع جواب تخلیق کرتا ہے۔ انسان کی طرح ادراک، بصیرت، وجدان، احساس اور داخلی آگہی سے یہ جواب نہیں خلق کر سکتا ہے۔ چونکہ یہ ماڈلز انسانی اسلوب و بیان کے داخلی آہنگ کو اس درجہ سمجھنے اور برتنے لگے ہیں کہ ان کی تخلیق کردہ نثر ونظم اکثر انسانی تحریر لگنے لگی ہے، اس لیے مستقبل کی ادبی دنیا— جہاں افسانہ، شاعری، تحقیق اور صحافت سب شامل ہیں ایک بڑی تبدیلی کی طرف رواں دواں ہے۔ ان ماڈلز کی تیز رفتار ترقی نے یہ سوال اور بھی پیچیدہ کر دیا ہے کہ آنے والے دور میں اصل تخلیق کار کون ہوگا؟ انسان یا مصنوعی ذہانت؟ اور کیا یہ نئی صورت ادب کے لیے ایسے طرزِ اظہار کو جنم دے گی جو آج تک ہمارے تصور میں بھی نہیں تھا؟

مصنوعی ذہانت کے پس منظر میں "تخلیقی انہدام" کی اصطلاح بھی رائج ہے۔ "تخلیقی انہدام" (Creative Destruction) وہ عمل ہے جس میں نئی ٹیکنالوجی پرانے ڈھانچوں کو توڑ کر نئے نظامِ فکر کی راہ ہموار کرتی ہے۔ مصنوعی ذہانت اس وقت ٹھیک اسی مرحلے پر کھڑی ہے۔ اس کے ذریعے "ایڈیٹنگ، پروف ریڈنگ اور اسکرپٹ رائٹنگ مکمل طور پر خودکار ہو سکتی ہے"، نئے ادبی اسالیب اور نئی تخلیقی اصناف جنم لے سکتی ہیں۔ اگرچہ انسانی جذبات، احساسات، تجربات اور بصیرت کی جگہ مکمل طور پر کوئی مشین نہیں لے سکتی، لیکن ٹیکنالوجی کی تیز رفتاری کو مدنظر رکھتے ہوئے یہ واضح ہے کہ آنے والے سالوں میں فنِ تخلیق نئے روپ اور غیر متوقع تبدیلی سے گزرے گا۔

مصنوعی ذہانت کے پس منظر میں ایک سوال ذہن میں آ رہا ہے کہ کیا مشین کی تخلیق واقعی تخلیق ہے؟

یہ سوال عصر حاضر کی ادبی تنقید کے بنیادی مباحث میں شامل ہو چکا ہے کہ اگر مشین ایسا متن تخلیق کرے جس میں بیانیہ، ساخت، اسلوب، جذبات اور فکر سب کچھ موجود ہو تو کیا اسے "تخلیق" کہا جا سکتا ہے؟ کئی محققین کے مطابق یہ متن محض سابقہ تحریروں کی نقل سازی ہے، یعنی ظاہری طور پر تخلیق جیسی دکھائی دیتی ہے، لیکن اس کے اندر وہ باطنی جوہر اور تخلیقی روح موجود نہیں ہوتی جو انسانی اظہار کو معنویت بخشتی ہے۔ مگر اس کے باوجود عام قاری کے لیے انسانی اور مشینی متن میں فرق کرنا دن بدن مشکل ہوتا جا رہا ہے اور یہی ادبی دنیا کا سب سے بڑا چیلنج ہے۔

ادب کا سب سے بنیادی سوال یہ ہے کہ مصنف کون ہے؟ مصنوعی ذہانت کے دور میں یہ سوال مزید پیچیدہ ہو چکا ہے:

- کیا مصنف وہ ہے جس نے ہدایت دی؟
- یا وہ ماڈل جس نے الفاظ جوڑے؟
- یا وہ لاکھوں مصنفین جن کی تحریروں سے یہ نظام بنا؟

مصنوعی ذہانت نے اگرچہ انسانی دنیا کے بے شمار در وا کیے ہیں، مگر اس کے ساتھ ہی تخلیقیت کے مستقبل پر ایک سنجیدہ سوال بھی کھڑا کر دیا ہے۔ تخلیق کا اصل سرچشمہ تو انسانی دل کی وہ دھڑکن ہے جس میں لطافت احساس، تجربہ، مشاہدے کی تنویر اور روح کے تپتے ہوئے کرب کی تمازت شامل ہوتی ہے۔ یہ وہ اجزائے ترکیبی ہیں جنھیں نہ کوئی حسابی فارمولا گرفت میں لے سکتا ہے اور نہ کوئی الگورتھم ان کی لطافت کا ادراک کر سکتا ہے۔ جب ہر خیال اور ہر اسلوب پلک جھپکتے میں کسی مشینی ذہانت کے ذریعے تراش کر سامنے رکھ دیا جائے، تو انسانی ذہن کی وہ محنت، ریاضت اور باطنی کشمکش جو حقیقی فن کا زادِراہ ہوا کرتی ہے آہستہ آہستہ ماند پڑنے لگتی ہے۔ یوں گماں ہوتا ہے جیسے خودکار مشینیں ہماری جگہ محسوس کرنے، سوچنے اور خلق کرنے لگی ہیں اور انسان کا وہ مخصوص تخلیقی جوہر، جو صدیوں سے ادب وفن کی آبرو رہا ہے، دھیرے دھیرے تحلیل ہو رہا ہے۔

تخلیقیت کا حسن دراصل اسی وقت برقرار رہ سکتا ہے جب مشین انسان کی رفیقِ کار ہو، اس کا قائم مقام نہ بن جائے۔ ورنہ اظہار کے افق پر ایک ایسی کاری ضرب لگ جائے گی جو انسانی روح اور احساس کے تنوع کو دھندلا دے گی اور یوں انسان کے اندر کا وہ نازک، روشن چراغ جو تخلیق کی اصل پہچان ہے بجھنے لگے گا۔

مصنوعی ذہانت اگرچہ ادبی دنیا کے در و دیوار کو نئے امکانات سے روشن کرتی ہے، مگر اس کی فکری اور ثقافتی کمزوریاں بھی نظرانداز نہیں کی جا سکتیں۔ بڑے لسانی ماڈلز کی بنیاد اس مواد پر استوار ہوتی ہے جس سے انھیں تربیت دی جاتی ہے اور یہ مواد خود زبانوں اور ثقافتوں کے مابین طاقت کے غیر مساوی توازن کا آئینہ دار ہوتا ہے۔ یہی عدم مساوات آخرکار ان ماڈلز کی ادبی اور لسانی تخلیقات میں بھی اپنا عکس چھوڑ جاتی ہے۔ اس تناظر میں غالب زبانیں خصوصاً انگریزی مزید قوت و مرکزیت حاصل کرتی ہیں، جب کہ کمزور، مقامی اور حاشیے کی زبانیں ایک خاموش معدومیت کی طرف بڑھنے لگتی ہیں۔ یہ عمل محض زبان کی سطح تک محدود نہیں رہتا، بلکہ اس کے اثرات اُن مخصوص ثقافتی ورثوں، لوک روایات اور جمالیاتی قدروں تک پھیل جاتے ہیں جو کسی تہذیب کی تخلیقی شناخت کا بنیادی حصہ ہوتی ہیں۔ مشینی نظاموں میں شمولیت کے پیمانے اکثر انھیں ثقافتوں کو ترجیح دیتے ہیں جو عالمی ڈیٹا میں عددی طور پر زیادہ نمایاں ہیں، نتیجتاً کم معروف یا مقامی ثقافتی عناصر پس پشت چلے جاتے ہیں۔

یہ صورت حال مستقبل میں ادبی نوآبادیات (Literary Neocolonialism) کی ایک نئی شکل کو جنم دے سکتی ہے۔ ایسی نوآبادیات جو سیاسی وجغرافیائی نہیں، بلکہ ڈیجیٹل اور لسانی بالادستی کے اصولوں پر قائم ہوگی۔ اس نئی نوآبادیاتی فضا میں بیانیے، کردار، جمالیات اور ثقافتی ترجیحات وہی طے کریں گے جو ڈیٹا کی دنیا میں طاقت اور مرکزیت رکھتے ہیں۔ افکار و اقدار کے اس بدلتے ہوئے تناظر میں ضروری ہے کہ انسانی تخلیقیت، ثقافتی تکثیریت اور لسانی تنوع کو مشینی نظاموں کی بلندیوں میں گم ہونے نہ دیا جائے، بلکہ انھیں ایک ایسے تنقیدی شعور کے ساتھ برتا جائے جو ادب کو نئی ٹیکنالوجی کے ساتھ ہم آہنگ بھی رکھے اور اس کی روحانی وتہذیبی اساس کی حفاظت بھی کرتا رہے۔

مجموعی طور پر بڑے لسانی ماڈل ادبی دنیا کے لیے ایک نعمت بھی ہیں اور ایک سوال بھی۔ یہ نئے امکانات کا دروازہ بھی کھولتے ہیں اور نئے خدشات بھی جنم دیتے ہیں۔ یہ تخلیق کو سہارا بھی دیتے ہیں اور اسے چیلنج بھی کرتے ہیں۔ مستقبل کا ادب تبھی مستحکم اور معنی خیز رہے گا جب انسان اپنی تخلیقی خودمختاری کو قائم رکھتے ہوئے مشین کو صرف ایک اوزار کے طور پر استعمال کرے نہ کہ اس کے سامنے جھک جائے۔

■

Dr. Javaid Ahmad Shah
Assistant Professor
Department of Urdu
University of jammu
Cell No: 7006834309
Email:drjavaid.ashah@jammuuniversity.ac.in

عشق اورنگ آبادی کی شعری جہات

کلیم احمد

عشق اورنگ آبادی کا نام مرزا جمال اللہ تھا۔ یہ مرزا داؤد بیگ اورنگ آبادی کے بیٹے تھے۔ اورنگ آباد میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد مرزا داؤد بیگ نیک، خوش اخلاق اور باکردار انسان تھے، جن کے اخلاق وتربیت نے عشق کی شخصیت پر گہرا اثر چھوڑا۔ انھوں نے ابتدائی تعلیم اورنگ آباد میں گھر پر ہی حاصل کی۔ قرآن مجید، فارسی، عربی، فقہ، حدیث، منطق اور فلسفہ کا درس لیا۔ فارسی ادب سے انھیں خاص شغف تھا اور وہ حافظ، سعدی اور رومی جیسے عظیم شعرا سے بے حد متاثر تھے۔ اسی علمی پس منظر کی وجہ سے ان کی شاعری میں زبان کی شفافیت، الفاظ کا حسن اور معنوی گہرائی نمایاں طور پر دکھائی دیتی ہے۔ عشق نے شاعری سامی اورنگ آبادی کی رہنمائی میں سیکھی اور جلد ہی اہلِ علم میں اپنی پہچان بنالی۔ انھوں نے احسن تخلص اختیار کیا۔ (دکن دیس کی پیش رو غزلیں، اسلم مرزا، ص 175) ناچیز کو ان کی ایسی غزلیں دستیاب نہ ہو سکیں جن میں احسن تخلص اختیار کیا ہو۔ انھیں باقاعدہ رسمی تعلیم حاصل کرنے کا زیادہ موقع تو نہیں ملا، مگر ان کی ذہانت، فطری گہرائی اور اردو و فارسی زبان کی شیرینی نے انھیں کم عمری میں ہی سخن گوئی کی طرف مائل کر دیا۔ اورنگ آباد کی علمی و ادبی فضا ان کی ذہنی نشو ونما کے لیے بے حد سازگار ثابت ہوئی۔

جب نواب نظام علی خان آصف جاہ ثانی نے اورنگ آباد سے اپنا دربار حیدرآباد منتقل کیا تو یہ بھی تلاش معاش میں حیدرآباد پہنچے۔ وہاں سید عبدالولی عزلت سورتی کے شاگرد ہو گئے اور عشق تخلص اپنایا۔ ان کا دیوان محمد اکبر الدین صدیقی نے مرتب کر کے 1960 میں ادارہ ادبیات اردو، حیدرآباد سے شائع کیا۔

عشق کا انتقال 1195 ھ مطابق 1780 میں حیدرآباد میں ہوا۔

عشق اورنگ آبادی کا زمانہ اردو شاعری کے ارتقا کا اہم دور تھا۔ اس وقت اورنگ آباد کا ماحول صوفیانہ تھا۔ شمالی ہند میں ولی دکنی کی شاعری نے اردو کو نئی سمت دی، جبکہ دکن میں اردو غزل ایک مضبوط روایت بن چکی تھی۔ اورنگ آباد میں اس وقت مشاعروں کی محفلیں گرم رہتیں اور علما، مشائخ وشعرا کی محفلیں جگہ جگہ سجتی تھیں۔ جہاں شعرا اپنا کلام پیش کرتے اور ایک دوسرے سے اصلاح لیتے۔ انھیں محفلوں میں عشق نے زبان و بیان کی نزاکتیں، شاعری کا ذوق، اور روحانی شعور حاصل کیا۔ ان کی علمی تربیت میں شہر کے بزرگ علما اور صوفیا کا نمایاں کردار رہا۔ عشق کے کلام میں صوفیانہ لطافت اور فکری اعتدال واضح ہے۔ انھوں نے سید عبداللہ موسوی جیسے معتبر علما سے بھی استفادہ کیا اور اس دور کے مشاعروں کا حصہ رہے۔ یہی تربیت بعد میں ان کے کلام کا بنیادی جوہر بنی۔ اس ادبی ماحول نے ان کی شاعرانہ صلاحیتوں کو جلا بخشی۔

عشق نے شاعری کی ابتدا فارسی زبان میں کی مگر بعد میں اردو کو اپنا ذریعہ اظہار بنایا۔ اس زمانے میں اردو کو عوامی زبان کی حیثیت حاصل ہورہی تھی، اسی لیے

عشق نے شاعری کی ابتدا فارسی زبان میں کی مگر بعد میں اردو کو اپنا ذریعہ اظہار بنایا۔ اس زمانے میں اردو کو عوامی زبان کی حیثیت حاصل ہورہی تھی، اسی لیے انھوں نے اردو میں شاعری کر کے اسے فروغ دیا۔

انھوں نے اردو میں شاعری کر کے اسے فروغ دیا۔ رفتہ رفتہ ان کی غزلیں مشہور ہونے لگیں اور وہ ایک قادرالکلام شاعر کے طور پر گنے جانے لگے۔ ان کی شاعری میں جذبات کی شدت کے ساتھ فکری گہرائی بھی پائی جاتی ہے۔

عشق کی اصل پہچان غزل سے ہے۔ ان کی غزلوں میں عشق، درد، سوز، تصوف اور انسانی احساسات کا امتزاج ملتا ہے۔ ان کے اشعار میں روانی، نرمی اور سچائی پائی جاتی ہے۔ عشق کی غزلیں نہ صرف جذباتی کیفیت کی عکاسی کرتی ہیں بلکہ قاری کو سوچنے پر بھی مجبور کر دیتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ انھیں دکنی اردو کے ممتاز غزل گو شعرا میں شمار کیا جاتا ہے۔

عشق اورنگ آبادی نے سادگی، خلوص، درویشانہ مزاج اور روحانی رجحان کے ساتھ اپنی شاعری کو ایک منفرد رخ عطا کیا۔ وہ اٹھارہویں صدی کے ادبی ماحول سے تعلق رکھتے تھے، جب اورنگ آباد دکن میں علمی، ادبی اور صوفیانہ سرگرمیوں کا عروج تھا۔ عشق کا کلام اسی تہذیبی و روحانی فضا کا عکاس ہے۔ عشق کا جھکاؤ ابتدا ہی سے صوفیانہ ماحول کی طرف تھا۔ ان کے شہر میں خانقاہیں، علما کی مجالس اور صوفیا کی محفلیں عام تھیں، جن میں شریک ہو کر انھوں نے نہ صرف دین و اخلاق کی بنیادی تعلیمات سیکھیں بلکہ دل کی لطافت اور روحانی فکر بھی حاصل کی۔ عشق نے سید عبداللہ موسوی جیسے اہل علم سے بھی استفادہ کیا، جنھوں نے ان کے فکری اور اخلاقی شعور کی بنیادیں مضبوط کیں۔ روحانی عنصر ہی بعد میں ان کی شاعری کی شناخت بن گیا۔

مرزا جمال اللہ عشق کی فطرت میں نرمی اور لطافت تھی۔ اورنہایت سادہ طبیعت کے انسان تھے۔ وہ تصوف کی طرف مائل تھے اور دنیا کی ظاہری چمک دمک سے زیادہ روحانی سکون کو اہمیت دیتے تھے۔ ان کی زندگی میں عاجزی، قناعت اور درویشی نمایاں تھی۔ وہ دولت اور شہرت کے بجائے علم، سچائی اور اخلاق کو ترجیح دیتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی شاعری میں تکبر یا بناوٹ کے بجائے سادگی اور خلوص جھلکتا ہے۔ عشق کی گفتگو میں بھی شائستگی اور علمیت نمایاں تھی۔ انھوں نے لفظ 'عشق' کو محض جذبہ یا دنیاوی واردات کے طور پر نہیں لیا بلکہ اسے روح کی پکار، دل کی کیفیت اور بندے اور خدا کے تعلق کا لطیف تہذیبی نظام سمجھا۔ ان کی شاعری میں جو سادگی اور پرکاری نظر آتی ہے، وہ اسی باطنی تربیت کا نتیجہ ہے۔ عبد الجبار ملکاپوری اپنی کتاب ''محبوب الزمن تذکرہ شعرائے دکن''، جلد دوم میں لکھتے ہیں:

''طبع موزوں وفکر رسا سے موصوف اور متانت وضع و لطافت مزاج میں معروف تھا۔ خوش سلیقہ و خوش طریقہ تھا۔'' (محبوب الزمن تذکرہ شعرائے دکن، جلد دوم، عبدالجبار ملکاپوری، ص، 841)

عشق، پچھمی نرائن شفیق اور اسد علی خاں تمنا کی طرح انعام اللہ خان یقین کے بہت مداح تھے البتہ خدائے سخن میر کے ذکر سے ان کا دیوان خالی نظر آتا ہے۔ انھوں نے یقین کی اتباع یہاں تک کی ہے کہ یقین کی طرح چار شعر اور پانچ شعر کی غزلیں بہت زیادہ کہی ہیں۔ اسی طرح انھوں نے یقین کے مصرعوں کی بھی تضمین کی ہے۔ اس کے علاوہ سودا اور درد کی غزلوں پر بھی ان کی تضمینیں موجود ہیں۔ عزلت کے اشعار کی بھی تضمین کی ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یقین، سودا، درد اور عزلت کا وقار ان کی نگاہوں میں کتنا بلند ہے۔ ان شعرا کے علاوہ کسی اور شاعر کا نام ان کے دیوان میں نہیں ملتا۔

عشق کی شاعری عاشقانہ مزاج بھی رکھتی ہے۔ ان کی شاعری میں مضامین کا تنوع نہیں، فلسفیانہ خیالات نہیں، پند و نصائح کا دفتر نہیں۔ پورا دیوان مطالعہ کر جایئے ایہام گوئی، گل و بلبل اور عشق و عاشقی سے مملو نظر آئے گا۔ اس لیے یہ گمان ہوتا ہے کہ ایسے فرسودہ اور پامال مضمون میں عشق نے کیا تیر مارا ہو گا، لیکن عشق نے ایسی فرسودگی میں بھی اپنے لیے نئی راہ نکالی۔ ان کا کلام تصوف، اخلاق، محبت، خود احتسابی، دردمندی اور انسان دوستی پر مشتمل ہے۔ انھوں نے مشکل الفاظ، ثقیل تراکیب اور مبالغہ آرائی سے اجتناب کیا۔ ان کا اسلوب خالص صاف ستھرا اور الفاظ دل کے ترجمان ہیں۔ ان کے یہاں سادگی کے باوجود معانی کی گہرائی موجود ہے۔

عشق اورنگ آبادی کی شاعری کے موضوعات:

عشق کی شاعری کے موضوعات نہایت وسیع اور گہرے ہیں، ان میں خاص طور پر اہم یہ ہیں۔

1 عشق و محبت: عشق کی شاعری کا مرکزی موضوع محبت ہے۔ وہ محبت کو زندگی کی سب سے بڑی حقیقت سمجھتے ہیں۔ ان کے یہاں محبت صرف محبوب سے وابستگی نہیں بلکہ پوری کائنات سے لگاؤ کا نام ہے۔ ان کی شاعری کا سب سے اہم موضوع عشق حقیقی ہے۔ وہ دنیاوی محبت کے بجائے خدا کی محبت کو اصل قرار دیتے ہیں۔ ان کے اشعار میں تصوف کی جھلک صاف دکھائی دیتی ہے۔ وہ انسان کو خودی، غرور اور خواہشات سے آزاد ہو کر خدا کی طرف رجوع کرنے کی تلقین کرتے ہیں۔

2 درد اور سوز: ان کے اشعار میں ایک درد بھری کیفیت پائی جاتی ہے۔ یہ درد محض ذاتی غم نہیں بلکہ انسانی دکھوں کا عکس ہے۔

3 وفا اور بے وفائی: انھوں نے وفاداری کو اعلیٰ اخلاقی وصف قرار دیا اور بے وفائی کو انسانی کمزوری کے طور پر پیش کیا۔

4 صوفیانہ خیالات: ان کی شاعری میں جگہ جگہ صوفیانہ

> مرزا جمال اللہ عشق کی فطرت میں نرمی اور لطافت تھی۔ اورنہایت سادہ طبیعت کے انسان تھے۔ وہ تصوف کی طرف مائل تھے اور دنیا کی ظاہری چمک دمک سے زیادہ روحانی سکون کو اہمیت دیتے تھے۔ ان کی زندگی میں عاجزی، قناعت اور درویشی نمایاں تھی۔ وہ دولت اور شہرت کے بجائے علم، سچائی اور اخلاق کو ترجیح دیتے تھے۔

فکر نظر آتی ہے، جہاں دنیا کی بے ثباتی اور خدا سے قربت کا ذکر ملتا ہے۔

5 جذبات انسانی: عشق نے انسانی جذبات جیسے محبت، جدائی، غم، خوشی، امید اور مایوسی کو نہایت خوبصورتی سے بیان کیا ہے۔ ان کے اشعار میں دل کی کیفیت آسان اور سادہ انداز میں سامنے آجاتی ہے۔

6 اخلاقیات: عشق کی شاعری میں اخلاقی تعلیمات بھی نمایاں ہیں۔ وہ سچائی، دیانت، صبر، شکر، قناعت اور عاجزی جیسے اوصاف کو انسان کے لیے ضروری قرار دیتے ہیں۔

7 دنیا کی ناپائیداری: عشق دنیا کی بے ثباتی کا بار بار ذکر کرتے ہیں۔ وہ انسان کو یہ احساس دلاتے ہیں کہ یہ دنیا چند روزہ ہے، اصل کامیابی آخرت کی کامیابی ہے۔

مومن نے جس طرح اپنے تخلص کو بامعنی طور پر استعمال کیا اور بعد کو میکش مرحوم نے خوب نباہا۔ اسی طرح ہمیں عشق کے پاس بھی یہ خصوصیت نظر آتی ہے۔ مثلاً ایک مقطع ہے:

آ کہ اے آرام جاں تجھ عشق نے غارت کیا
صبر و طاقت، عیش و راحت، خواب خود اور عقل و ہوش

عشق نے اپنے اس شعر میں کئی صنعتیں استعمال کی ہیں جیسے صنعت مبالغہ، صنعت تراکم، صنعت تضاد اور حسن تعلیل۔ ان صنعتوں کی وجہ سے اس شعر کا حسن اور دوبالا ہو گیا ہے۔ اسی طرح ان کا کلام صبر و رضا کا درس دیتا ہے۔ ان کے نزدیک غم انسان کو بلندی عطا کرتا ہے اور عشق انسان کو پاکیزہ بناتا ہے۔ یہ مقطع ملاحظہ ہو:

رکھتا ہوں اس لیے دل سوزاں و چشم تر
جیوں شمع درد و داغ سے عشق آفریدہ ہوں

عشق کا غم بظاہر تکلیف دہ ضرور ہے، مگر سچا عاشق اس غم میں بھی ایک عجیب سی روحانی لذت محسوس کرتا ہے، یہ لذت ہر کسی کو نصیب نہیں ہوتی، صرف وہی اسے سمجھ سکتا ہے اور محسوس کرسکتا ہے جو خود عشق کے درد سے گزرا ہو۔ ایک قطعہ بند دیکھیے جس میں عشق نے درد و لذت غم کی کیفیت کو بڑے خوبصورت انداز میں بیان کیا ہے:

اک اہل درد نے جا کے عشق سے پوچھا
کہ غم جو کھاتے ہیں لوگ اس میں کچھ مزا بھی ہے
کہا کہ ذائقہ غم ہے شہد سے شیریں
پر اس کو، لذت غم کا جو آشنا بھی ہے

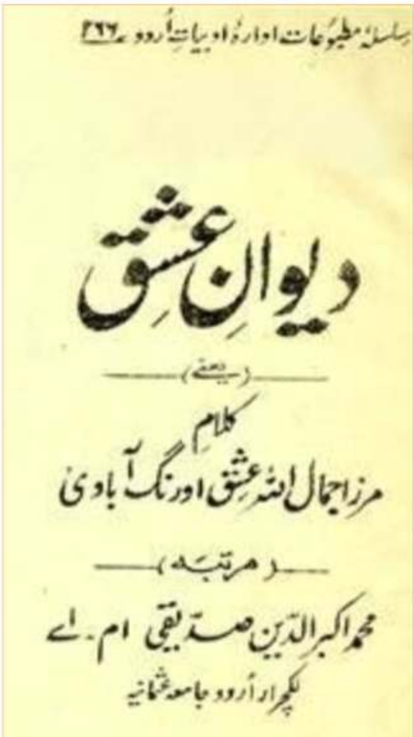
سلسلۂ مطبوعات ادارۂ ادبیات اردو ۲۶۶

دیوانِ عشق

(یعنی)

کلام

مرزا جمال اللہ عشق اورنگ آبادی

(مرتبہ)

محمد اکبر الدین صدیقی ام۔ اے

لکچرار اردو جامعہ عثمانیہ

ان اشعار میں انھوں نے عشق اور غم کے باہمی تعلق کو ایک سوال و جواب کی صورت میں پیش کیا ہے۔ ایک ایسا شخص جو عشق کے درد سے واقف نہیں، وہ عاشق سے پوچھتا ہے کہ لوگ جو غم کھاتے ہیں، کیا اس میں بھی کوئی مزا ہوتا ہے؟ یعنی عام انسان کے نزدیک غم صرف تکلیف، دکھ اور بربادی کا نام ہے، اس میں اسے کوئی خوشی یا لذت نظر نہیں آتی۔ عاشق اس کے جواب میں کہتا ہے کہ غم کا ذائقہ شہد سے بھی زیادہ میٹھا ہوتا ہے، مگر یہ مٹھاس صرف اسے ہی محسوس ہوسکتی ہے جو غمِ عشق سے آشنا ہو۔

عشق نے تشبیہیں بڑی نادر اور انوکھی پیش کی ہیں۔ ولی نے معشوق کا سراپا شعرا کے تخلص کی مناسبت سے کھینچا ہے اور ابرو کو ہلالی کہا ہے عشق نے بھی اپنے مضمون کو اس سے بلند لے جانے کی کوشش کی ہے۔ عشق اپنے کلام پر فخر کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ میرا ہر شعر اتنا خوبصورت ہے کہ وہ مشہور فارسی شاعر 'ہلالی' کے دیوان سے بھی زیادہ قابل رشک ہے۔ یعنی میرا کلام اس سے بھی اعلیٰ درجے کا ہے۔ یہ شعر دیکھیے:

کیا ہوں عشق میں تعریف اس مہ رو کے ابرو کی
ہر اک مصرع ہے میرا رشک دیوان ہلالی کا

اسی طرح عشق نے آنسوؤں کے تسلسل کو قافلۂ حجاز سے تشبیہ دی ہے۔

آتے ہیں کر کے کعبۂ دل کا طواف اشک
گویا کہ قافلہ ہے یہ اہل حجاز کا

یہ تشبیہ بڑی خوبصورت ہے۔ عشق نے آنسوؤں کے ذریعے دل کے گرد طواف کرنے کو کعبہ کے گرد طواف کے مشابہ قرار دیا ہے۔ طواف کعبہ عبادت وحبِ الٰہی کی علامت ہے۔ اسی طرح آنسوؤں کا طواف دل کی سچی توبہ، عشق اور ندامت کا اظہار ہے۔ یعنی آنسو روحانی قرب کا ذریعہ ہیں۔ یہ ایک گہری صوفیانہ تشبیہ ہے جو آنسو کو عبادت کے برابر سمجھتی ہے۔ اسی طرح انھوں نے آنکھ کو ایک جگہ کشتی کے مماثل قرار دیا ہے۔ کہتے ہیں:

جوشِ گریہ سے مری چشم کی حالت ہے تباہ
کشتی نوح پڑی موجہ طوفان کے بیچ

گویا سیلاب اشک طوفان نوح سے کم نہیں۔ اور یہ شعر۔

رعد ساں نعرہ کناں ابر سے گریاں ہیں ہم
آفرینش میں غرض آہ کے ساماں ہیں ہم

عشق حسنِ بیان، شیرینیِ گفتار اور محبوب کی دل نشیں گفتگو کو نہایت لطیف انداز میں بیان کرتے ہیں۔

بھرا ہے شہد کانوں میں سماعت کی حلاوت سے
کہوں کیا ذائقہ شیریں دہن کی خوش مقالی کا

عشق کہتے ہیں کہ محبوب کی میٹھی اور دل میں اتر جانے والی باتوں کی وجہ سے میرے کانوں میں گویا شہد بھر گیا ہے۔ یعنی اس کی آواز اور اس کی گفتگو اتنی لطیف، نرم اور شیریں ہے کہ سننے والا پوری طرح محظوظ ہو جاتا ہے۔ ''سماعت کی حلاوت'' سے مراد سننے کا لطف ہے۔ یعنی محبوب کی باتوں میں ایسی کشش اور مٹھاس ہے جو کانوں کو بھی سکون بخشتی ہے اور دل کو بھی مسرور کر دیتی ہے۔ عشق بیان کرتے ہیں کہ میں اس شیریں دہن محبوب کی خوش گوئی اور خوش کلامی کے ذائقے کو الفاظ میں بیان ہی نہیں کرسکتا۔ یعنی اس کی باتوں کی مٹھاس بیان سے باہر ہے۔ محبوب کی گفتگو شہد سے زیادہ میٹھی ہے۔ اس کی آواز میں ایسا جادو ہے جو سننے والے کو مسحور کر دیتا ہے۔ بعض کیفیات ایسی ہوتی ہیں جنھیں صرف محسوس کیا جاسکتا ہے، بیان نہیں۔ معشوق کو صندلی رنگ سے مشابہ قرار دیتے ہوئے صنعت ایہام میں ایک شعر کہا ہے:

کہتے نہ تھے کہ صندلی رنگوں کو دل نہ دے
تو کھینچتا ہے عشق یہ اب درد سر کہ ہم

عشق وفاداری، خودسپردگی اور درد کی انتہا کو نہایت خوبصورت پیکر میں پیش کرتے ہیں۔

میں اس کا رنگ نکالوں گا اشکِ خونیں سے
لگی ہیں آنکھیں ترے پاؤں پر حنا بھی ہے

عشق کہتے ہیں کہ اگر محبوب کے قدموں میں حنا نہ بھی ہو، تو میں اپنے خون آلود آنسوؤں سے اس کا رنگ پیدا کرلوں گا۔ یعنی میں اپنے دل کے درد، اپنی قربانی اور اپنی جان کی قیمت دے کر بھی محبوب کی خوشی کا سامان کروں گا''اشکِ خونیں'' سے مراد وہ آنسو ہیں جو شدتِ غم اور عشق کی انتہا سے خون کی طرح بہنے لگتے ہیں۔ یہ عاشق کی سچی محبت اور بے پناہ تکلیف کی علامت ہیں۔ اور ''آنکھوں کا پاؤں پر لگنا'' انتہائی عاجزی، نیاز مندی اور غلامی کی کیفیت کو ظاہر کرتا ہے۔ گویا عاشق اتنا عاجز ہو چکا ہے کہ وہ محبوب کے قدموں میں اپنی بینائی، اپنی آنکھیں تک قربان کرنے کو تیار ہے۔اس شعر سے عشق یہ پیغام دیتے ہیں کہ سچی محبت میں درد بھی عبادت بن جاتا ہے عاشق اپنے خون سے بھی محبوب کو سجاتا ہے۔عشق انسان کو انتہائی عاجزی اور قربانی کی منزل تک پہنچا دیتا ہے۔ مضامین کی بے ساختہ ادائی اور جدت ملاحظہ ہو:

آتش میں سر جھکا کر ثابت ہو جل مرے ہے
اتنا سا یہ پتنگا پر دل ہے کس بلا کا

محبوب کی جدائی کا دکھ کس شاعر نے بیان نہیں کیا، عشق کہتے ہیں۔

روتا ہے ہچکیاں لے ساقی بغیر مینا
ہے ناگوار ہم کو اس تلخ مئے کا پینا

یہ شعر غم، محرومی اور محبوب کی جدائی کے درد کو نہایت لطیف اور موثر انداز میں بیان کرتا ہے۔عشق کہتے ہیں کہ ساقی (جس سے شراب ملتی تھی یا جو خوشی دینے کا ذریعہ تھا) اب خود ہچکیاں لے لے کر رو رہا ہے، کیونکہ اس کے پاس 'مینا' یعنی شراب کا پیالہ موجود نہیں ہے۔ یہاں ساقی وہ خود بھی ہو سکتے ہیں اور لفظ 'مینا' محبوب کی علامت کے طور پر لیا جاسکتا ہے۔ اور وہ اس کڑوی شراب کو پینا ہرگز پسند نہیں کرتے۔ یہ تلخ مے دراصل غم، جدائی، تنہائی اور دکھ کی زندگی کی علامت ہے۔ عشق کی شاعری میں تشبیہات نہایت سادہ لیکن گہری ہیں۔ وہ زندگی کے روزمرہ مثالوں سے بڑے بڑے روحانی حقائق بیان کر دیتے ہیں۔ یہ شعر ملاحظہ ہو۔

گل کی چادر بن گلے لگتی ہے میری قبر کے
کیا قیامت ہے موئے پر بھی ستاتی ہے بہار

اس شعر میں موت، فنا اور دنیا کی بے ثباتی کی تصویر کھینچی گئی ہے۔گل کی چادر سے مراد وہ پھول ہیں جو قبر پر رکھے جاتے ہیں، مگر عشق نے اسے بھی بادِ بہار کی طرح متحرک بتایا ہے، یعنی موت کے بعد بھی زندگی کا تعلق فطرت سے باقی رہتا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ گناہوں پر آنسو بہائے جائیں تو کفارہ کا کام دیتے ہیں جیسے اقبالؔ نے کہا ہے کہ عرقِ انفعال نے معصومیت کی شان پیدا کردی۔عشق کا شعر ہے:

سفیدی کچھ جوتھی سو بھی مٹی ہیہات رونے سے
سیاہی نامہ اعمال کی کیا خاک دھوتے ہیں

اسی مفہوم کا ایک اور شعر ہے:

اور سیہ تر کیا یہ نامہ اعمال اپنا
عشق نے اشک ندامت ستی دھوتے دھوتے

یہ مصرعہ محاسبہ نفس اور اعمالِ صالحہ کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ ''نامۂ اعمال'' یعنی انسان کے اعمال کا ریکارڈ۔ عشق کہتے ہیں کہ وہ اپنے نامہ اعمال کو خاک سمجھتے ہیں یا ان کی کرتوت سے ان کے اعمال سیاہ ہوتے جاتے ہیں۔مطلب یہ کہ اعمال کی حقیقت اور اس کا اجر و سزا انسان کی حالتِ دل پر منحصر ہے اور آنکھوں کا سوز اس کے گناہوں کا کفارہ بن سکتا ہے۔

ویسے توعشق اورنگ آبادی اسد علی خاں تمنا کے معاصر تھے مگر معلوم نہیں کہ انہوں نے اپنے تذکرے "گل عجائب" میں اس گل سرسبد کا تذکرہ کیوں نہ کیا۔ مشک اور عشق چھپ نہیں سکے۔عشق کا کلام زمانہ کی دست برد سے محفوظ رہا اور اب ان کے اشعار اردو شاعری میں ایک بہترین اضافہ ہیں

تحریر پر ایک قطرہ بھی گرے تو سیاہی پھیل جاتی ہے اور سفید جگہ بھی سیاہ ہو جاتی ہے۔ اس سے زیادہ حقیقت اور واقعیت کیا ہو سکتی ہے۔غرض یہ کہ عشق کے کلام میں کسی چیز کی کمی نہیں۔

عشق کی شاعری میں منظر نگاری بھی ہے، زور بیان بھی اور محاوروں کا خوبصورت استعمال بھی مضامین کی جدت بھی ہے اور انوکھی طرز ادا بھی۔ وہ اپنے دور کے شعرا میں استاد کا درجہ رکھتے تھے۔ان کا کلام باطنی سوز، فکری اعتدال اور تہذیبی شائستگی کے باعث منفرد مقام رکھتا ہے۔ان کی شاعری میں کلاسیکی روایتوں کا رنگ غالب ہے، مگر ساتھ ہی وہ اپنے انداز بیان میں جدت بھی رکھتے ہیں، خصوصاً تشبیہات میں۔ان کا اسلوب نہایت سادہ، صاف اور دل نشیں ہے۔ ان کی زبان میں تصنع نہیں بلکہ سادگی کا حسن ہے۔ وہ کم الفاظ میں گہری بات کہنے پر قادر تھے۔ ان کا کلام عام قاری کو بھی آسانی سے اپنی طرف مائل کر لیتا ہے۔

ویسے تو عشق اورنگ آبادی اسد علی خاں تمنا کے معاصر تھے مگر معلوم نہیں کہ انھوں نے اپنے تذکرے ''گل عجائب'' میں اس گل سرسبد کا تذکرہ کیوں نہ کیا۔ مشک اور عشق چھپ نہیں سکے۔عشق کا کلام زمانہ کی دست برد سے محفوظ رہا اور اب ان کے اشعار اردو شاعری میں ایک بہترین اضافہ ہیں۔

مراجع ومصادر

1 محبوب الزمن تذکرہ شعرائے دکن، عبدالجبار ملکاپوری، جلد اول، مطبع رحمانی، حیدرآباد، سن اشاعت، 1911
2 دکنی شاعری تحقیق و تنقید۔ محمد علی اثر، دائرہ الیکٹرک پریس، چھتہ بازار، حیدرآباد، سن، 1988
3 دکن دیس کی پیش روغزلیں، اسلم مرزا، الانصار پبلی کیشنز، حیدرآباد، سن اشاعت، 2016
3 چمنستان شعرا، لچھمی نرائن شفیق اورنگ آبادی، مرتب: مولوی عبدالحق، انجمن ترقی اردو (ہند)، دہلی، سن اشاعت، 1928
4 دکنی ادب کی تاریخ محی الدین قادری زور، ادارہ ادبیات اردو، گلبرگہ، انڈیا، سن اشاعت، 1982

Kaleem Ahmad
Research Scholar
Jawahar Lal Nehru University
New Delhi-110067
Mob:8588008236
Email:kaleemjmi9@gmail.com

ناہید نظامی

سید نقی احمد ارشاد کی شاد شناسی

سید نقی احمد ارشاد خاندان شاد عظیم آبادی کے ان روشن چراغوں میں سے تھے جنھوں نے نہ صرف اس خانوادے کی علمی و ادبی روایت کو سنبھالے رکھا بلکہ اپنے عہد کی سماجی اور انتظامی زندگی میں بھی وقار کے ساتھ اپنا مقام قائم کیا۔ وہ اردو کے نامور شاعر شاد عظیم آبادی کے اکلوتے فرزند سید حسین خاں کے صاحبزادے تھے۔ نقی احمد ارشاد کی پیدائش 5 جولائی 1920 کو آبائی مکان شاد منزل، پٹنہ سٹی میں ہوئی۔ ان کی والدہ حسن آرا بیگم تھی۔ ان کا انتقال نقی احمد کی ولادت کے دوسرے ہی دن ہو گیا۔ یوں ارشاد نے آنکھ کھولتے ہی ماں کی شفقت اور محبت سے محرومی کا دکھ جھیلا۔ دوسری طرف والد سید حسین خاں ضعفِ دماغی میں مبتلا تھے، اس لیے باپ کی توجہ اور سرپرستی بھی انھیں پوری طرح میسر نہ آسکی۔

ایسے حالات میں شاد عظیم آبادی ہی ان کے لیے سراپا شفقت و محبت بن گئے۔ جب تک شاد باحیات رہے، ارشاد کو اپنی آغوش محبت میں رکھا۔ شاد کے انتقال کے وقت نقی احمد کی عمر محض دس برس تھی۔ گویا زندگی کے ابتدائی دس سال انھوں نے دادا کے سایہ شفقت میں گزارے۔ چونکہ ارشاد، شاد منزل ہی میں مقیم تھے، اس لیے شاد کی زندگی، عادات، علمی مشاغل اور خانگی حالات سے انھیں قریبی واقفیت حاصل رہی۔ اس دور میں معاشی حالت اس قدر ناگفتہ بہ تھی کہ روزمرہ کے خانگی اخراجات کی تکمیل بھی دشوار ہو گئی تھی۔ بعد ازاں ایسے حالات پیش آئے کہ نقی احمد کو شاد منزل چھوڑنے پر بھی مجبور ہونا پڑا۔ شاد عظیم آبادی کے انتقال کے وقت شاد منزل کی حالت نہایت خستہ ہو چکی تھی۔

سید حسین خاں کی وفات کے بعد سب سے بڑا مسئلہ نقی احمد کی تعلیم کا تھا۔ شاد عظیم آبادی کی شدید خواہش کے باوجود ان کے صاحبزادے اور خاندان کے دیگر بچے، جن میں شاد کے بھانجے سید نصیر حسین خاں خیال بھی شامل تھے، اسکولی تعلیم بھی مکمل نہ کر سکے۔ تاہم اس ضمن میں نقی احمد ارشاد نے سر فخر الدین اور عبد العزیز کے احسان کا اعتراف کیا ہے، جن کی سرپرستی اور توجہ سے نقی احمد اور ان کے بھائی سلطان احمد کو تعلیم حاصل کرنے کا موقع ملا۔ ارشاد نے یہ بھی تحریر کیا ہے کہ خان بہادر سید خیرات احمد کے صاحبزادے بیرسٹر سر سلطان احمد نے 1931 میں ان کے تعلیمی وظیفے کے لیے مسٹر فوکس، ڈائرکٹر پبلک ایجوکیشن، سے سفارش کی تھی، جو ان کی تعلیمی زندگی میں نہایت اہم موڑ ثابت ہوئی۔

تعلیمی میدان میں نقی احمد ارشاد نے اپنی غیر معمولی ذہانت اور محنت کا ثبوت دیا۔ انھوں نے 1936 میں پٹنہ سٹی ہائی اسکول سے میٹرک کا امتحان اول درجہ میں پاس کیا۔ اس کے بعد 1938 میں پٹنہ کالج سے آئی اے کیا اور 1940 میں پٹنہ یونیورسٹی سے آنرز کی تعلیم مکمل کی۔ بالآخر 1942 میں پٹنہ یونیورسٹی ہی سے تاریخ میں ایم اے کی ڈگری حاصل کی۔ تعلیم مکمل ہوتے ہی 1943 میں انھوں نے ملازمت اختیار کی اور سب ڈپٹی کلکٹر کے عہدے پر فائز ہوئے۔

ملازمت کے سلسلے میں نقی احمد ارشاد صوبہ بہار کے مختلف شہروں میں تعینات رہے اور دیانت، وقار اور انتظامی صلاحیت کے باعث مختلف مناصب پر فائز ہوئے۔ اگرچہ کتاب "شاد کا عہد اور فن" کے پہلے حصے میں ان کے سوانحی کوائف اجمالی طور پر درج کیے گئے ہیں اور اس کے مرتب اسمٰعیل حسنین نقوی نے تفصیلی طور پر ان کی جائے ملازمت کا ذکر نہیں کیا، تاہم ارشاد کی مختلف تحریروں میں موجود اشارات سے ان کی سرکاری خدمات کا نقشہ واضح ہو جاتا ہے۔

نقی احمد ارشاد نے مدھوبنی، دربھنگہ اور سنتھال پرگنہ میں مجموعی طور پر بارہ برس ملازمت انجام دی۔ 1952 سے 1959 کے دوران وہ چھپرہ، سیوان اور مدھوبنی میں برسرکار رہے۔ ان کی اہم تعیناتیاں اس طرح رہیں: 1952 میں فرسٹ کلاس جوڈیشیل مجسٹریٹ، چھپرہ؛۔ 1954 میں جوڈیشیل مجسٹریٹ، سیوان؛ 1957 میں ڈپٹی مجسٹریٹ، مدھوبنی؛ 1960 سے 1964 تک سینئر ڈپٹی کلکٹر، دمکا (سنتھال پرگنہ)؛ 1964 سے 1968 تک ایس ڈی او، مظفرپور؛ 1968 میں ڈپٹی مجسٹریٹ، دربھنگہ؛ اور فروری 1971 سے مئی 1976 تک ایڈیشنل کلکٹر، شاہ آباد (آرہ) نیز ڈپٹی ڈائرکٹر چکبندی کے عہدوں پر فائز رہے۔

اس عہد میں سرکاری ملازمت محض روزگار کا وسیلہ

نہیں تھی بلکہ ہر لمحہ جان کے خطرے سے دوچار رہنے کا نام بھی تھی۔ ملک کے طول وعرض میں فرقہ وارانہ کشیدگی، فسادات اور کشت وخوں کا ایسا سلسلہ جاری تھا کہ کہیں بھی تعیناتی ہو، عدم تحفظ کا احساس مستقل طور پر ساتھ رہتا تھا۔ ایسے پرآشوب ماحول میں نقی احمد ارشاد کے سر پر بیک وقت کئی ذمہ داریاں آن پڑی تھیں۔ ایک طرف انھیں اپنی سرکاری ملازمت کی ساکھ قائم رکھنی تھی، دوسری طرف کسی طرح ملازمت کو بچائے رکھنا بھی مستقل تشویش میں مبتلا رکھتا تھا، اور ساتھ ہی دل ودماغ میں شاد عظیم آبادی کے نام وکام کی بازیافت اور تحفظ کی دھن سوار رہتی تھی۔

ارشاد نے خود اپنے حالات کا نقشہ کھینچتے ہوئے نہایت کرب کے ساتھ لکھا تھا کہ 1942 میں ملازمت میں آنے کے بعد چھ سال ملازمت کے دوران فرقہ وارانہ زمانے میں جیسے کٹے، اسے ان کا دل ہی جانتا ہے۔ یہ بھی یقین نہ تھا کہ ملازمت رہتی ہے یا جاتی ہے، ہندوستان میں رہ پاتے ہیں یا نہیں۔ ان کا یہ بیان محض ذاتی شکایت نہیں بلکہ اس پورے عہد کی اجتماعی بے یقینی اور اضطراب کا ترجمان ہے۔ ایک نوعمر افسر کے لیے، جس کے پاس نہ مضبوط خاندانی سہارا تھا اور نہ مالی آسودگی، یہ اندیشے کہیں زیادہ شدید تھے۔ تاہم وقت کے ساتھ حالات کچھ سازگار ہوئے۔ ملازمت مستحکم ہوئی اور مالی حالت میں بھی بتدریج بہتری آنے لگی۔ یہی وہ مرحلہ تھا جب نقی احمد ارشاد نے اپنی زندگی کا ایک بڑا حصہ شاد عظیم آبادی کی تخلیقات کی تلاش، ان کی تدوین، اور شادفہمی کے فروغ کے لیے وقف کر دیا۔ انھوں نے شاد کے کلام اور نثر کو محض محفوظ کرنے پر اکتفا نہیں کیا بلکہ اس کے تاریخی، تہذیبی اور خاندانی پس منظر کو بھی واضح کرنے کی کوشش کی۔ شاد کی کئی ایسی تحریریں، اشعار اور حوالے ہیں جو ارشاد کی مسلسل جستجو اور محنت کے بغیر اردو دنیا تک پہنچ ہی نہ پاتے۔

اپنی تحریروں میں نقی احمد ارشاد نے جا بجا شاد منزل کے حالات، شاد کے شب وروز، ان کی نشست و برخاست، مزاج، اور نسب پر تفصیل سے گفتگو کی ہے۔ یہ محض تحقیقی مواد نہیں بلکہ ایک چشم دید گواہ کی روایت ہے، جس نے بچپن ہی سے ان سب مناظر کو اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا۔ شاد منزل کی فضا، وہاں کی علمی وادبی محفلیں، اور شاد کی شخصیت کے مختلف پہلو ارشاد کی یادداشتوں میں اس طرح محفوظ تھے کہ شاد کا عہد ایک زندہ حقیقت کی صورت میں قاری کے سامنے آجاتا ہے۔

بچپن سے جن حالات اور مشاہدات سے وہ گزرتے رہے، انھی کے باعث شاد عظیم آبادی سے ان کی دلچسپی محض خاندانی نسبت تک محدود نہ رہی بلکہ عمر بھر کی فکری اور تحقیقی وابستگی میں ڈھل گئی۔ یوں نقی احمد ارشاد نہ صرف شاد کے وارث تھے بلکہ ان کے معتبر راوی اور محافظ بھی ثابت ہوئے، جن کی کوششوں نے شاد کو محض ماضی کا شاعر نہیں رہنے دیا بلکہ اردو ادب کی زندہ روایت کا حصہ بنا دیا۔

اپنی تحریروں میں نقی احمد ارشاد نے جا بجا شاد منزل کے حالات، شاد کے شب وروز، ان کی نشست و برخاست، مزاج، اور نسب پر تفصیل سے گفتگو کی ہے۔ یہ محض تحقیقی مواد نہیں بلکہ ایک چشم دید گواہ کی روایت ہے، جس نے بچپن ہی سے ان سب مناظر کو اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا۔

نقی احمد ارشاد 1978 میں سرکاری ملازمت سے سبکدوش ہوئے۔ سبکدوشی کے بعد بھی علمی وادبی دلچسپی برقرار رہی، مگر 2005 کے بعد مسلسل علالت نے انھیں گھیر لیا۔ 4 مارچ 2008 کو پٹنہ میں ان کا انتقال ہوا۔ ان کی زندگی صبر، محنت، علم دوستی اور خاندانی روایت کی پاسداری کی ایک روشن مثال ہے، جو خاندان شاد عظیم آبادی کی تاریخ میں ہمیشہ یاد رکھی جائے گی۔

شاد کی حیات کے ضمن میں شاد کی خودنوشت کے مرتب مسلم عظیم آبادی کی کتاب ''شاد کی کہانی شاد کی زبانی'' ایک اہم حوالہ کی حیثیت رکھتی ہے۔ ارشاد نے لکھا ہے کہ مسلم عظیم آبادی ''شاد کی کہانی شاد کی زبانی'' کے سبب مشہور ہو گئے۔ شاد کے ذریعے انھیں سوانح لکھوائے جانے کے برسوں بعد اس کی اشاعت ہوئی۔

''جہاں تک مسلم عظیم آبادی کا سروکار ہے، شاد نے اپنی سوانح عمری ان کے حوالے 1921 میں کی تھی اور یہ کتاب چالیس سالوں کے بعد 1960 میں ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب کی عنایت سے شائع ہوئی، جن سے مسلم صاحب سے جامعہ ملیہ کی دوستی تھی۔ اس طویل عرصہ میں شاد کی تقریباً سبھی کتابیں شائع ہو چکی تھیں اور وہ غیر معروف ہستی نہ تھے جن کو مسلم صاحب کے قلم نے زندہ کیا۔ مسلم صاحب کی شہرت کی ضامن، شاد کی سوانح عمری ہوئی۔ پھر بھی مسلم صاحب لائق ستائش ضرور ہیں۔ ان کا سب سے بڑا کام یہ تھا کہ میری بار بار استدعا پر انھوں نے جناب کلیم الدین صاحب کو کلیات شاد کی ترتیب اور اس پر مقدمہ لکھنے کے لئے راضی کر دیا۔''[1]

لیکن شاد کے سلسلے میں ارشاد نے مسلم عظیم آبادی کی خدمات کی تعریف بھی کی ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ کلیات شاد کی اشاعت میں مسلم صاحب ایک متحرک قوت تھے۔ انھوں نے کلیم الدین احمد کو اس کام کے لیے آمادہ کیا تھا کہ وہ کلیات شاد کو مرتب کرنے کا بیڑہ اٹھالیں۔

''ان (مسلم عظیم آبادی) کا خط میرے پاس غالباً 1973 میں آرہ کے پتے سے آیا کہ کلیم صاحب راضی ہو گئے اور کچھ عرصہ کے بعد بہار اردو اکیڈمی کے پہلے سکریٹری جناب فضا شمسی کا خط آیا کہ تم شاد کا شعری سرمایہ کلیم صاحب کے حوالے کر دو۔ میں نے ایسا ہی کیا۔''[2]

اسی طرح جب حمید عظیم آبادی نے ''فکر بلیغ'' شائع کی تو اس میں کئی تنسیخ وترمیم کر دی۔

''میخانہ الہام'' کی اشاعت کے پہلے حمید عظیم آبادی نے ''فکر بلیغ'' جلد اول شائع کرائی تھی۔ جب کلیم صاحب کلیات مرتب کرنے لگے تو میرے دل میں یہ خیال آیا کہ حمید مرحوم کی شائع کردہ ''فکر بلیغ کا اقتباس بھی شائع کر دیا جائے۔

''میں نے حمید صاحب کی مرتبہ ''فکر بلیغ'' دیکھی۔ میں نے پایا کہ حمید صاحب نے کثرت سے کتر بیونت کر کے فکر بلیغ کو شائع کرایا تھا۔ اس میں ''باب المراثی'' کے علاوہ ہندی شاعری کے نمونے نہ تھے۔ سب حذف کر دیے گئے تھے۔ حالانکہ شاد نے بعض بعض ہندی کے دوہوں کا ترجمہ اپنے کلام میں پیش کیا ہے۔''[3]

یہ امر قابل غور ہے کہ ارشاد نے شاد کے ہندی کلام پر مضامین بھی لکھے اور مختلف کتابوں میں بھی اسے موضوع بنایا تھا۔ گویا یہ شاد کی شاعری کا ایک اہم جز

تھا، جس سے چشم پوشی کی گئی۔ مزید یہ کہ دوسروں کے ذریعے شاد کی مرتب کردہ کتابوں یا مجموعوں میں کیا ترمیم و تنسیخ یا اضافہ ہے اس میں کسی کو کوئی دلچسپی نہ تھی، بجز ارشاد کے۔ کیونکہ وہ ہمیشہ یہ چاہتے رہے کہ جو کچھ شاد کی زندگی، خاندان اور کلام کے سلسلے میں دنیا کو بتایا جائے وہ مبنی برحقیقت رہے۔ ایسا شاید ممکن ہی نہ تھا کہ شاد کے قلمی نسخوں، یا ان کی حیات میں شائع ہو چکی بوسیدہ کتابوں کی ورق گردانی کر کے کوئی نئی مرتب کردہ کتابوں کا موازنہ کرتا۔ اس لحاظ سے ارشاد نے یقیناً اہم کام کیا ہے۔

تاریخ کے معاملے میں کوتاہیاں یا غلطیاں تذکروں میں عام ہیں۔ قدیم زمانوں کے بڑے بڑے اردو کے تخلیق کار کے یہاں بھی اس قسم کے تسامحات موجود ہیں۔ ارشاد کا نکتہ یہ ہے کہ شاد کی جن تصانیف میں تاریخی اغلاط کی نشاندہی کی جاتی رہی ہے ان کی تصنیف کے وقت شاد کی عمر ستر سے زیادہ تھی۔ گھر کے معاملات بھی ابتر تھے۔ سرمایہ محدود تھا، وسائل محدود تھے۔ زیادہ تر تاریخی اندراجات حافظے پر بھروسہ کر کے رقم کیے گئے۔ ایسے میں غلطیوں کا امکان ہے اور یہ کوئی حیرت انگیز بات نہیں ہے۔ اسی طرح کوئی بڑا فنکار اگر اپنی یا اپنے خاندان کی بڑائی بیان کرتا ہے تو اسے برائی پر محمول نہیں کیا جا سکتا کیونکہ یہ ایک خاص نفسیاتی الجھن کا نتیجہ ہوتا ہے۔ ''کلیات شاد'' میں کلیم الدین احمد نے اس پہلو پر بخوبی روشنی ڈالی ہے۔ قاضی عبدالودود کے اعتراضات کی کھلے بندوں مخالفت کرنے کے بجائے کلیم صاحب نے نپے تلے لفظوں میں شاد کی نفسیات کو اس طرح سمجھنے کی کوشش کی ہے کہ اس کے بعد قاضی صاحب کے اعتراضات ہی بے معنی ہو جاتے ہیں۔

''شاد بھی اپنے فن کے بل پر ابھرے لیکن ان کے Complexes اتنے زیادہ اتنے پیچیدہ اور اتنے مضبوط تھے کہ وہ اس وہم کی دنیا سے کل آزادی حاصل نہ کر سکے۔ جہاں تک ان کی شاعری کا سوال ہے اور یہی ان کا طرہ امتیاز ہے وہ انھیں اس وہم کی دنیا سے نکال کر عرش نشیں بنا دیتی ہے۔ لیکن شاعری کے علاوہ ان کی زندگی اسی World of phantasy میں بسر ہوئی۔ اس دنیا کی خوبی یہ ہے کہ ساری ناممکن چیزیں ممکن ہو جاتی ہیں، وہ خواہشیں، تمنائیں، امنگیں جو پوری نہ ہو پائی تھیں یہاں پھلتی پھولتی ہیں۔ اس دنیا اور ہماری روزمرہ کی دنیا میں کوئی مشابہت نہیں۔ یہاں دنیوی قوانین و احکام کا گزر نہیں۔ یہاں ممکن، ناممکن، سیاہ سفید، بلندی پستی، سچ جھوٹ، غرض کسی تضاد کا گزر نہیں۔ ناممکن شے ممکن بن جاتی ہے، سیاہی سفیدی نظر آتی ہے، بلندی اور پستی ایک ہی سطح پر ہوتی ہیں۔ اور جھوٹ اور سچ کا فرق مٹ جاتا ہے۔ ہر امید بر آتی ہے، ہر تمنا پوری ہو جاتی ہے، ہر مقصد حاصل ہو جاتا ہے۔ یہ نفسیاتی حقیقت ہے۔''4

یہ مکمل عبارت ایک ایسے پس منظر کی تشکیل کرتی ہے جس میں شاد کا وجود ہی مچلتا ہوا نظر آتا ہے۔ اردو ادب کی تاریخ میں یہاں شاد کے علاوہ کئی دوسرے اصحاب فن بھی محسوس کیے جا سکتے ہیں۔ اسی پس منظر

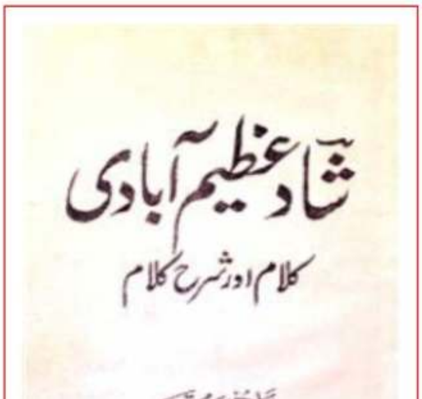

کے بیان کے بعد کلیم الدین احمد کہتے ہیں کہ:

''اگر اس نفسیاتی حقیقت کو ہم دھیان میں رکھیں تو بہت ساری باتیں جو شاد سے متعلق اعتراضاً کہی جاتی ہیں ہماری سمجھ میں آجائیں گی۔ میں نے کہا ہے کہ شاید عالی خاندان اور رئیس ہونا بڑا شاعر ہونے سے شاد کے خیال میں زیادہ اہمیت رکھتا تھا۔ اگر یہ بات پیش نظر ہے تو پھر محمد مسلم صاحب کے استعجاب میں ہم شریک نہ ہو سکیں گے۔''5

مسلم عظیم آبادی نے برسوں بعد شاد کی سوانح کو شائع کرنے کا فیصلہ کیا تو اس وقت تک ان کے ذہن کی جو روش تھی اس کے بارے میں ارشاد کے محولہ بالا بیان پر غور کرنا ہی کافی ہے۔ کلیم الدین احمد نے بھی مسلم عظیم آبادی کے اس ذہنی رجحان کی گرفت کی ہے۔ ان کے الفاظ ہیں کہ:

''وہ (مسلم عظیم آبادی) لکھتے ہیں کہ ان (شاد) کی آرزو یہ تھی کہ ان کے آبا و اجداد، دادا، دادی، نانا، نانی، چاروں کے کل کامل شجرے، خاندانی و تاریخی حالات اسی صراحت سے مذکور ہوں جیسی انھوں نے لکھ رکھی تھیں۔ پھر اپنی ریاست کی شان و شوکت، حکام رسی، وفاداری، سیاسی و سماجی کارگزاریاں، حکام رسی، وفاداری، میونسپل بورڈ اور ٹکسٹ بک کمیٹی کی ممبری، کورٹ آف وارڈس کی مہتممی، آنریری مجسٹریٹی، خان بہادری اور حکام انگریزی کی قدر افزائی، تحسین سندات کا بیان بالتصریح ہو۔ میں ایک اعلیٰ درجہ کے شاعر اور ادیب کے لیے یہ تصریحات لایعنی سمجھتا تھا۔''6

جبکہ شاد نے خود سوانح لکھوائی تو دیانتداری کا تقاضہ یہ تھا کہ شاد نے جو کہا یا لکھایا وہ بعینہ پیش کر دیا جاتا، اس میں تصرف نہیں کیا جاتا۔ لیکن جس طرح شاد کے انتخاب کلام میں حمید عظیم آبادی نے اپنے ذوق کو پیش نظر رکھا، اسی طرح مسلم عظیم آبادی نے کیا کہنا ہے کیا نہیں کے اپنے معیار کو سامنے رکھا۔ یہ سب ایسے نکات تھے جنھوں نے ارشاد کو اس کام کے لیے آمادہ کیا کہ شاد کی تشکیل نو کی جائے تا کہ اصل شاد کی شخصیت نمایاں ہو سکے۔ اس معاملے میں ارشاد ہر لحاظ سے کامیاب ہوئے ہیں۔

''یادگار شاد'' میں نقی احمد ارشاد نے شاد کی تصانیف کی جو فہرست پیش کی ہے اس میں کئی ایسی تخلیقات ہیں جو طبع نہ ہو سکیں لیکن جنھیں ارشاد نے خود دیکھا اور پڑھا تھا۔ یہ تفصیل ایسی ہے جو ارشاد کے علاوہ کہیں اور نہیں ملتی، اگر ملتی بھی ہے تو ارشاد کے حوالے سے ہی، یا ان کی نشاندہی کے مطابق ہی۔ ایسی تخلیقات بھی ہیں جن کا علم کسی وسیلے سے ارشاد کو تھا، لیکن انھیں انھوں نے خود نہیں دیکھا تھا۔ مثلاً، لکھتے ہیں کہ:

شان اعظم: غیر مطبوعہ۔ یہ ایک نظم ہے جس میں شرح مسلم کے ابتدائی فقروں کی شرح کی گئی ہے۔ راقم نے نہیں دیکھا ہے۔

حمریہ بن غارص: اصل قصیدہ عربی میں ہے۔ یہی پہلا قصیدہ عربی میں ہے۔ نعت جو بطور تلازمہ خمریات میں کہا (کذا) گیا تھا۔

علویہ: نظم غیر مطبوعہ۔ تین سو اشعار۔ راقم نے نہیں دیکھا ہے۔

ملفوظات رام: غیر مطبوعہ۔ مقدس رام کے بن باس ہونے کے وقت کا نقشہ اور رام کی تقریر نظم کی ہے۔

کتاب لاپتہ کردی گئی۔
ملفوظات کرشن جی: گیتا کے کچھ حصوں کا ترجمہ۔ 1923 میں رائے برج راج کرشن صدر بہار اسمبلی کے یہاں پڑھی گئی تھی۔ اصل مسودہ غائب ہوگیا۔
نحو منظوم: غیر مطبوعہ اردو۔ وغیرہ۔[7]

واضح ہو کہ یہ تفصیلات وہاب اشرفی کی کتاب کی اشاعت سے بہت قبل پیش کی گئی تھیں۔ انھوں نے ارشاد کی ہی پیش کردہ تفصیلات کی بنیاد پر خدا بخش لائبریری میں شاد کے مخطوطوں کو دیکھا تھا۔ ارشاد کے لیے یہ امر تکلیف کا باعث رہا کہ شاد شناسی میں ان کی خدمات کا فائدہ تو سب نے اٹھایا لیکن اس کا اعتراف کرنے میں لوگوں نے کوتاہی کا مظاہرہ کیا۔ بظاہر اس کا سبب یہ تھا کہ شاد کی ہی مانند وہ بھی سچے واقعات کو اس طرح لکھ جاتے تھے کہ لوگوں کی تیوریاں چڑھ جاتی تھیں۔

چونکہ وہ خانوادہ شاد کے روشن چراغ تھے، اس لیے شعر و ادب سے گہری ذاتی دلچسپی رکھتے تھے۔ دادا مرحوم کے نقشِ قدم پر چلتے ہوئے انھوں نے بھی شعر و شاعری اور نثر نگاری کے ذریعے اپنے ادبی ذوق کا اظہار کیا۔ بنیادی طور پر وہ شاد شناسی کے ایک اہم اور موثر محرک کی حیثیت رکھتے ہیں۔ شاد کی تحریروں کو نئی زندگی بخشنے کے ساتھ ساتھ خود بھی اپنے ذوق ادب کو مسلسل جلا بخشتے رہے۔ انھوں نے مرثیے بھی لکھے، غزلیں بھی کہیں، ترجمے کیے اور تنقیدی مضامین بھی قلم بند کیے۔ ان کے متعدد مضامین مختلف رسائل میں منتشر صورت میں موجود ہیں۔

عطاء الرحمٰن کاکوی، قاضی عبدالودود، اور وہاب اشرفی وغیرہ نے شاد کی تحریروں میں ارادی طور پر یا غیر ارادتاً لکھی غلطیوں کی نشاندہی کی ہے۔ ان میں سے بعض یقیناً کوتاہیاں تھیں، تو بعض کے سلسلے میں غلط بیانات بھی دیے گئے۔ ان سب کی ابتدا دراصل قاضی صاحب کے ذریعے کلام شاد کی اشاعت پر شاد کے ردعمل اور پھر شاد کی کہانی کی اشاعت کے بعد ہوئی۔ ارشاد نے حتی الوسع یہ کوشش کی کہ شاد کا دفاع کرسکیں۔ اس خیال کے تحت انھوں نے جملہ اعتراضات میں سے ان اعتراضات کے جواب دیے جن کے لیے ان کے پاس مناسب شہادتیں تھیں، جن باتوں کو وہ رد نہیں کرسکے، ان کے بارے میں ارشاد کے یہاں خاموشی ملتی ہے۔ اس کا ذکر وہاب اشرفی نے بھی کیا ہے:

بنیادی طور پر وہ شاد شناسی کے ایک اہم اور موثر محرک کی حیثیت رکھتے ہیں۔ شاد کی تحریروں کو نئی زندگی بخشنے کے ساتھ ساتھ خود بھی اپنے ذوق ادب کو مسلسل جلا بخشتے رہے۔ انھوں نے مرثیے بھی لکھے، غزلیں بھی کہیں، ترجمے کیے اور تنقیدی مضامین بھی قلم بند کیے۔ ان کے متعدد مضامین مختلف رسائل میں منتشر صورت میں موجود ہیں۔

''میں نے شاد کی ناول نگاری، سوانح نگاری، تذکرہ نگاری، مکتوب نگاری اور تاریخ نویسی کے باب میں بہت سارے ایسے گوشے روشن کیے ہیں جن سے شاد کی غلط بیانیاں ابھر جاتی ہیں۔ ان پر کچھ لکھنا جناب نقی ارشاد نے ضروری نہیں جانا۔ کیا وہ ان تمام اعتراضات کو مان چکے ہیں جن کے بارے میں ایک لفظ بھی لکھنا انھوں نے پسند نہ کیا؟ افسوس یہ ہے کہ جناب نقی احمد ارشاد مجھے شاد کے سلسلے میں دفاعی وکیل تصور کرتے تھے اور میں صرف ایک محقق تھا۔''[8]

گرچہ ارشاد نے تحقیقی دقت نظری کے شواہد پیش کیے ہیں، ان کے یہاں شاد کے سلسلے میں کبھی کبھی ہمدردانہ نقطہ نظر بھی ملتا ہے۔ لیکن جن معاملات کے ان کے پاس شواہد موجود تھے ان کے ضمن میں گفتگو کے دوران ارشاد کا انداز بسا اوقات جارحانہ بھی ہوجاتا ہے۔ جب انھیں یہ محسوس ہوتا ہے کہ تاریخی شواہد کی موجودگی کے باوجود محض مخالفت کی غرض سے شاد کی مخالفت کی جارہی ہے تو یہ ان کے لیے تکلیف کا باعث بن جاتا تھا۔ ایسے میں انھیں یہ توقع بھی رہتی تھی کہ انھیں ان کا کوئی ہمنوا مل جائے۔ لیکن ایسا بہت کم ہوا۔ شاد کے مخالفین، معترضین، ناقدین کے سلسلے میں ان کا بیان ہے کہ:

''چاہے آزاد ترجمہ ہو، یا سرقہ، چاہے جو بھی ہو، شاد کا مقصد ہی اور تھا۔ وہ ریفارم چاہتے تھے اور اردو کو نئے اسلوب سے آشنا کرنا چاہتے تھے۔ نہ انھوں نے تاریخ بحیثیت مورخ لکھی اور نہ ناول بحیثیت ناول نگار۔ وہ ہر طرح سے قوم کی بہبودی اور فلاح چاہتے تھے۔ لطف یہ ہے کہ جو مورخ ہیں، شاد کی تاریخ نگاری پر ناک بھوں چڑھاتے ہیں، جو ناول نگار ہیں یا افسانوی ادب سے دلچسپی رکھتے ہیں، وہ شاد کے ناولوں میں نئی تکنیک کی تلاش کرتے ہیں۔

شاد اول و آخر صرف ایک شاعر تھے اور مصلح قوم۔ صرف مورخ یا صرف ناول نگار نہ تھے۔ اصلاحی جذبے کے تحت ہر فن میں انھوں نے اپنے نقوش چھوڑے۔ اس سے زیادہ ان کا مقصد اور نہ تھا۔''[9]

یہ بہر حال ایک حقیقت ہے کہ نقی احمد ارشاد نے اگر شاد کے کلام اور نثری تحریروں کو یوں دنیا کے سامنے پیش نہ کیا ہوتا تو آج شاد کی بہت سی تخلیقات گوشہ گمنامی میں پڑی رہتیں۔ اسی طرح شاد کے ذاتی احوال، ان کے خاندان کی تفصیلات، ان کے گھر کے انداز و اطوار، رہائش، خانگی معاملات، صحبتیں، مالی حالات وغیرہ سے واقفیت ارشاد کی تحریروں کے سبب ہی ہوئی ہے۔ وگرنہ صرف شاد کے مکتوبات بنام ہمایوں مرزا کی بنیاد پر شاد کی شخصیت اور روز و شب کی کہانیاں بیان کی جاتی رہیں۔ ہمایوں مرزا کے نام لکھے خطوط میں بھی ایسی کئی باتیں ہیں جنھیں ارشاد نے قطعیت کے ساتھ رد کیا ہے، اور ایک چشم دید کی مانند واقعات کا بیان کیا ہے۔

خود ارشاد جن حالات سے گزرے تھے، ان کے مدنظر یہ کہنے میں کوئی تامل نہیں ہوسکتا کہ انھوں نے شاد کی ہی نہیں، اجداد شاد کی بھی علمی وراثت کو محفوظ رکھنے کا بڑا کارنامہ انجام دیا ہے۔ لیکن انھیں اس کا صلہ کیا ملا، یہ ان کی ہی درج ذیل عبارت سے واضح ہے:

'' قومی تنظیم، پٹنہ میں ایک مضمون شائع ہوا تھا کہ شاد نے جو کچھ خدمت کی وہ مسلم عظیم آبادی اور کلیم الدین احمد نے... (عبارت مبہم ہے۔ ممکن ہے جو لکھا گیا ہو اس کا مفہوم یہ ہو کہ مسلم عظیم آبادی اور کلیم الدین احمد نے شاد کی خدمات سے اردو والوں کو روشناس کیا)۔

ان دونوں بزرگوں کی کاوشیں یقیناً قابل ستائش ہیں۔ مگر سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ میں نے جو شاد کی پندرہ تصانیف اپنے خونِ جگر کو صرف کر کے تیار اور مرتب کر کے شائع کرایا، اس کے بارے میں کیا کہا جاتا ہے۔ اگر میں یہ تصانیف شائع نہ کراتا تو کیا کلیم صاحب یا کوئی اور صاحب کلیات کو مرتب کر سکتے تھے۔'' 10

شاد کے نجی حالات کے ذکر میں نقی احمد ارشاد نے ایسی کئی باتیں قلمبند کی ہیں جنھیں اگر وہ نہ بتاتے تو کسی کو واقفیت نہ ہوتی۔ اس لحاظ سے گرچہ حمید عظیم آبادی کو شاد نے سوانح عمری کا راوی بنایا، حقیقت حال یہ ہے کہ ارشاد ہی صحیح معنوں میں ان کی حیات کے اصل نباض ثابت ہوئے۔ وہ لکھتے ہیں کہ شاد دو کام کے بہت شوقین تھے۔ پہلا کام تھا گھر بنوانا۔ بار بار اس کی مرمت اور توسیع وغیرہ میں دلچسپی لیتے تھے۔ دوسرا شوق شعر و شاعری کا تھا۔

''اس میں بھی ترمیم، توسیع، تنسیخ کا ہمیشہ ولولہ رہا۔ یہ کاوش گو ان کے یا ان کی اولاد کے کام نہ آئی، اردو ادب کے کام ضرور آئی۔ ..ہمیشہ شب کو اساتذہ کے کلام پڑھتے تھے اور عروض و ادب کی کتابیں دیکھا کرتے تھے۔ فارسی گو شعرا میں خسرو اور حافظ کے مطبوعہ دیوانوں کے حاشیے پر مہین مہین حرفوں میں نوٹ لکھ دیتے تھے۔ اردو گو شعرا میں مرزا داغ کے مطبوعہ جلوۂ داغ کے حاشیوں پر طویل طویل نوٹ تھے۔ یہ دیوان کچھ تو ان کی علالت کے زمانے میں غائب ہو گئے اور کچھ بعد کو جب والد مرحوم کی تیسری اہلیہ کا دور دورہ تھا، اس وقت غائب ہوئے۔'' 11

یوں ارشاد نے بچپن میں جو کچھ مشاہدہ کیا اسے قلمبند کر دیا۔ یہ ایسے معاملات تھے جن کے بارے میں گھر کا فرد ہی بتا سکتا تھا۔

ارشاد نے اس حقیقت کا بیان اپنی بیشتر تحریروں میں کیا ہے کہ کلیم الدین احمد کے مرتب کردہ ''کلیات شاد'' کے لیے شاد کے کلام کی فراہمی میں ان کا کردار سب سے اہم رہا ہے۔ خود کلیم صاحب نے ارشاد کی اس خدمت کا کھلے دل سے اعتراف کیا ہے۔ ارشاد کے لیے یہ معاملہ پریشان کن رہا کہ کلیم الدین احمد کے اعتراف کے باوجود اردو کے ناقدین و محققین اس سلسلے میں ان کی جانفشانی کا ذکر نہیں کرتے ہیں۔ یہی نہیں، وہ ان کا نام لینے سے بھی دامن بچا کر گزر جاتے ہیں۔ ایسے چند بیان ملاحظہ کیجیے:

''کلیم صاحب نے البتہ کلیات کا مقدمہ بڑی دیدہ ریزی اور سخت محنت سے لکھا ہے۔ اس کا معاوضہ، چھ ہزار کی صورت میں ملا۔ میری تسلی اور تشفی یوں ہوئی کہ میرے دادا کا کل کلام چھپ گیا جن کو میں پچیس سالوں سے ڈھوتا پھرتا تھا اور جن کا بجز میرے کوئی پوچھنے والا

نہ تھا۔ شاد کی وصیت تھی کہ کلام شاد کی اشاعت کے پہلے ان کی کتاب فکر بلیغ، جلد اول شائع کی جائے تا کہ لوگ ان کے اصول شاعری سے آگاہ ہوں۔ چنانچہ اپنی زندگی میں انھوں نے غزلیات ریاض عمر کے 61 صفحے اور فکر بلیغ، جلد اول کے 61 صفحے شائع کرائے تھے جس کا حوالہ جناب قاضی عبدالودود صاحب اپنے یہاں جلد دوم کلیات میں دیتے ہیں۔'' 12

اس عبارت سے واضح ہے کہ ارشاد کی نگاہوں میں ان جانفشانیوں کی کتنی اہمیت تھی۔ اور یہ حقیقت بھی ہے کہ ان کے اس علمی تعاون کے بغیر شاد کا بہت سا قیمتی سرمایہ ضائع ہو گیا ہوتا۔

''کلیات شاد'' کی تدوین کے سلسلے میں کلیم الدین احمد نے جن مآخذ کے لیے نقی احمد ارشاد کے تعاون اور معلومات کا صراحت کے ساتھ حوالہ دیا ہے، ان کی فہرست بذات خود اس حقیقت کی گواہ ہے کہ شاد عظیم آبادی کے کلام کی بازیافت اور تحقیق میں ارشاد کا کردار کس قدر بنیادی اور ناگزیر تھا۔ ان مآخذ میں ''کلیات شاد (جلد سوم)''، ''دیوان اول''، ''ریاض عمر''، ''دیوان ہفتم''، ''شاد عظیم آبادی: کلام اور شرح کلام''، ''رباعیات شاد عظیم آبادی''، ''دیوان غزلیات شاد''، ''منظومات شاد عظیم آبادی'' وغیرہ شامل ہیں۔ یہ فہرست محض کتابوں کے نام کی نہیں بلکہ اس وسیع تحقیقی سرمائے کی طرف اشارہ کرتی ہے جس تک رسائی نقی احمد ارشاد ہی کے توسط سے ممکن ہو سکی۔

یہ حقیقت نہایت معنی خیز ہے کہ کلیم الدین احمد جیسے سخت گیر، بے لاگ اور اصول پسند نقاد کے لیے بھی نقی احمد ارشاد کی فراہم کردہ معلومات سند اور حوالہ کی حیثیت رکھتی تھیں۔ کلیم الدین احمد نے ''کلیات شاد'' کے غیر مطبوعہ مآخذ کی تفصیل بیان کرتے ہوئے خاص طور پر نقی احمد ارشاد کے محفوظ کردہ سرمایۂ مخطوطات کا ذکر کیا ہے۔ ان کے بیانات سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ شاد عظیم آبادی کے سلسلے میں ارشاد کی فراہم کردہ تفصیلات محض ضمنی معلومات نہیں بلکہ تحقیق کی بنیاد اور متن کی صحت کا ضامن تھیں۔

مراجع

1 ارشاد، سید نقی احمد۔ 'کلیات شاد اور حقیقت حال'۔ زبان و ادب، اکتوبر تا دسمبر 2007، ص 11۔
2 ایضاً۔ ص 11۔
3 ایضاً۔ ص 10۔
4 احمد، کلیم الدین۔ (مرتب)۔ کلیات شاد۔ پٹنہ، بہار اردو اکادمی۔ 1975، ص 106۔
5 ایضاً۔ ص 106۔
6 ایضاً۔ ص 106۔
7 ارشاد، نقی احمد۔ یادگار شاد۔ پٹنہ۔ 1959، ص 94۔
8 اشرفی، وہاب۔ 'جناب نقی احمد ارشاد کے تبصرے کا جواب'۔ معیار و تحقیق۔ پٹنہ، ادارہ تحقیقات اردو۔ 1991، ص 761۔
9 ارشاد، نقی احمد۔ شاد کا عہد اور فن (حصہ اول)۔ (مرتب) اسمعیل حسنین نقوی۔ پٹنہ، شاد عظیم آبادی میموریل کمیٹی۔ 1982، ص 184۔
10 'کلیات شاد اور حقیقت حال'۔ ایضاً۔ ص 9۔
11 ارشاد، نقی احمد۔ 'شاد کی غنائیت اور جدت'۔ زبان و ادب۔ فروری مارچ 1979، ص 43۔
12 'کلیات شاد اور حقیقت حال'۔ ایضاً۔ ص 10۔

Nahid Nizami
Research Scholar,
Deptt. of Urdu
Jai Prakash University
Chhapra (Bihar)
Mob.:9572409023
wasinahid1@gmail.com

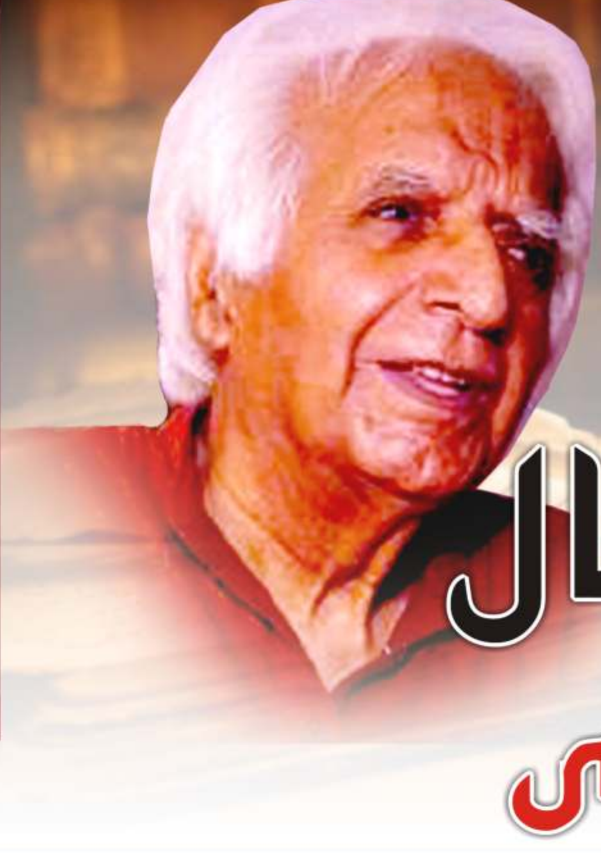

جوگندر پال کی افسانہ نگاری

مجیب احمد خان

اردو افسانے کی تاریخ میں جوگندر پال کا نام ایک منفرد اور وقیع مقام کا حامل ہے۔ افسانہ ان کے لیے محض ایک ادبی اظہار نہ تھا، بلکہ عہد کے عصری، معاشی اور نفسیاتی مسائل کو سمجھنے اور برتنے کا ایک معنوی وسیلہ تھا۔ ان کی شخصیت کی تشکیل میں ہجرت کے تجربات، طبقاتی کشمکش، متوسط طبقے کی محرومیاں، روزگار کی جدوجہد، جنگ کے اثرات اور ہندوپاک کے معاشرتی حالات نے بنیادی کردار ادا کیا۔ جوگندر پال کی ذات میں ایک طرف فنکارانہ لطافت ہے، تو دوسری طرف زندگی کو معروضی حقیقتوں کے آئینے میں دیکھنے کا حوصلہ بھی۔ یہی اوصاف ان کی شخصیت کو اردو ادب میں ایک معتبر اور جاذب مطالعہ وجود بناتے ہیں۔

جوگندر پال ستمبر 1925 میں سیالکوٹ میں پیدا ہوئے، جہاں ابتدائی تعلیم گنڈا سنگھ ہائی اسکول سے ہوئی اور پھر مرے کالج سیالکوٹ سے بی اے تک کے مراحل طے کیے۔ تعلیم میں تسلسل برقرار رہا لیکن تقسیم ہند کے بعد خاندان انبالہ منتقل ہوگیا۔ والد نے وہاں دودھ کی دکان اور ڈیری فارم قائم کیا جس میں جوگندر پال نے باقاعدہ کام کیا۔ ایم اے انگلش کے طالب علم ہونے کے باوجود صبح سویرے دور دراز گاؤں سے دودھ لانا ان کی روز مرہ کی مشقت تھی۔ گھر کی معاشی صورتحال انتہائی مشکل تھی اور یہی ماحول ان کی شخصیت اور احساس ذمہ داری کو شکل دیتا چلا گیا۔ اسی دوران ان کی زندگی کا ایک اہم موڑ اس وقت آیا جب ان کے ہونے والے سسرالی رشتہ دار بَر کی تلاش میں انبالہ پہنچے۔ جوگندر پال کا انتخاب بنیادی طور پر اس لیے کیا گیا کہ وہ کینیا جانے کے قابل تھے۔ حالانکہ ان کی

جوگندر پال ستمبر 1925 میں سیالکوٹ میں پیدا ہوئے، جہاں ابتدائی تعلیم گنڈا سنگھ ہائی اسکول سے ہوئی اور پھر مرے کالج سیالکوٹ سے بی اے تک کے مراحل طے کیے۔ تعلیم میں تسلسل برقرار رہا لیکن تقسیم ہند کے بعد خاندان انبالہ منتقل ہوگیا۔

شادی کا واقعہ اتنا سادہ نہیں، شہزاد منظر کے مضمون کے مطابق جوگندر پال خود اپنی شادی کے متعلق رقمطراز ہیں:

”... پھر میں کینیا چلا گیا۔ وہ ایسے کہ میری ہونے والی بیوی کے ماں باپ بر کی تلاش میں انبالہ آئے ہوئے تھے۔ ہم ان کے ساتھ بر ڈھونڈتے رہے۔ بر کی تلاش میں ہم نے بھی ان کا ساتھ دیا۔ انھیں لڑکا آخر مل گیا۔ وہ لڑکا میں تھا۔ انھیں میں اس لیے پسند آ گیا کہ انھیں ایک ایسا ضرورت مند لڑکا چاہیے تھا جو ان کے ساتھ کینیا جا سکے۔ میں اب بھی اپنی بیوی سے کہتا ہوں کہ لوگ تو بیوی کی ڈولی لاتے ہیں، تم میری ڈولی لے گئی۔“[1]

پروفیسر ارتضٰی کریم کی مرتب کردہ کتاب میں جوگندر پال کی بیوی کرشنا پال تفصیل سے رقمطراز ہیں:

”عجیب اتفاق ہے، جوگندر پال کو کیا پتہ تھا کہ جس لڑکی کے لیے وہ جی جان سے میرے بھائیا جی (والد) کی مدد کر رہا تھا، دس دن بعد خود اسی سے شادی کرنے پر راضی ہو جائے گا۔ 1948 میں کینیا کی اور لڑکیوں کی طرح میں بھی اپنے ماں باپ کے ساتھ ایک پڑھا لکھا نوجوان امپورٹ کرنے نیروبی سے پہلی بار بھارت آ دھمکی۔ انبالہ کینٹ سے ایک لیکچرار کا خط پا کر میرے بھائیا جی بڑی امید سے انبالہ شہر اپنے ایک رشتہ دار کے یہاں جا پہنچے، جہاں ان کے بیٹے جوگندر پال کو اس لیکچرار سے ملوانے کا ذمہ سونپا گیا۔ پال

نے کڑی دھوپ میں پورا دن بڑی کوشش کی اس نوجوان کو ڈھونڈ کر بھائیا جی سے ملوانے کی لیکن پتہ چلا کہ وہ ایک Fake لیٹر تھا۔ پال کے بھائی کے پرخلوص اطوار نے بھائیا جی کو بڑا متاثر کیا۔ چنانچہ دلی لوٹتے ہی انھوں نے فیصلہ کیا کہ پال کو ہی کیوں نہ ٹٹولا جائے۔ تیسرے دن ہی ہم تینوں پھر پہنچ گئے انبالہ شہر تندورواں والی گلی میں، ایک ٹوٹے پھوٹے گھر میں، جہاں دودھ سے بھرے کئی ٹب اور کین ادھر ادھر پڑے تھے، جن پر مکھیاں بھنبھنا رہی تھیں۔ پال بنیان اور لنگی میں پیروں میں ربڑ کا سلیپر اٹکائے، سائیکل پر تقریباً چار کین لٹکائے، پسینے میں ترا لجھے بالوں سے جب شام کو گھر لوٹے تو بہن نے شرارت سے مہمانوں کے بارے میں بتایا۔ ماں ہمیں پہلے ہی بتا چکی تھیں کہ جوان بہن کی شادی کرنے سے پہلے پال اپنے بارے میں بات بھی کرنا پسند نہیں کرتا۔ لیکن رات ہی رات میں نہ جانے کس طرح اور کیوں کا یا کلپ ہو گیا۔ صبح تک پال بھارت چھوڑ کر افریقہ جانے پر راضی ہو گئے۔ اتنا بڑا فیصلہ اس طرح ایک لمحے میں کئی طرح کے خیال میرے من میں آئے... بٹوارے کے بعد سیالکوٹ کا آبائی گھر چھوٹ جانے، تعلیم ڈسٹرب ہونے اور دھکے کھاتے انبالے کے اس گندے گھر میں پناہ لینے کے بعد شاید انھوں نے سوچا کہ چلو بے گھر تو ہو ہی چکے ہیں... یہاں نہیں تو وہاں سہی۔ دودھ کے دھندے سے تو چھٹکارا ملے گا۔''[2]

خیر شادی ہوئی اور شادی کے فوراً بعد والد کے انتقال اور بہن کی ذمہ داریوں نے انھیں اندرونی تذبذب میں مبتلا رکھا۔ کینیا روانگی کے بعد بھی ایک سال تک احساس جرم ان کے ساتھ رہا، خصوصاً اس وقت جب بعد میں معلوم ہوا کہ ان کی چھوٹی بہن ڈیلیوری کے دوران انتقال کر گئی تھی۔ کینیا میں انھوں نے چودہ برس گزارے جنھیں وہ اپنا جلاوطنی کا زمانہ قرار دیتے ہیں۔

1955 میں ہندوستان واپس آکر انھوں نے ایم۔اے مکمل کیا لیکن مناسب روزگار کی کمی کے باعث دوبارہ کینیا جانا پڑا۔ دوسری مرتبہ 1960 میں وہ وطن آئے اور اگر چہ اس دوران حالات بہتر ہو چکے تھے لیکن غیر یقینی کے سبب پھر واپس جانا پڑا۔ بالآخر 1963 میں جب کینیا کی حکومت نے مستقل رہائش اختیار کرنے یا جزوی پنشن لے کر واپس جانے کا اختیار دیا تو جوگندر پال نے وطن واپسی کو ترجیح دی۔ ہندوستان واپس آکر نئی ملازمت کی تلاش کے دوران کئی مشکلات سامنے آئیں حتیٰ کہ بائیو ڈاٹا میں بی۔ اے کی تھرڈ کلاس ڈگری بھی ان کے لیے رکاوٹ بنی، تاہم ایک اتفاق نے انھیں کالج میں پروفیسر اور بعد ازاں پرنسپل کے منصب تک پہنچا دیا۔

جوگندر پال نے کہانی نویسی کا آغاز اپنی جوانی ہی میں کر دیا تھا اور 1943 سے 1944 کے دوران ان کی تحریریں مختلف رسائل میں شائع ہونے لگیں۔ ساقی میں شائع ہونے والی کہانی 'تیاگ سے پہلے' ان کے

1955 میں ہندوستان واپس آکر انھوں نے ایم۔اے مکمل کیا لیکن مناسب روزگار کی کمی کے باعث دوبارہ کینیا جانا پڑا۔ دوسری مرتبہ 1960 میں وہ وطن آئے اور اگر چہ اس دوران حالات بہتر ہو چکے تھے لیکن غیر یقینی کے سبب پھر واپس جانا پڑا۔

ادبی سفر کا سنگ میل ثابت ہوئی۔ کینیا کے تجربات نے ان کے افسانوی شعور کو بیدار کیا اور 1955 کے بعد انھوں نے افریقی فضا اور انسانی صورت حال سے متعلق کہانیاں تحریر کیں۔ ہندوستان واپسی پر کرشن چندر نے ان کی تحریروں کو سراہا اور پہلی کتاب 'دھرتی کا کال' شائع ہوئی۔ وقت کے ساتھ کہانی ان کی زندگی کا مرکزی محور بن گئی اور احساس ہوا کہ وہ فن کے اس منصب کے لیے بنائے گئے ہیں۔

1978 میں جوگندر پال نے ملازمت کو خیر باد کہہ کر دہلی میں مستقل سکونت اختیار کر لی اور خود کو مکمل طور پر تصنیف اور مطالعے کے لیے وقف کر دیا۔ ان کے مطابق فنکار کے لیے ضروری ہے کہ وہ اپنی زندگی کے تمام امتیازی نشان ایک طرف رکھ کر سادگی، سنجیدگی اور افسردگی کو قبول کرے تا کہ انسانی دکھ اور تجربات سے بہتر ہم آہنگی پیدا ہو سکے۔ جوگندر پال کی زندگی مسلسل ہجرت، معاشی جدوجہد، جذباتی کشمکش، تدریسی تجربے اور گہرے انسانی شعور سے عبارت ہے اور یہی عناصر آگے چل کر ان کی کہانی نویسی کی ریڑھ کی ہڈی ثابت ہوئے۔

جوگندر پال کا تخلیقی سفر اس معصوم شوق سے شروع ہوتا ہے جو ان کے اندر بچپن میں کہانیاں سننے اور سنانے سے پیدا ہوا تھا۔ رسالہ 'پھول' ان کے ذوق مطالعہ کو بیدار کرتا رہا اور وہ چھوٹی عمر میں ہی راجکماری اور جل پریوں جیسی کہانیاں اپنی کاپیوں میں لکھنے لگے۔ ابتدا میں انھیں اپنی تحریریں دوسروں کو سنانے میں جھجک محسوس ہوتی تھی، مگر اندر ہی اندر یہ شوق مسلسل بڑھتا رہا۔ کالج پہنچنے پر ان کی خوداعتمادی میں اضافہ ہوا۔ گنڈا سنگھ ہائی اسکول کے استاد گو بند رام روز خوشخط لکھنے کی تلقین کرتے تھے تو جوگندر پال اپنے دل کی باتیں لکھ کر دکھاتے اور ماسٹر کی تعریف انھیں مزید حوصلہ دیتی۔ اسی زمانے میں ان کی پہلی کہانی 'تعبیر' کالج میگزین میں شائع ہوئی، جس نے ان کے دل میں افسانہ نگاری کا مضبوط یقین پیدا کیا۔ پھر 1945 میں ماہنامہ 'ساقی' دہلی میں ان کی کہانی 'تیاگ سے پہلے' سب سے پہلے چھپی جو ان کے لیے ایک بڑی کامیابی تھی۔ اسی دور میں مختلف رسائل میں ان کی کہانیاں کبھی کبھار شائع ہوتیں مگر تسلسل نہیں تھا۔ البتہ ان کی کہانیاں، معنویت اور اثر انگیزی سے پر ہوتی تھیں۔ ان کی فطرت میں ابتدا ہی سے سوچنے اور سمجھنے کی صلاحیت موجود تھی۔ انھیں معاشی تنگی نے افریقہ جانے پر مجبور کیا، جہاں نوکری تو مل گئی مگر وہاں کے عوام پر ظلم، استحصال اور نسلی منافرت کے مناظر نے ان کی حساس طبیعت کو شدت سے متاثر کیا۔ انھوں نے وہاں کھل کر احتجاج تو نہیں کیا لیکن افریقی عوام کی محرومیوں اور انسانیت سوز حالات کو افسانوں کے ذریعے بیان کیا۔ انھیں تجربات پر مبنی کہانیوں کا مجموعہ 'دھرتی کا کال' ان کے تخلیقی سفر کا سنگ میل ثابت ہوا۔ افریقہ کی جلاوطنی اور اپنے وطن کی جدائی نے ان کے اندر انسان دوستی، وسیع فکر اور نئے ادبی احساسات کو جنم دیا جو ان کی بعد کی تمام تحریروں میں نمایاں ہیں۔ جو گندر پال کی اس کیفیت کی ترجمانی کرشنا پال نے یوں کی ہے:

''جہاز سے اترتے ہی ممباسا میں افریقہ کی دھرتی پر

قدم رکھتے ہی پال سمندر کے کنارے گم سم کھڑے بھارت کی طرف منہ پھیر کر من ہی من گویا کچھ فیصلہ کر رہے تھے۔ ہر لحاظ سے خوبصورت شہر خوش قسمت سمجھتے دوسرے امپورٹڈ شوہر اپنے آپ کو۔ لیکن پال من ہی من گھٹتے رہتے... وہ ہمیشہ واپسی کی باتیں کرتے۔ ہم لوگ طرح طرح سے سوچتے۔ واپسی؟ کیوں؟ وہاں کون ہے اب ان کا؟ میں کچھ سمجھ نہ پاتی اور پال؟ وہ ان منے سے الگ تھلگ اپنے اوپر اکیلا پن طاری کیے وہاں کے سماج میں فٹ ہی نہ ہو پاتے... بچھڑے ہوؤں کے ساتھ ایک خاص قربت، غریب بچوں کے ساتھ ایک عجیب تعلق! ان کا کمپیشن میں نیروبی میں افریقیوں کے ساتھ ان کے نجی لگاؤ کی یاد دلاتا۔ ماؤ ماؤ مومینٹ کے دنوں انگریزوں نے ککویوں قوم کو دھڑ ادھڑ گرفتار کر کے جیلیں بھرنا شروع کر دیا تھا۔ چاروں طرف ایک دہشت پھیل گئی تھی۔ ککویوں اور ان سے تعلق رکھنے والوں کے ساتھ سرکار سختی برت رہی تھی۔ مجھے یاد ہے پال اپنے نوکر موانگی کو بڑی جرأت کے ساتھ جیل سے اپنی ذمے داری پر چھڑوا کے لائے تھے۔ کئی لوگوں نے کہا اس آدمی کا دماغ خراب ہے۔ مظلوموں کے ساتھ پال کا ہمیشہ ایک انوکھا رشتہ رہا ہے۔ اپنی غریبی اور بے بسی کو پال ایک پل کے لیے بھی نہیں بھولتے۔"[3]

1963 میں وہ کینیا سے ملازمت چھوڑ کر واپس ہندوستان آئے مگر یہاں بھی روزگار اور تخلیق کے درمیان کشمکش جاری رہی۔ دن کو نوکری اور رات کو لکھنے نے انھیں مسلسل تھکا کر رکھا، لیکن اندر کا فنکار انھیں یہی کہتا رہا کہ زندگی کو تخلیق کے لیے وقف کرنا ہی اصل راستہ ہے۔ آخر کار انھوں نے مقررہ وقت سے پہلے ہی ملازمت چھوڑ دی تا کہ پوری طرح لکھنے کے قابل ہو سکیں۔ اورنگ آباد پہنچنا ان کی زندگی کا خوش قسمت موڑ ثابت ہوا۔ اس شہر نے نہ صرف انھیں محبت اور اعتماد دیا بلکہ ان کی تخلیقی شناخت کو از سر نو قائم کیا۔ یہاں نئی کہانی کے مباحث نے ان کی سوچ کو وسعت بخشی اور ان کے کئی اہم افسانے اور ناولٹ وہیں وجود میں آئے۔ بعد میں دہلی نے بھی ان کے فن کو نیا رنگ دیا۔ وہ دہلی میں اپنے قیام کو اپنی زندگی کا پانچواں جنم قرار دیتے ہیں، جہاں ان کا نظریہ مزید واضح ہوا اور کہانی ان کی زندگی کا لازمی حصہ بن گئی۔ ان کی تخلیقی کیفیت اکثر شدید ہوتی تھی۔ وہ نئی کہانی کی تلاش میں خود کو بالکل الگ دنیا میں محسوس کرتے۔ ان کی شریک حیات کرشنا پال نے ان کی زندگی اور فن میں بنیادی کردار ادا کیا۔

انھوں نے اپنے شوہر کو بہتر سمجھنے کے لیے اردو سیکھی اور کئی افسانوں اور ناولوں کا ترجمہ بھی کیا۔ ستر برس پر محیط جوگندر پال کا یہ سفر مختلف تجربات، مشاہدات، فکری وسعت، انسان دوستی اور تخلیقی سچائی سے عبارت ہے۔ انھوں نے کبھی کسی تحریک یا ازم کے تحت نہیں لکھا بلکہ اپنے اندر کی آواز پر اعتماد کرتے ہوئے لکھتے رہے۔ اس لیے ان کی تخلیقات آج افسانوی ادب کا ایک قیمتی سرمایہ تسلیم کی جاتی ہیں اور ان کا تخلیقی سفر اردو افسانے کی تاریخ کا ایک روشن باب ہے۔

جوگندر پال کے فن کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ وہ زندگی کے باطنی تجربے کو کرداروں کے ذریعے اس نزاکت اور گہرائی سے پیش کرتے ہیں کہ قاری محض واقعات نہیں پڑھتا بلکہ انسانی روح کی حرکت کو محسوس کرتا ہے۔ ان کے نزدیک کردار اچھے یا برے نہیں ہوتے، انسان ہوتے ہیں اور یہی انسانیت ان کی اصل شناخت ہے۔ ان کے افسانے 'عفریت'، 'چور سپاہی'، 'بو' اور 'گاڑی' اس بات کی عمدہ مثالیں ہیں کہ وہ کرداروں کے رویوں کو کسی اخلاقی حکم کے تابع نہیں کرتے بلکہ ان کے وجود کے اندر چھپی ہوئی حرکتوں، خوف، بے بسی اور روشنی کی جھلک کو نمایاں کرتے ہیں۔ 'عفریت' میں انھوں نے معاشرتی منافقت کو ایک علامتی پھیلاؤ میں یوں سمیٹا ہے کہ برائی کی مستقل موجودگی اور انسان کی بے خبری دونوں ایک ساتھ سامنے آتی ہیں۔ 'چور سپاہی' میں قانون، خوف اور انسانی کمزوری کا وہ گہرا مشاہدہ ملتا ہے جس سے جوگندر پال کے بیانیے کی حقیقت پسندی اور نفسیاتی گہرائی واضح ہوتی ہے۔ 'بو' میں زندگی کی بے حسی کو داخلی عفونت کے استعارے میں بدل دیا گیا ہے اور 'گاڑی' میں جمہوری و سماجی بحران کو اس شدت سے پیش کیا گیا ہے کہ انجام کا دھندلا پن خود ایک علامت بن جاتا ہے۔

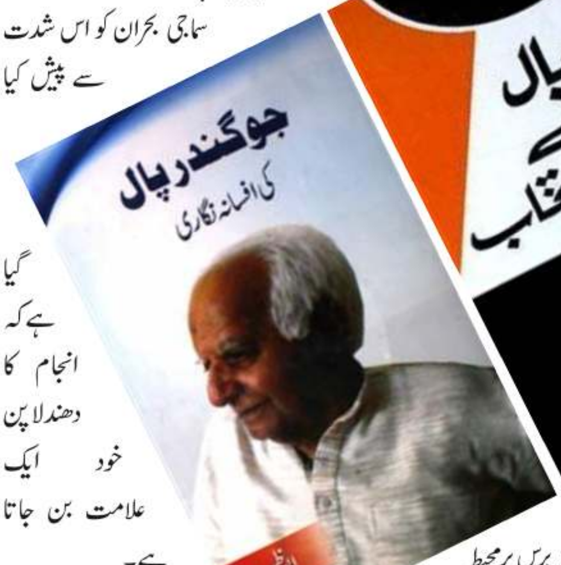

ان کا دوسرا اہم وصف ان کی بیانیہ تکنیک، فکری وسعت اور علامتی قوت ہے۔ وہ وقت، موت، تبدیلی اور انسانی تقدیر کو محض موضوعات کے طور پر نہیں برتتے بلکہ انھیں زندگی کے پورے فلسفے کے ساتھ جوڑ دیتے ہیں۔ ان کے یہاں وقت کیلنڈر کا وقت نہیں بلکہ ایک بہتا ہوا احساس ہے۔ یہی تصور 'باشندے' میں نمایاں ہوتا ہے جہاں تبدیلی کو نہ المیہ بنایا گیا ہے نہ معجزہ بلکہ انسانی ارتقا کا حصہ دکھایا گیا ہے۔ جس کے بارے میں کرشن چندر رقمطراز ہیں:

''جوگندر پال کا ایک نقطہ نظر یہ بھی ہے، بہت سے لوگوں کا کوئی زاویہ نگاہ نہیں ہوتا، سوائے اس کے کہ ''ٹک دیکھ لیا'' دل شاد کیا اور چل نکلے۔۔۔ حالانکہ یہ بھی ایک زاویہ نگاہ ہے مگر بے حد سطحی ہے جوگندر پال بھی دیکھتا ہے، دل شاد بھی کرتا ہے اور دیکھ کر چلا بھی جاتا ہے مگر دیکھ کر جانے کے بعد بھی ہم اس کے افسانے کا مزہ لیتے رہتے ہیں، کیونکہ تصویر جو اس نے ہمیں دکھائی ہے، اس میں صرف سطح کی کیفیت نہیں ہے جیسی اکثر تصویروں میں ہوتی ہے، اس میں اور نہیں بھی ہوتی ہیں جنھیں ذہن آہستہ آہستہ کھولتا ہے اور قند مکرر کا مزہ لیتا ہے! اس کے افسانوں سے ایک ہمدرد افسانہ نگار کا دل جھانکتا ہے، ایک انسانیت پرست فرد جو اپنے گرد و پیش کے حالات سے محض متاثر ہی نہیں ہوتا، کیمرے کی حساس پلیٹ کی طرح، بلکہ ان حالات کو بدلنے کا شعور اور اس شعور کا درد اور تڑپ بھی اپنے سینے میں رکھتا ہے۔''[4]

'آگے پیچھے'، 'انتم پاتھ'، 'کوئی نجات' اور 'پرائی' جیسے افسانوں میں موت اور زندگی کی جدلیات اس طرح سامنے آتی ہے کہ انسان اپنے وجود کے ساتھ سمجھوتہ کرنے لگتا ہے، تمام تر تضادات کے باوجود ان کے بیانیے میں ایک لطیف سی روشنی اور ایک شفاف سی امید موجود رہتی ہے۔ زبان میں سادگی، بیان میں فطری روانی، کرداروں کی روح تک رسائی اور پورے افسانے کو استعارہ بنانے کا ہنر، یہ تمام خوبیاں ان کے فن کو وہ مقام عطا کرتی ہیں جو اردو افسانے میں بہت کم فنکاروں کو نصیب ہوا ہے۔ پال نے افسانہ لکھنے کے بجائے زندگی پڑھنے کا طریقہ اختیار کیا اور یہی ان کی تخلیقی عظمت کا بنیادی راز ہے۔

اس سے پہلے کہ پال کے افسانوں کا سماجی، تہذیبی اور فکری پس منظر تلاش کیا جائے۔ ارتضی کریم کا وہ اقتباس، جو جوگندر پال کی تمام کہانیوں میں موجود مشترک قدروں کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ ملاحظہ کیجیے:

''جوگندر پال چونکہ فرشتہ نہیں ہیں ایک افسانہ نگار ہیں، اسی لیے ان کے افسانوں میں نور بھی ہے اور رنگ بھی، یہ نور انسانیت پر ایمان کا ہے اور رنگ زندگی کے مشاہدوں کا، اسی لیے ان کے افسانوں میں زندگی مختلف رنگ میں نظر آتی ہے، جن سے ہمارے ذہن منور ہوتے ہیں۔

جوگندر پال نے خوب لکھا ہے، یہاں خوب لفظ کو راقم نے اچھا اور زیادہ دونوں معنوں میں استعمال کیا ہے۔ زیادہ لکھنے کے باوجود انھوں نے اپنے آپ کو دہرایا نہیں ہے، ہر کہانی میں نئے مسائل اور موضوعات اور بالکل الگ تھلگ اسلوب کو استعمال میں لایا ہے۔ چنانچہ پہلی کہانی 'تیاگ سے پہلے' (1945) سے لے کر 'مہاجرت' (1999) تک کے تخلیقی سفر میں مسلسل ارتقا نظر آتا ہے، ارتقا کی یہی صورت ان کے ناولوں میں بھی نظر آتی ہے۔ شاید اسی لیے جوگندر پال کے ناول یا افسانے معاصر ادب اور زندگی کے شانہ بشانہ چلتے ہیں لیکن اس کے باوجود آپ جوگندر پال کو کسی ایک فکر، دبستان یا زاویہ نگاہ یا ازم سے نہیں جوڑ سکتے۔''[5]

جوگندر پال کے افسانوں میں کردار سازی ان کے فن کی بنیاد سمجھی جاتی ہے۔ وہ کرداروں پر اپنی مرضی مسلط نہیں کرتے بلکہ کرداروں کو فطری آزادی کے ساتھ ماحول، معاشرت اور اپنے داخلی تجربات کے زیر اثر چلنے دیتے ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ ان کے کردار محض نمونے نہیں بلکہ جیتے جاگتے انسان محسوس ہوتے ہیں۔

یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ جوگندر پال کی کہانیوں میں یوں تو پورا سماج نظر آتا ہے لیکن وہ حصہ زیادہ نمایاں ہے جسے واقعی نمایاں ہونے کی ضرورت تھی۔ لہٰذا ان کے افسانوں میں غربت، طبقاتی فرق، گھریلو بے امنی، رشوت خوری اور انسانی بے بسی جیسے مسائل نمایاں طور پر سامنے آتے ہیں۔ افسانہ 'بے گور' میں امریکی ڈاکٹر کا زندہ لاشوں کی خریداری کے لیے آنا، رام دین کا دلال بن جانا اور پچاس زندہ لاشوں کا دکھ پیش کرنا اس معاشرے کی انتہائی غربت اور گرتی ہوئی انسانی قدروں کی نہایت ٹھوس مثال ہے۔ اسی طرح افسانہ 'ہری کیرتن' میں بڑے بابو کا اپنے بیمار باپ کو نظر انداز کرنا، بیوی پر شک کرنا اور گھریلو رشتوں کی حرمت کو پامال کرنا آج کے خاندانی انتشار اور ذہنی بیماریوں کی دقیق تصویر پیش کرتا ہے۔ 'عفریت' میں بچے کا سوال کہ راون کے دس سر کیوں ہیں، یہ انسان کی سماجی اور اخلاقی دوغلے پن کا علامتی اظہار ہے۔ ان تمام مثالوں سے جوگندر پال کے فن کا وہ سماجی پس منظر ظاہر ہوتا ہے، جس میں انسان اپنے ماحول، کمزوریوں اور تضادات کے ساتھ پوری شدت سے ابھرتا ہے۔

تہذیبی اور ثقافتی سطح پر جوگندر پال کی کہانیاں مشرقی روایت، دیہاتی زندگی اور اساطیری فکر کی بھرپور نمائندگی کرتی ہیں۔ افسانہ 'کھودو بابا کا مقبرہ' میں ایک فقیر بستی کے لوگ، ان کی عقیدت و نصیحت اور بندھو نامی کتے کی وفاداری مشرقی روحانی روایت کی ٹھوس مثالیں ہیں اور دوسری کہانیاں جیسے 'چہار درویش'، 'عفریت' اور 'مہاجر' وغیرہ سے واضح ہوتا ہے کہ ہمارے معاشرے میں اساطیری اور دیومالائی عناصر کس طرح سماجی ساخت کا حصہ رہے ہیں۔ افسانہ 'دادیاں' میں پنجابی رسم و رواج، پرانا گھر چھوڑنے سے انکار اور بڑھاپے کی تنہائی مشرقی تہذیبی روایت کا مضبوط حوالہ ہے۔ 'بازدید' میں وہ اپنے کھوئے ہوئے آبائی گاؤں، کچے راستوں اور مٹی کی سوندھی خوشبو کی تلاش کے ذریعے تہذیبی اصل سے وابستگی کو دکھاتے ہیں۔ افسانہ 'کتھا ایک پیپل کی' میں پیپل کے درخت کی جڑیں، اس کی گرفت اور آزادی کی خواہش نئی نسل کے ذہنی اور تہذیبی بحران کی علامت بن جاتی ہیں۔ یہ تمام مثالیں واضح کرتی ہیں کہ جوگندر پال کے افسانوں کا تہذیبی پس منظر صرف فضا سازی نہیں بلکہ ثقافتی تجربے کی گہری معنویت رکھتا ہے۔

جوگندر پال کے افسانوں کا سب سے نمایاں فنی وصف یہ ہے کہ وہ پلاٹ کی سخت پابندی کے بجائے کرداروں کی داخلی کیفیت اور ذہنی بہاؤ کو زیادہ اہمیت دیتے ہیں۔ شعور کی رو، خود کلامی اور علامتی اظہار جیسی تکنیکیں ان کے اسلوب کا بنیادی حصہ بن جاتی ہیں، جن کے ذریعے وہ کرداروں کے ذہن اور احساسات کو براہ راست قاری کے سامنے کھول دیتے ہیں۔ انھوں نے روایتی افسانے کے بجائے آزاد تاثر کی بنیاد پر کہانی کو جلا بخشی، جس کا نتیجہ یہ ہے کہ ان کی کہانیاں پلاٹ

کے بجائے احساس اور کیفیت کے سہارے آگے بڑھتی ہیں۔ مثال کے طور پر افسانہ 'پھول' میں گنگا محض ایک کردار نہیں بلکہ انسانی خواہشات اور توقعات کی علامت بن جاتی ہے، جو ہر شخص کی خواہش پوری کرنے کی کوشش میں خود الجھ کر رہ جاتی ہے۔ اسی طرح 'بھوک پریت'، 'کایا کپٹ'، 'جاگیردار'، 'گرین ہاؤس' اور 'جادو' جیسی کہانیوں میں بے جان اشیا اور فطری مظاہر کو کردار بنا کر وہ انسانی نفسیات کی تہوں تک رسائی حاصل کرتے ہیں۔ ان کے یہاں تکنیک کا مقصد کہانی کو پیچیدہ بنانا نہیں بلکہ کرداروں کی زندگی کو آزادانہ سانس لینے کا موقع فراہم کرنا ہے، اس لیے ان کے کردار خود افسانہ نگار کی گرفت سے نکل کر اپنی زندگی خود متعین کرتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔

جوگندر پال کے افسانوں میں کردار سازی ان کے فن کی بنیاد سمجھی جاتی ہے۔ وہ کرداروں پر اپنی مرضی مسلط نہیں کرتے بلکہ کرداروں کو فطری آزادی کے ساتھ ماحول، معاشرت اور اپنے داخلی تجربات کے زیر اثر چلنے دیتے ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ ان کے کردار محض نمونے نہیں بلکہ جیتے جاگتے انسان محسوس ہوتے ہیں۔ 'ہری کیرتن' کی بڑی بہو جیسے کردار سماجی جبر، گھریلو اذیت اور عورت کی محرومی کو اس شدت سے پیش کرتے ہیں کہ قاری کردار کے دکھ کو اپنی ذات میں محسوس کرنے لگتا ہے۔ اسلوب کے لحاظ سے ان کی زبان عام بول چال کے قریب ہے، تاہم جملوں کی ساخت، لفظوں کی ترتیب اور علامتی اشاروں کی وجہ سے اس میں ایک خاص فنی تازگی برقرار رہتی ہے۔ وہ زبان کو محض آرائش نہیں بناتے بلکہ اسے کردار اور کیفیت کا ترجمان بناتے ہیں۔ علامتی تکنیک کا استعمال ان کے یہاں انتہائی متوازن ہے جس کی مثال ان کی علامتی کہانیوں میں ملتی ہے، جہاں واقعات محض واقعات نہیں رہتے بلکہ انسانی زندگی اور معاشرتی تضادات کی گہرائی کو ظاہر کرتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی کہانیاں روایتی پلاٹ سے آزاد ہونے کے باوجود مربوط، رواں اور قاری کے لیے تجسس خیز رہتی ہیں، جو کسی بھی کامیاب افسانہ نگار کی اہم ترین خوبی ہے۔ جوگندر پال کے انھیں فنی محاسن کی طرف اشارہ کرتے ہوئے قمر رئیس رقمطراز ہیں:

''اپنے افسانوں میں جوگندر پال جن وسائل اور جس طرح کی پیکر تراشی سے تخلیقی وحدت کی تعمیر کرتے ہیں وہ فن پر ان کی غیر معمولی گرفت کا ثبوت ہے۔ اس سلسلے میں اس حقیقت کی طرف اشارہ ضروری ہے کہ زبان کا استعمال ان کے یہاں نہایت حساس Sensitive کردار کا حامل ہے۔ اس کے بغیر ان کے فن کی شناخت ممکن نہیں۔ عام طور پر اردو میں کرشن چندر، منٹو اور عصمت چغتائی کے اسالیب کی پیروی کی گئی ہے۔ جوگندر پال کی افسانوی نثر کا اسلوب و آہنگ ان سے الگ پہچانا جاتا ہے۔ اس کے ترکیبی عناصر اتنے نازک ہیں کہ اس کی تقلید ممکن نہیں۔ اس لیے کہ وہ زندگی اور خود انسانی وجود سے مصنف کے ان پر اسرار اور پائیدار رشتوں کی نقاشی کرتے ہیں جو اس کے تخلیقی ضمیر میں پیوست ہیں، بلا شبہ جوگندر پال کی کہانیاں ان کے فن کی تہذیب اور پختگی کی معراج ہیں۔''[6]

اپنے افسانوں میں جوگندر پال جن وسائل اور جس طرح کی پیکر تراشی سے تخلیقی وحدت کی تعمیر کرتے ہیں وہ فن پر ان کی غیر معمولی گرفت کا ثبوت ہے۔

جوگندر پال فکشن میں کئی حوالوں سے منفرد ہیں، وہ فکشن کو محض واقعات کا سلسلہ نہیں رہنے دیتے بلکہ اسے انسانی شعور، سماجی بے حسی اور باطنی کرب کے گہرے تجربے میں ڈھال دیتے ہیں۔ ان کے یہاں موضوعات کی جدت اور اسلوب کی تخلیقی سنجیدگی مل کر ایک ایسا منفرد فنی رنگ پیدا کرتی ہے جو انھیں اپنے ہم عصر افسانہ نگاروں سے ممتاز کرتی ہے۔ افسانہ 'بے گور' میں وہ غربت کو اس حد تک مجسم کرتے ہیں کہ زندہ انسان بھی زندہ لاشوں کی طرح دکھائی دیتے ہیں، جبکہ 'عفریت' اور 'رامائن' جیسے افسانوں میں قدیم روایات کو عصری دہشت، کرپشن اور اخلاقی زوال سے جوڑ کر ایک نیا فکری زاویہ پیدا کرتے ہیں۔ ان کے یہاں کہانی ایک واردات کی طرح سامنے آتی ہے، جہاں کردار اپنی آواز، اپنے دکھ اور اپنے سوالات کے ساتھ قاری کے اندر اتر جاتے ہیں۔ افسانہ 'پناہ گاہ' میں تقسیم ہند کا سانحہ انسانی روح کا مستقل زخم بن کر ابھرتا ہے۔ جوگندر پال کا اصل امتیاز یہ ہے کہ وہ نہ کسی روایت کے اسیر ہیں، نہ کسی فنی نمائش کے خواہاں، وہ کہانی کو جیتے ہیں، اس میں گھل جاتے ہیں اور زندگی کے پوشیدہ کرب، انسانی ذہنیت کے تیتے سوالات اور تہذیبی زوال کے نقوش کو اس طرح بیان کرتے ہیں کہ ان کا ہر افسانہ فن اور فکر کا ایک ساتھ مجسم اظہار بن جاتا ہے۔

جوگندر پال فن اور شخصیت کے مطالعے سے یہ حقیقت سامنے آتی ہے کہ وہ اردو افسانے میں فکری اور تکنیکی دونوں سطحوں پر ایسے امکانات روشن کرتے ہیں جن پر مزید تحقیق کی ضرورت اور گنجائش موجود ہے۔ ان کے افسانے یہ ثابت کرتے ہیں کہ انھوں نے انسانی داخلی تجربے کو وقت، موت، تبدیلی اور سماجی تضادات کے ساتھ اس باریکی سے جوڑا ہے کہ ان کے فن میں زندگی کا پورا فکری منظر نامہ ایک نئے تناظر میں کھلتا ہے۔ ان کے کردار نہ صرف اپنی نفسیاتی ساخت میں منفرد ہیں بلکہ ان کا رویہ سماجی ڈھانچے کی نئی تعبیرات پیش کرتا ہے اس لیے ان کے بیانیے کو جدید نفسیاتی نظریات، سماجی جدلیات اور علامتی مطالعات کی روشنی میں دیکھنے کے وسیع امکانات موجود ہیں۔ زبان کی سادگی، علامت کا محتاط مگر موثر استعمال، کرداروں کی تفتیشی پڑھت اور وقت کی غیر خطی ترتیب جیسے عناصر اس بات کا تقاضا کرتے ہیں کہ جوگندر پال کے فن کو محض افسانوی جمالیات کے طور پر نہیں بلکہ ایک فکری نظام کے طور پر بھی پرکھا جائے گا۔

حواشی

1 جوگندر پال: ذکر، فکر، فن (مرتب) ارتضی کریم، موڈرن پبلشنگ ہاؤس، 1999، ص 139

2 جوگندر پال: ذکر، فکر، فن (مرتب) ارتضی کریم، موڈرن پبلشنگ ہاؤس، 1999، ص 117

3 جوگندر پال: ذکر، فکر، فن (مرتب) ارتضی کریم، موڈرن پبلشنگ ہاؤس، 1999، ص 118-19

4 جوگندر پال: فن اور شخصیت (مرتب) سعید شہاب، جدید ادب پبلیکیشنز، 1985، ص 45-46

5 جوگندر پال: ذکر، فکر، فن (مرتب) ارتضی کریم، موڈرن پبلشنگ ہاؤس، 1999، ص 27

6 جوگندر پال کا فنی اسلوب: قمر رئیس، مشمولہ: چہارسو، راولپنڈی، جلد: 11، مارچ، اپریل، 2002

■

Dr. Mujeeb Ahmad Khan
Associate Professor, Dept of Urdu
Kirori Mal College,
University of Delhi
Delhi- 110007

محمد دانش غنی

مثنوی عکس کوکن

ایک ادبی اور تاریخی کارنامہ

اردو شاعری کے ضمن میں عام طور پر کہا جاتا ہے کہ اس میں ایسا کوئی بڑا رزمیہ وجود میں نہیں آیا جس کو ہم عالمی زبانوں کے ادب کے مقابلے میں رکھ سکیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اردو کا دامن کسی اعلیٰ رزمیے سے ابھی تک خالی ہے لیکن اس کو انیس و دبیر کے مرثیے اور حفیظ جالندھری کا شاہنامہ اسلام بڑی حد تک اور اردو کی بعض اہم مثنویاں اپنے محدود دائرہ اثر کے باوجود کسی حد تک پورا کر دیتی ہیں اور اس اعتبار سے ان مثنویوں کی اہمیت دوسری اصنافِ سخن کی بہ نسبت کہیں زیادہ ہے۔ اردو شاعری پر بہت سے الزامات کے ساتھ ایک الزام یہ بھی عائد کیا جاتا ہے کہ اس میں تاریخی حقیقت نگاری کا فقدان ہے۔ اس لحاظ سے اردو کی ان تاریخی مثنویوں کی اہمیت میں اور بھی اضافہ ہوجاتا ہے جس میں تاریخی اور تہذیبی حقائق اور مخصوص معاشرتی اور ثقافتی رجحانات وعوامل کی عکاسی کی گئی ہے۔

اختر راہی کی مثنوی 'عکس کوکن' تاریخی اور تہذیبی حقائق اور مخصوص معاشرتی اور ثقافتی رجحانات وعوامل کی عکاس ہے جس کی علمی و ادبی حیثیت کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ زیر نظر مثنوی اردو کے معروف مرکزوں سے دور بیٹھ کر لکھی گئی ہے مگر اس میں بھی مواد اور ہیئت کے اعتبار سے وہ ساری ادبی خوبیاں موجود ہیں جو ایک اچھی مثنوی میں ہونی چاہیے۔ صاف ستھری، رواں دواں، تازگی اور توانائی سے معمور ایک ٹھنڈے اور میٹھے پانی کے چشمے کی طرح زبان استعمال کی گئی ہے۔ مثنوی ''عکس کوکن'' میں خطہ کوکن کے حسن فطرت کی جلوہ گری قابل دید ہے۔ خوبصورت پہاڑیوں کے دامن میں بحر عرب کے زرخیز ساحل پر سر سبز و شاداب کوکن کی سر زمین آم، کاجو، ناریل، چیکو اور رنگین و دل نشیں خوشبو دار پھولوں کا ہی دیس نہیں ایک تیزی سے اٹھتا ہوا ترقی پذیر خطہ بھی ہے۔ چاروں سمتوں میں اپنی راہیں کھولتا ہوا یہ ایسا خطہ ہے جہاں سے بہت سے مراٹھی اخبارات تازہ ترین علاقائی اور ملکی خبروں کی پھواریں گھر گھر اور قریہ قریہ لے جاتے ہیں۔ خطہ کوکن مراٹھی کے علاوہ اردو زبان وادب کی نشر واشاعت میں بھی ایک خصوصی مقام رکھتا ہے۔ خوب سیرتی اور خوبصورتی کے حامل اس خطے میں مسلم آبادی سکون واطمینان کے ساتھ علم وادب اور تہذیب وثقافت کی کیاریوں کو سینچ رہی ہے۔

مثنوی 'عکس کوکن' کی اشاعت 1994 میں ثبات پبلی کیشنز، ممبئی کے زیر اہتمام ہوئی عمل میں آئی۔

کتاب کے شروع میں 'مثنوی کی جاندار روایت' کے عنوان سے علی سردار جعفری کا مختصر مگر جامع تبصرہ موجود ہے، مقدمے کے طور پر عزیز قیسی کا لکھا ہوا مضمون ''عکس کوکن: عشق نامہ کوکن' اور کئی ادیبوں کی آرا شامل ہیں۔ سب نے مثنوی 'عکس کوکن' کو اختر راہی کا ایک شاندار ادبی اور تاریخی کارنامہ قرار دیا ہے۔ تقریباً دو ہزار اشعار پر مشتمل یہ مثنوی رزم و بزم کے ہر موضوع اور زبان و بیان کے محاسن کا مرقع ہے۔ اس طرح یہ مثنوی اپنی جگہ پر منفرد اور مختلف ہے جو اختر راہی کی خطہ کوکن سے شدید محبت کے نتیجے میں تخلیق کی گئی ہے۔ چنانچہ وہ کہتے ہیں ؎

ہے کوکن دل و جاں سے پیارا مجھے
بہاروں کی جس نے سنورا مجھے
ہے کوکن شجاعت کی جولان گاہ
رہی سرفروشی کی قربان گاہ
محبت کی خوشبو، اخوت کا نور
سکون نظر دل کا وجد و سرور
ہیں کوکن کے واسی سب انساں نواز
کہ انساں کا انساں ہے مہماں نواز
وفادار و دلدار کوکن کے لوگ

یہ ہنس مکھ ملنسار کوکن کے لوگ
فرشتوں کے ہاتھوں بسایا ہوا
گل و برگ و تر سے سجایا ہوا
خدا کا عجب نور کوکن میں ہے
کہ کوکن بزرگوں کے دامن میں ہے
سمائے رگ و پے میں کوکن کا نور
اتر آئے دل میں وطن کا سرور
یہی تو ہے میرا وطن باوقار
بہاروں کے موسم ہیں جس پہ نثار
مناظر میں پنہاں خدا کو وجود
جھکے سر بہ ہر گام بہر سجود

اختر راہی نے کوکن کے عکس کو مذکورہ بالا اشعار میں اتارا ہے۔ وہ کوکن جس کے مشرق میں کوہ سیہادری کا سلسلہ ہے تو مغرب کی جانب بحرعرب کی موجیں اس کے کناروں سے ٹکراتی ہیں۔ وہ کوکن جس کا حسن لاجواب شاعر کے ذہن پر نقش ہے۔ وہ کوکن جس کا عکس شاعر کے آئینہ ادراک میں ہے۔ وہ کوکن جو شاعر کے اشعار میں رگوں میں دوڑتے ہوئے لہو کی حرارت کی مانند ہے۔ وہ کوکن جو شاعر کی بصارت بھی ہے اور بصیرت بھی۔

زیر نظر مثنوی تین ابواب پر مشتمل ہے۔ باب اول میں کوکن کی طبعی ساخت، فطری مناظر، آب و ہوا، پیداوار، شب و روز، تہوار، تہذیب و تمدن، سماجی، سیاسی اور ادبی ماحول کا ذکر کیا گیا ہے۔ باب دوم میں اولیائے کرام (حضرت مخدوم علی ماہمی، حضرت دیوان شاہ) تاریخی واقعات و شخصیات (نواب ریاست حبشاں، سردار سدی احمد خاں، نواب معتبر خاں والیٔ کلیان اور بھیونڈی، راجہ شیواجی مہاراج، بال گنگا دھر تلک، گوپال کرشن گوکھلے، ویر ساورکر اور بیرسٹر بابا صاحب امبیڈکر)، تاریخ آثار (قلعہ جنجیرہ، قلعہ ماہولی، سابق ریاست حبشاں اور ایلی فنٹا) اور تاریخی شہروں (کلیان، سوپارہ، علی باغ، ممبئی، جنجیرا مروڈ رتناگری، دابھول اور راجہ پور) کی بات کی گئی ہے۔ باب سوم کوکن کی اہم شخصیات سے متعلق ہے۔ جن میں مصطفیٰ فقیہ، معین الدین حارث، بیرسٹر عبدالرحمٰن انتولے، ڈاکٹر رفیق زکریا، حشمت خاں دلوائی، محمد عبداللہ پرکار عرف باغی بانکوٹی، یوسف حافظ، احمد زکریا، خان بہادر شہاب الدین قاضی، اے قیس، ڈاکٹر عبدالکریم نائیک، اشرف خاں دلوائی، ڈاکٹر عبدالرحیم

اختر راہی نے کوکن کے عکس کو مذکورہ بالا اشعار میں اتارا ہے۔ وہ کوکن جس کے مشرق میں کوہ سیہادری کا سلسلہ ہے تو مغرب کی جانب بحرعرب کی موجیں اس کے کناروں سے ٹکراتی ہیں۔ وہ کوکن جس کا حسن لاجواب شاعر کے ذہن پر نقش ہے۔ وہ کوکن جس کا عکس شاعر کے آئینہ ادراک میں ہے۔ وہ کوکن جو شاعر کے اشعار میں رگوں میں دوڑتے ہوئے لہو کی حرارت کی مانند ہے۔ وہ کوکن جو شاعر کی بصارت بھی ہے اور بصیرت بھی۔

انڈرے، ڈاکٹر نذیر جوالے، خان بہادر منیر خاں سرگروہ، ایچ بی مقدم، علی ایم شمسی، محمود نائیک، کیپٹن فقیر محمد مستری، ڈاکٹر عمر عبدالقادر دھنشے، ڈاکٹر ضمیر الدین خطیب، صغیر احمد ڈانگے، ڈاکٹر محمود عمر شیخ انجم، محمد قاسم دلوی، محمد علی سرکھوت، عبدالسلام راول، داؤد خلفے، نثار احمد لانبے، فضل اے ماسٹر، فلم اسٹار مقری، اداکارہ انیسہ ندیم (سریکھا)، قاسم گڈکری (کاتب)، ابراہیم فطرت، بال پاٹنکر، عبدالشکور کوکاٹے، ڈاکٹر نظام الدین گوریکر، ڈاکٹر اے اے منشی، ڈاکٹر محی الدین مومن، ڈاکٹر یونس اگاسکر، رشیدہ قاضی، مہر مہسلائی، قیصر رتناگیروی، داؤد غازی، آدم نصرت، ساحر شیوی، بدیع الزماں خاور، مشتاق مومن، شرف کمالی وغیرہ کے نام شامل ہیں۔

'عکس کوکن' کا اسلوب منفرد خصوصیات کا حامل ہے۔ مثلاً کئی مقامات پر زور بیان اتنا پراثر ہے کہ قاری یا سامع اس میں خود کو شریک سمجھتا ہے۔

حسینی اکھاڑہ، حسینی علم
دلوں کی توانائی سینوں کا دم
یہ ہاتھوں کی طاقت، یہ بازوں کا کس
یہ تعلیم ہے بہر قلب و نفس
یہ تعلیم ہے ضبط کے نظم کی
یہ تنظیم ہے رزم کی بزم کی
رہے جو اکھاڑے میں دو چار سال
بنائے بدن کسرتی با کمال
ہے گرمی و چستی بدن کی اساس
انا کی بنا بانکپن کی اساس
سپر، تیغ، تلوار، برچھی کا وار
وہ بنوٹ، وہ بانا، بناٹھی کی مار
اگر کوئی پٹھا اکیلا چلے
ہجوم اک اچانک ہو حملہ کرے
نہ گھبرائے وہ تیر و تلوار سے
ہجوم رقیباں کی یلغار سے
نکل جائے نرغے سے للکار کر
انھیں ان کے ہتھیار سے مار کر

یہ رزمیہ کا انداز ہے۔ کوکن کی بزم کا انداز بھی دیکھیے۔

کسی کو کسی سے شکایت ہوئی
تو بستی میں باہم جماعت ہوئی
وہیں پنچ بیٹھے کہ انصاف ہو
کدورت سے آلودہ دل صاف ہو
روایت یہ قائم ہے ہر گاؤں میں
کہ زنجیر ہو گاؤں کے پاؤں میں
رہے گاؤں میں آبرو گاؤں کی
کچہری نہ جائے نہ قضیہ کوئی

درج ذیل اشعار کو ضرب المثل کی طرح استعمال کیا جاسکتا ہے۔ ضرب الامثال محاوروں کی طرح مستعمل ہیں مگر محاوروں اور ضرب الامثال میں فرق یہ ہے کہ محاورے جملوں میں استعمال کیے جانے کے محتاج ہیں جب کہ ضرب المثل اپنے آپ میں مکمل ہے۔ زیر نظر مثنوی میں ایسے اشعار موجود ہیں جن میں کئی ضرب المثل شامل ہے۔ مثلاً

رگوں میں لہو کے روانی ہے ایک
کہ ندیاں کئی اور پانی ہے ایک
عزیز جہاں سے یہ کسب کمال
کمال ایسا جس میں نہیں ہے زوال
یہی میرا آنگن، یہی میرا گھر
جواں میں ہوا ہوں جہاں کھیل کر

محبت پہ تہذیب کی ہے اساس
محبت ہی آئی ہے دنیا کو راس
نظر پیار کے گیت گانے لگی
جواں شب بدن میں نہانے لگی

مذکورہ بالا شعروں میں ایسی معنویت اور غنائیت ہے کہ وہ ذہن میں محفوظ ہو جاتی ہیں۔ مثنوی 'عکس کوکن' کے کئی شعر میرے ذہن میں محفوظ ہیں اور نہ صرف محفوظ ہیں بلکہ موقع محل پر انھیں دوہراتا بھی رہتا ہوں۔ ضرب المثل اشعار کا مطلب بھی یہی ہے کہ وہ محاوروں اور کہاوتوں کی طرح زبان پر آجائیں۔ یہ ضروری نہیں ہے کہ شعروں میں ضرب المثل شامل ہو۔ ضرب المثل اشعار وہ ہیں جو خود ضرب المثل کی حیثیت حاصل کر لیتے ہیں۔ بعض مصرعوں میں بھی یہ خاصیت ہوتی ہے کہ وہ ضرب المثل کی طرح استعمال ہوتے ہیں۔ زیر نظر مثنوی میں ایسے مصرعوں کی کثرت ہے۔ مثلاً

محبت کی سوغات لے جایئے
پکارے نہ پھر آستیں کا لہو
لبوں کو کرے سرخ مثلِ گلاب
علاقہ ہے کوکن کا جنت نشاں
یہاں قدر انساں کی ہے علم سے
نہ کالا نہ گورا بدن کا لہو
جوانی میں اک دن کے سلطان سب
زمیں پر ستاروں کی بارات ہے

اس قسم کے کئی مصرعے ضرب المثل بن سکتے ہیں جو اس مثنوی میں موجود ہیں۔

زیر نظر مثنوی کے اسلوب کی ایک بڑی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں رعایت لفظی بکثرت موجود ہے۔ سچ پوچھیے تو رعایت لفظی شعر کا حسن ہے، عیب نہیں۔ لیکن جہاں صرف الفاظ کی رعایت ہو اور معنی و مفہوم معدوم ہو ں تو وہاں یہ صنعت عیب بن جاتی ہے۔ اختر راہی نے اس صنعت کو بڑے ہی مناسب طریقے سے برتا ہے اور اس رنگ میں انھیں ید طولی حاصل ہے۔ رعایت لفظی کیا ہے؟ الفاظ کی جادوگری ہے۔ دیکھیے۔

بتوں کی خدائی، خدائی کی شان
دھڑکتا ہے جس جا دل رفتگاں
تبسم، تکلم، تڑپ، شوخیاں
لہو پتھروں کی رگوں میں رواں
ہے موہوم و موجود جلوہ نما
ہیں اوصاف معبود جلوہ نما
عیاں بھی نہاں بھی جمال ازل
لب سنگ پر میر کی ہے غزل
لب سنگ ہے زمزمہ آفریں
رگ سنگ میں ہیں شرر جا گزیں

رعایت لفظی اور صنائع و بدائع کا یہ اعلیٰ اور رواں انداز ہے۔ تشبیہوں، استعاروں اور محاوروں کے برجستہ استعمال سے مثنوی 'عکس کوکن' بیان کا ایک طلسم بن گئی ہے۔

مثنوی " عکسِ کوکن " اختر راھی کی معرکۃ الآرا مثنوی ھے جسے اردو کی اھم مثنویوں کے ساتھ رکھا جاسکتا ھے مگر جب ان کے آخری دن یاد آتے ھیں اور جب وہ سینٹ جارج اسپتال ، ممبئی میں داخل اور تعاون کے محتاج تھے تو شرمندگی ھوتی ھے کہ خود ستائی میں بڑی بڑی رقم خرچ کرنے والے " عکس کوکن" کی تخلیق کرنے والے شاعر کی بر وقت مدد نہ کرسکے ۔

مثنوی 'عکس کوکن' میں اختر راہی نے منظر نگاری کے جوہر بھی دکھائے ہیں۔ یوں بھی مثنویوں میں منظر نگاری کا ایک خاص ڈھنگ نظر آتا ہے۔ مثنویوں میں محاکات کی بڑی اہمیت ہوتی ہے۔ محاکات دراصل شاعرانہ مصوری ہے جس میں انسان کے جذبات، واردات قلبی اور اطراف و اکناف کے حالات کی تصویریں پیش کی جاتی ہیں جسے نیچرل شاعری کا نام بھی دیا جا سکتا ہے۔ اس کے تحت فطرت کی رعنائیاں اور رنگینیاں بیان کی جاتی ہیں۔ خاص طور سے مثنویوں میں یہ مناظر اپنی بہار دکھاتے ہیں۔ اردو مثنویوں میں ابتدا ہی سے اس طرح کی شاعری کے نمونے مل جاتے ہیں ۔خصوصیت کے ساتھ 'عکس کوکن' کی منظر نگاری بھی خوب ہے۔ یہاں کی طرز معاشرت، عادات و اطوار، زبان و بیان، ساحل سمندر پر پہاڑوں، ڈھلوانوں اور میدانوں سے عبارت سنگلاخ مگر قدرت کی فیاضیوں سے مالا مال انتہائی خوبصورت خطہ کوکن کی منظر کشی دیدنی ہے۔ اس لیے مثنوی کا ہر شعر تکلف اور مبالغے سے مبرا ہونے کے باوجود جاندار معلوم ہوتا ہے۔ چند مثالیں ملاحظہ ہوں:

پہاڑوں کے دامن میں آبادیاں
جہاں حسن لیتا ہے انگڑائیاں
سمندر کے پہلو میں آباد گانو
کہ دھوتی ہے موجیں مکانوں کے پانو
سمندر کے پر پیچ ساحل دراز
کسی شوخ کے جیسے کاکل دراز
کناروں پہ ہیں جھنڈ اشجار کے
ثمر جن کے تحفے نشاں پیار کے
پہاڑوں پہ ہیں بار آور شجر
نگاہوں کی راحت سکون نظر

اختر راہی نے اس مثنوی میں اکثر مقامات پر قدرت کی منظر نگاری پیش کرنے میں تشبیہات کا استعمال کیا ہے جو بہت خوبصورت ہے۔

غرض کہ بلاغت و فصاحت کے جتنے بھی فراموش شدہ محاسن ہیں اس مثنوی میں جگہ جگہ ملتے ہیں۔ بحر، ردیف، قافیہ، وزن و آہنگ، تشبیہ و استعارہ، صوری و بصری، سمائی اور محسوساتی پیکروں اور دیگر پیرایوں سے کہیں پر زور اور کہیں کمزور بیان کے ذریعے اس مثنوی میں شعریت کی تخلیق کی گئی ہے۔ مثنوی کا آغاز افسانوی رنگ لیے ہوئے ہے جو قاری کو ابتدا ہی سے اپنی گرفت میں لے لیتا ہے اور اختتامیہ بھی بے حد خوبصورت ہے۔ جس منطقی ربط و تسلسل اور تناسب و توازن کے ساتھ اختر راہی نے اس صنف کو اختیار کیا ہے اس کی تمام فنی شرائط کو پورا کرنے میں کوئی کمی بھی نہیں چھوڑی ہے۔ بہر حال مثنوی 'عکس کوکن' اختر راہی کی معرکۃ الآرا مثنوی ہے جسے اردو کی اہم مثنویوں کے ساتھ رکھا جا سکتا ہے مگر جب ان کے آخری دن یاد آتے ہیں اور جب وہ سینٹ جارج اسپتال، ممبئی میں داخل اور تعاون کے محتاج تھے تو شرمندگی ہوتی ہے کہ خود ستائی میں بڑی بڑی رقم خرچ کرنے والے '' عکس کوکن'' کی تخلیق کرنے والے شاعر کی بروقت مدد نہ کر سکے۔

■

Dr. Mohd. Danish Gani
Dept. of Urdu
Gogate Jogalekar College (Autonomous)
Ratnagiri - 415 612
Mobile No. 7558600893, 9372760471

مزمل سرکھوت

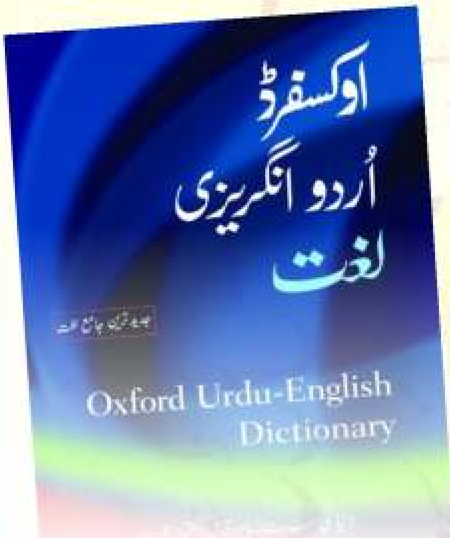

مستشرق اردو لغت نویس

ہمارے تعلیمی نظام میں شاعری اور نثر کی مختلف اصناف کے مطالعے اور تحقیق کا چلن تو موجود ہے، مگر ترجمہ اور اس کے انسلاکات، اصطلاح سازی، محاورات، ضرب الامثال اور لغت نویسی جیسے اہم موضوعات پر ہماری توجہ کم ہے۔اس فہرست میں تخلیقی صلاحیت کو بھی شامل کر لینا چاہیے۔

جان اے ہیووڈ اپنی کتاب ''عربک لیکسی کوگرافی'' مطبوعہ 1965ء میں لغت نویسی کی ابتدا اور مختلف زبانوں میں اس کی روایت کے تعلق سے رقمطراز ہیں:

''مختلف زبانوں کی لغت نویسی کی تاریخ سے اس بات کی تصدیق ہوتی ہے کہ لغت نویسی کا سلسلہ بہت قدیم نہیں ہے۔شروعات میں محدود الفاظ اور ان کی فرہنگ تیار کی گئی، اس کے بعد صوتی اصولوں کی بنیاد پر تمثیلی حروف تہجی کے تحت لغات بنائی گئیں، بعد ازاں حروف کے اعداد کو مدنظر رکھتے ہوئے الفاظ کی منفرد تفہیم کی کوشش کی گئی، اس کے بعد الفاظ کے اصل قافیے کی بنیاد پر یعنی آخری حروف پر منحصر لغت ترتیب دی گئی۔ ابتدا میں چند مصنفوں (لغت نویسوں) نے موجودہ نظام تصنیف لغت یعنی منضبط حروف تہجی کی بنیاد پر لغت کی ترتیب وتدوین کے طریقے کو اپنایا تھا مگر اسے پسند نہیں کیا گیا تھا۔دراصل اس وقت اکثر لغت نویسوں اور لغت کے قارئین کا سب سے اہم مقصد چند نایاب، کم یاب اور مشکل الفاظ کی تفہیم ہوتا تھا۔'' (دیباچہ ص 1)

مختلف ادوار میں مخصوص الفاظ کے مفاہیم تک محدود لغات کی تدوین وتصنیف کا کام کیا گیا، لغت اور فرہنگ کو مسافروں اور اجنبیوں کی راہنمائی کا ذریعہ سمجھا جاتا تھا۔ جان اے ہیووڈ نے فرہنگ (Vocabulary) اور لغت (Dictionary) میں ایک باریک فرق کی نشاندہی کرنے کی کوشش کی ہے مگر پھر وہ خود ہی ان دونوں کے درمیان فرق نہ ہونے کی گواہی دیتے ہیں۔

لغت نویسی ایک مشکل فن هے. تاهم یه آج جس شکل میں دنیا کی ترقی یافته اور غیر ترقی یافته زبانوں میں رائج هے ، اسے اس مقام کو حاصل کرنے تک کئی مراحل سے گزرنا پڑا هے.لغت ایک ایسی تصنیف هوتی هے جس میں لفظ کے معنی, تذکیر وتانیث ، قواعدی ساخت, لسانی شناخت اور اس کے استعمال کے مختلف اسلوب کی تفصیل درج هوتی هے. لغات هر زبان کے حروف تهجی کی ترتیب کے مطابق تصنیف کی جاتی هیں.اردو زبان میں بھی لغات تیار کی گئی هیں.

انھوں نے لکھا'' لغت اور فرہنگ کے مختلف استعمال ہیں۔لغت کسی اجنبی لفظ کے معنی جاننے کے لیے استعمال کی جاتی تھی جبکہ فرہنگ مصنف کے لیے مواد جمع کرنے کا ذریعہ ہوتی تھی۔''(ص4) آگے اس بات کی نفی خود کرتے ہیں'' لغت اور فرہنگ میں کوئی نہایت مضبوط تفریق نظر نہیں آتی۔''(ص4)

لغت نویسی ایک مشکل فن ہے۔تاہم یہ آج جس شکل میں دنیا کی ترقی یافتہ اور غیر ترقی یافتہ زبانوں میں رائج ہے، اسے اس مقام کو حاصل کرنے تک کئی مراحل سے گزرنا پڑا ہے۔لغت ایک ایسی تصنیف ہوتی ہے جس میں لفظ کے معنی، تذکیر وتانیث، قواعدی ساخت، لسانی شناخت اور اس کے استعمال کے مختلف اسلوب کی تفصیل درج ہوتی ہے۔لغات ہر زبان کے حروف تہجی کی ترتیب کے مطابق تصنیف کی جاتی ہیں۔اردو زبان میں بھی لغات تیار کی گئی ہیں۔غرائب اللغات (ملا عبدالواسع ہانسوی)، نوادرالالفاظ (سراج الدین خان آرزو)، نفائس اللغات (مولوی احدالدین بلگرامی)، نفس اللغہ (میر علی اوسط اشک)، منتخب النفائس (محبوب علی رامپوری)، امیراللغات (امیر مینائی)، فرہنگ آصفیہ (مولوی سید احمد دہلوی)، نوراللغات (نورالحسن نیر کاکوروی)، جامع اللغات (خواجہ عبدالحمید)، فرہنگ اثر (نواب جعفر علی خان اثر لکھنوی)، مہذب اللغات (مہذب لکھنوی)، فرہنگ

عامرہ (عبداللہ خویشگی)، لغت کبیر (مولوی عبدالحق) وغیرہ وغیرہ لغات ذخیرہ اردو کو اپنے دامن میں سمیٹے ہوئے ہیں۔

کئی اصناف کی طرح اردو میں لغت نویسی کا چراغ بھی انگریزوں نے روشن کیا۔ اول تو تجارت کی غرض سے مقامی زبان سیکھنے کا عمل انگریزوں کے لیے لازمی ہوا اور پھر رفتہ رفتہ یہاں کی حکومتوں کی کمزوریوں کا فائدہ اٹھا کر انھوں نے مختلف صوبہ جات پر قبضہ کرنا شروع کیا اور یہ سلسلہ مکمل ملک کے اقتدار کے حصول تک جاری رہا۔ تجارت میں کامیابی اور پھر کچھ صوبوں میں جزوی اقتدار نے انگریزوں کے حوصلے کافی بلند کر دیے تھے۔ اب انھوں نے تجارتی نقطہ نظر سے منفعت بخش اس برصغیر کی روح کو ٹٹولنا شروع کیا۔ انھوں نے یہاں کی تہذیب و ثقافت سے ہم آہنگی پیدا کرنے کی کوشش کی۔ یہاں کے تعلیمی شعبہ جات میں جدت کو فروغ دیا۔ یہاں کی لنگوا فرینکا یعنی ہر جگہ بولی اور سمجھی جانے والی زبان پر دسترس حاصل کرنے کی کوشش کی۔ وہ اس زبان کو ''ہندوستانی''، ''ہندی''، ''ریختہ''، ''ہندوی'' کہتے تھے جس سے ان کی مراد اردو تھی۔ اس وقت حکومتی سطح پر فارسی زبان کا رسوخ تھا۔ لیکن انگریزوں نے سمجھ لیا تھا کہ عوام الناس فارسی سے نابلد ہے اور وہ ایک ایسی زبان کی پرورش کر رہی ہے جس سے اشرافیہ طبقہ ناآشنا ہے۔ لہٰذا انھوں نے عوام الناس کی زبان کو اہمیت دینے کا فیصلہ کیا۔

اس دور میں انگریزوں نے یورپ سے آنے والے اپنے افسران کے لیے ''ہندوستانی'' سیکھنا لازمی قرار دیا تھا۔ اور اس سلسلے میں ان کے لیے نصاب تیار کیا گیا تھا۔ اسی نصاب کی تیاری میں ہندوستانی الفاظ کی لغت، محاورات اور اصطلاحات وغیرہ کو محفوظ کر دیا گیا تھا۔ ہندوستانی منشیوں کے ساتھ مل کر مستشرقین نے اردو میں مختلف عنوانات کے تحت کتابیں لکھنا شروع کیا۔ ان عنوانات میں لغت سب سے اہم تھا۔ مزید برآں فورٹ ولیم کالج کلکتہ میں ہندوستانی زبان میں عربی، فارسی اور سنسکرت کی قدیم کہانیوں کو ترجمہ کے ذریعے منتقل کرنے کا اہم کارنامہ انجام دیا گیا۔ ہندوستانی زبان کو دو مختلف اسلوب عطا کیے گئے۔ ایک نے دیوناگری رسم الخط کو اپنایا اور دوسرے نے فارسی عربی رسم الخط اختیار کیا۔ بعض ماہرین السنہ کا ماننا ہے کہ

اردو زبان وادب کے طالب علم کے لیے جان گلکرسٹ کی شناخت فورٹ ولیم کالج کے پہلے پرنسپل اور ہندوستانی شعبے کے سربراہ کی ہے۔ فورٹ ولیم کے قیام سے چار سال تک یعنی 1804 تک وہ کلکتے میں ہندوستانی شعبے کے سربراہ بنے رہے اور اس دوران کئی شاہ کار کتابیں فورٹ ولیم کالج سے شائع ہوئیں جنھوں نے اردو ادب میں بیش بہا اضافہ کیا۔

''ہندوستانی'' دراصل وہی زبان ہے جو فارسی عربی رسم الخط میں لکھی جانے لگی تھی، جس کی پرورش دکن میں نہایت ناز و نعم سے ہوئی اسے دکنی اردو کہا جاتا تھا، پھر یہ علاقوں کی نسبت سے منسوب ہونے لگی، یعنی دہلی میں دہلوی اور گجرات میں گجری وغیرہ۔

لغت کے لیے انگریزی میں لیکسی کن اور ڈکشنری کے الفاظ ملتے ہیں۔ اور لغت نویس کو لیکسی کو گرافر کہتے ہیں لغت نویسی کو لیکسی کو گرافی کہتے ہیں، علم لغت کو لیکسی کولوجی کہتے ہیں اور فارسی میں لغت کو فرہنگ اور عربی میں اسے قاموس کہتے ہیں۔ مختلف ذرائع سے مستشرقین لغت نویسوں کے تعلق سے جو معلومات حاصل ہوئی ہیں اسے ترتیب وار پیش کرنے کی کوشش اس مضمون میں کی جارہی ہے۔

جان برتھوک گلکرسٹ 19 جون 1759 کو اسکاٹ لینڈ میں پیدا ہوئے۔ وہ پیشے کے اعتبار سے ایک سرجن تھے۔ ہندستان میں ملازمت کے دوران انھوں نے یہاں کی زبان سیکھی اور اسے اپنے لیے مناسب تصور کیا۔ اور باقی ماندہ زندگی میں اسی زبان کی درس و تدریس کو اپنا مقصد بنالیا تھا۔ انھوں نے زبان کے قواعد لکھے، کچھ ترجمہ کیا اور ایک لغت بھی ترتیب دی۔ یہ انگلش میں ہندستانی ڈکشنری تھی۔ جسے اولیت کا شرف حاصل ہے۔ اس لغت کی تیاری میں گلکرسٹ کے ساتھ تھامس ریوبک معاون کی حیثیت سے شریک تھے۔ اردو زبان وادب کے طالب علم کے لیے جان گلکرسٹ کی شناخت فورٹ ولیم کالج کے پہلے پرنسپل اور ہندوستانی شعبے کے سربراہ کی ہے۔ فورٹ ولیم کے قیام سے چار سال تک یعنی 1804 تک وہ کلکتے میں ہندستانی شعبے کے سربراہ بنے رہے اور اس دوران کئی شاہ کار کتابیں فورٹ ولیم کالج سے شائع ہوئیں جنھوں نے اردو ادب میں بیش بہا اضافہ کیا۔ کلکتہ سے سبکدوش ہو کر گلکرسٹ لندن گئے اور وہاں یونیورسٹی کالج، لندن میں اردو یا ہندوستانی کے پروفیسر مقرر ہوئے۔ انھوں نے اپنے آخری ایام پیرس میں گزارے اور وہیں پر 1841 میں ان کا انتقال ہوا۔

جان شیکسپیر 1774 کو پیدا ہوئے اور 58 میں ان کا انتقال ہوا۔ انھوں نے اپنی پوری زندگی برطانیہ میں ہی گزاری، لیکن وہاں انھیں ہندوستانی اور عربی سیکھنے کے مواقع ملے۔ انھوں نے تعلیم کی تکمیل کے بعد ابتدا میں مارلو کے ایک کالج رایل ملٹری کالج میں ان متوقع امیدواروں کو پڑھانا شروع کیا جنھیں ملازمت کے سلسلے میں ایسٹ انڈیا کمپنی کی طرف سے ہندوستان آنا تھا۔ برطانیہ میں کئی ایسے ادارے وجود میں آ چکے تھے جہاں ہندوستانی یا اردو پڑھائی جاتی تھی۔ بہت جلد ترقی پاتے ہوئے جان شیکسپیر نے اڈیسکامب ملٹری سیمینری میں ہندوستانی کے پروفیسر کی

حیثیت سے تقرر حاصل کرلیا۔ یہاں انھوں نے تقریباً بیس برس تک اردو کی تدریس کا فریضہ انجام دیا۔اس دوران انھوں نے جان گلکرسٹ کی لکھی ہوئی اردو زبان کے قواعد کو وسعت دیتے ہوئے ایک کتاب ترتیب دی اور ''ہندوستانی گرامر'' کے نام سے اسے شائع کیا، دراصل اس وقت تک گلکرسٹ کی کتاب نایاب ہوچکی تھی، لہٰذا جان شیکسپیر کی کتاب نصاب میں شامل کر لی گئی۔مزید برآں 1817 میں پہلی بار ان کی ڈکشنری آف ہندوستانی اور انگلش شائع ہوئی۔اس کی مقبولیت کا عالم یہ تھا کہ 1834 میں لندن سے اس ڈکشنری کا تیسرا ایڈیشن شائع کیا گیا۔

ڈنکن فوربس ہندوستان میں بھی متحرک رہے ہیں اورلندن میں بھی۔وہ 28 اپریل 1798 کو اسکاٹ لینڈ میں پیدا ہوئے۔باغ وبہار، حاتم طائی، بیتال پچیسی جیسی کلاسیکی تخلیقات کا انگریزی میں ترجمہ ڈنکن فوربس کا ناقابل فراموش کارنامہ ہے۔انھیں عربی، فارسی اور ہندوستانی اردو کے قواعد سے یک گونہ دلچسپی تھی۔اس سلسلے میں ان کی کتابیں اہم کردار ادا کرتی ہیں، خاص طور پر'' دی گرامر آف عربک لینگویج''، ''اے نیو پرشین گرامر''اور'' دی بنگالی ریڈر''۔ڈنکن فوربس کو یونیورسٹی آف سینٹ انڈریوز اسکاٹ لینڈ سے ماسٹرس کی سند حاصل کرنے کے بعد کلکتہ اکاڈمی میں منتخب کیا گیا اور وہ ہندوستان وارد ہوئے۔تاہم یہاں کی آب وہوا انھیں راس نہیں آئی اور وہ مختصر عرصے کے بعد لندن چلے گئے جہاں کنگس کالج لندن میں انھیں مشرقی السنہ کے پروفیسر کے طور پر مقرر کیا گیا اور یہیں سے وہ سبکدوش بھی ہوئے۔ یہاں رہتے ہوئے انھوں نے کئی کارہائے نمایاں انجام دیے۔ درج بالا کارناموں کے علاوہ انھوں نے مشہور زمانہ برٹش میوزیم میں فارسی مخطوطات کی ترتیب میں نہایت اہم کردار ادا کیا۔ان کی لغت ''اے ڈکشنری آف ہندوستانی اینڈ انگلش''، پہلی بار 1848 میں شائع ہوئی۔سنجیدہ مستشرقین کی اردو یا ہندوستانی کے سلسلے میں اور خاص طور پر لغت کے سلسلے میں بیداری قابل رشک ہے۔وہ مقامی اردو دانوں کے لیے مشعل راہ بنے۔

ڈنکن فوربس کی لغت نہایت مقبول ہوئی تھی۔ ان کا انتقال 17 اگست 1868 کو ہوا۔

تھامس رپوبک کا ذکر جان گلکرسٹ کے ساتھ گزرا ہے۔انھوں نے بحری اصطلاحوں پر مشتمل ایک لغت '' این انگلش ہندوستانی ڈکشنری یا نول ڈکشنری'' (1811) ترتیب دی تھی جسے تقریباً ستر سال بعد جارج اسمال نے ''لشکری لغت'' (1882) کے نام سے اخذ و اضافے کے ساتھ دوبارہ شائع کیا۔

ایس ڈبلیو فیلن 1817 کو پیدا ہوئے اور 1880 میں ان کا انتقال ہوا۔وہ ہندوستان میں پیدا ہوئے اور لندن میں وفات پاگئے۔ انھوں نے بنگال ایجوکیشن ڈپارٹمنٹ میں ملازمت کی۔ان کی لغت ''اے نیو ہندوستانی انگلش ڈکشنری'' انتہائی مقبول رہی ہے۔ انھوں نے اس لغت کی تیاری کے دوران ہندوستانی منشیوں کی خدمات حاصل کیں۔ان میں مشہور زمانہ'' فرہنگ آصفیہ'' کے مرتب خان صاحب مولوی سید احمد دہلوی کے علاوہ لالہ فقیر چند، چرنجی لال، لالہ ٹھاکر داس، لالہ جگناتھ وغیرہ شامل ہیں۔فیلن کی یہ لغت ان کی وفات سے محض ایک سال قبل یعنی 1879 کو شائع ہوئی۔اس لغت کے علاوہ بھی فیلن کے کئی کام ہیں۔انھوں نے محاوروں کی ایک لغت تیار کی جسے ''اے ڈکشنری آف ہندوستانی پرووربس'' کے نام سے شائع کیا گیا۔'' اے نیو انگلش ہندوستانی ڈکشنری''، ''این انگلش ہندوستانی لا اینڈ کمرشیل ڈکشنری'' اور ''اردو ریڈر'' جیسی اہم کتابیں اس سلسلے میں نمایاں ہیں۔فیلن نے اس وقت کے نظر انداز کیے ہوئے اردو کے شاعر نظیر اکبر آبادی کی اہمیت کو جان لیا تھا، انھوں نے لغت کے مقدمے میں نظیر اور ان کی شاعری کا ذکر کیا ہے۔

ڈنکن فوربس ہندوستان میں بھی متحرک رہے ہیں اور لندن میں بھی۔وہ 28 اپریل 1798 کو اسکاٹ لینڈ میں پیدا ہوئے۔باغ وبہار، حاتم طائی، بیتال پچیسی جیسی کلاسیکی تخلیقات کا انگریزی میں ترجمہ ڈنکن فوربس کا ناقابل فراموش کارنامہ ہے۔

جان تھامس پلیٹس ہندوستان میں مرکزی صوبہ جات کے انسپکٹر آف اسکول تھے۔حالانکہ ان کی پیدائش کلکتہ میں ہوئی مگر ان کی تعلیم لندن میں تکمیل کو پہنچی۔ تعلیم کی تکمیل کے بعد پلیٹس ہندوستان واپس آئے اور مختلف اسکولوں میں مدرس کی حیثیت سے خدمات انجام دیں۔اور پھر ترقی کرتے ہوئے انسپکٹر آف اسکول ہوئے۔وہ 1830 میں پیدا ہوئے۔صرف 42 سال کی عمر میں وہ کمزور جسمانی حالت کی وجہ سے سبکدوش ہوئے اور 1872 کو لندن چلے گئے، اور وہاں آکسفورڈ یونیورسٹی میں فارسی کے استاد مقرر ہوئے۔ لندن کے آکسفورڈ پریس سے ان کی لغت '' اے ڈکشنری آف اردو، کلاسیکل ہندی اور انگلش'' 1884 میں شائع ہوئی۔لندن ہی میں پلیٹس 1904 میں انتقال کرگئے۔ان کی دیگر تصانیف میں ''گرامر آف ہندوستانی لینگویج''، ''ہندوستانی انگلش ڈکشنری'' اور'' گرامر آف پرشین لینگویج'' اہم ہیں۔ان کے علاوہ شیخ سعدی کی گلستان کا انگریزی ترجمہ ان کا غیر معمولی کام ہے۔

جوزف ہیلڈ ورگارساں دتاسی، ڈاکٹر رابرٹ ہنٹر، ڈاکٹر ہیرس وغیرہ مستشرقین نے اردو قواعد اور لغت کے تعلق سے کئی تصانیف یادگار چھوڑی ہیں۔ ڈاکٹر ہیرس کی ''ڈکشنری آف انگلش اینڈ ہندوستانی''، ڈاکٹر رابرٹ ہنٹر کی '' انسائیکلو پیڈیک ڈکشنری'' اور ''اے ہسٹری آف انڈیا'' جیسی معلومات افزا کتابیں اردو زبان اور اس عہد کو سمجھنے میں معاون ہیں۔

ماخذ

1 عربک لیکسی کو گرافی (انگریزی) از جان اے ہیووڈ، ای جے برل، لیڈن، نیدرلینڈ 1956

2 اردو انگریزی لغات: مستشرقین کے چند مسائل (Some Issues with the Orientalists: Urdu English Dictionaries)

■

Dr. Muzammil Sarkhot
Flat No.203, C Wing, Ghansar Complex
Mahsaliah, Rai Garh, Kokin (M.S)
Mob:7715918648/9527541533
Email:muzammilsir81@gmail.com

تبصرہ و تعارف

تبصرہ نگاری ادبی تنقید ہی کی ایک شکل ہے جس میں کتاب کے مواد، اسلوب اور معیار کا تجزیہ پیش کیا جاتا ہے اور کتاب کے مشمولات کے تعلق سے قارئین کو اہم معلومات فراہم کی جاتی ہیں۔ اردو میں تبصرہ نگاری کی ایک مضبوط اور مستحکم روایت پائی جاتی ہے۔ قدیم رسائل و مجلات نے نئی مطبوعات سے متعارف کرانے میں اہم کردار ادا کیا ہے۔ تبصرہ ایک ذمہ داری کا عمل بھی ہے۔ اس لیے مبصرین کو تبصرہ کرتے وقت غیر ضروری تمہید، طوالت، تحسین اور نکتہ چینی سے گریز کرتے ہوئے کتاب کے اہم نکات پر اظہار خیال کرنا چاہیے۔ رسالے میں اردو زبان و ادب سے متعلق انگریزی، ہندی یا دیگر زبانوں میں شائع ہونے والی کتابوں پر تبصرے بھی شامل کیے جاتے ہیں۔ لہٰذا مبصرین اس جانب بھی توجہ فرمائیں۔ (ادارہ)

خطباتِ مودی: لال قلعہ کی فصیل سے

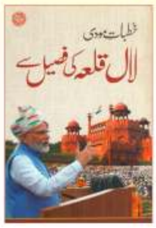

تالیف: عزت مآب وزیر اعظم نریندر مودی
صفحات: 342، قیمت: 250 روپے، سن اشاعت: 2025
ناشر: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی
مبصر: جاوید عالم، اعظم پور دہپہ، پلکھوا، ضلع ہاپوڑ، یوپی۔ 245304

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی کی تازہ ترین اشاعت 'خطبات مودی: لال قلعہ کی فصیل سے' عزت مآب وزیر اعظم نریندر مودی کی ان تقریروں کا مجموعہ ہے جو 2014 سے 2025 تک 15 اگست کے موقع پر لال قلعہ کی تاریخی فصیل سے راشٹر کو مخاطب کرتے ہوئے کی گئی ہیں۔ یہ کتاب محض الفاظ کا مجموعہ نہیں ہے بلکہ گزشتہ تقریباً ایک دہائی میں بھارت کے بدلتے ہوئے سماجی، اقتصادی اور سیاسی منظر نامے کی ایک دستاویزی تاریخ بھی ہے۔

لال قلعہ دراصل بھارت کی آزادی اور خود مختاری کی علامت ہے۔ یہاں سے کیا جانے والا خطاب محض ایک رسمی تقریر نہیں ہوتی بلکہ یہ حکومت کی ترجیحات، عوامی فلاح و ترقی پر مبنی اسکیموں، مستقبل کے لائحہ عمل اور ملک کے تئیں ایک وژن کا بیانیہ ہوتا ہے۔ 'خطبات مودی' ان تمام پیغامات کو یکجا کرتی ہے جو 2014 سے اب تک وزیر اعظم نے عوام تک پہنچانے کی کوشش کی ہے۔ اردو زبان میں اس مجموعے کی اشاعت اس لحاظ سے بھی اہم ہے کہ یہ اردو داں طبقے کو براہ راست حکومتی وژن اور پالیسیوں کو سمجھنے کا موقع فراہم کرتی ہے۔

وزیر اعظم جناب نریندر مودی نے لال قلعہ کی فصیل سے متعدد خطابات کیے ہیں۔ ان میں سے ہر تقریر اپنی ایک منفرد اہمیت کی حامل ہے تاہم ان کی بعض تقریریں ایسی ہیں جو بحیثیت وزیر اعظم ان کے وژن اور مشن کی کلید قرار دی جا سکتی ہیں۔ مثلاً 2014 میں وزیر اعظم بننے کے بعد مودی جی کا پہلا خطاب اپنی سادگی اور بلند عزائم کی وجہ سے خاصا یادگار رہا۔ انھوں نے خود کو وزیر اعظم کے بجائے 'پردھان سیوک' کے طور پر متعارف کرایا۔ اس تقریر کی خاص بات 'سوچھ بھارت ابھیان' کا اعلان تھا جس نے صفائی کو ایک عوامی تحریک بنا دیا۔ اس کے علاوہ انھوں نے 'میک ان انڈیا' کا تصور پیش کیا۔ جس کا مقصد بھارت کو عالمی سطح پر مینوفیکچرنگ کا مرکز بنانا اور نوجوانوں کے لیے روزگار کے مواقع پیدا کرنا تھا۔

دوسری بار اقتدار سنبھالنے کے بعد 2019 کی تقریر Strategic اہمیت کی حامل تھی۔ اس میں انھوں نے آرٹیکل 370 کے خاتمے کو 'ایک قوم، ایک آئین' کے خواب کی تعبیر قرار دیا۔ سماجی فلاح و بہبود کے حوالے سے انھوں نے 'جل جیون مشن' کا اعلان کیا تاکہ ہر گھر تک پینے کا صاف پانی پہنچایا جا سکے۔ اسی خطاب میں انھوں نے بھارت کو 'پانچ ٹریلین ڈالر' کی معیشت بنانے کا ہدف بھی طے کیا، جس نے ملک کے معاشی مستقبل کا ایک واضح روڈ میپ پیش کیا۔

2024 کا خطاب اس لحاظ سے غیر معمولی اہمیت کا حامل ہے کہ اس میں وزیر اعظم نے آزادی کے سو سال مکمل ہونے (2047) تک بھارت کو ایک ترقی یافتہ ملک (وکست بھارت) بنانے کا عزم دوہرایا۔ انھوں نے اپنی اس تقریر میں 'ون نیشن، ون

الیکشن' جیسی بڑی انتظامی اصلاحات کی وکالت کی۔ یہ خطاب مستقبل کے بھارت کی تصویر پیش کرتا ہے جس میں ٹیکنالوجی، خود انحصاری (آتم نربھر بھارت) اور عالمی قیادت پر توجہ مرکوز کی گئی ہے۔

عزت مآب وزیراعظم نریندر مودی کے خطبات کی سب سے بڑی خصوصیت ان کا عوامی رابطہ (Mass Contact) ہے۔ کتاب کے مطالعے سے یہ واضح ہوتا ہے کہ وہ ایک مدبر اور ماہر سیاستداں ہونے کے ساتھ ساتھ ایک بہترین خطیب بھی ہیں۔ ان کے جملوں کی ساخت سادہ لیکن اثر انگیز ہوتی ہے۔

وہ 'بھائیوں اور بہنوں' یا 'میرے پیارے ہم وطنوں' جیسے الفاظ و القاب سے عوام کے ذہنوں میں جو اثر پیدا کرتے ہیں وہ قاری کو یہ احساس دلاتا ہے کہ یہ خطاب کسی حاکم کا نہیں بلکہ ایک 'پردھان سیوک' کا ہے۔

کتاب میں شامل تقاریر کا مطالعہ کیا جائے تو چند اہم نکات ابھر کر سامنے آتے ہیں:

اصلاحات اور ترقی (Reform, Transform):

وزیراعظم نے بارہا اس بات پر زور دیا ہے کہ ملک کو فرسودہ نظام سے نکال کر جدت اور ترقی کی طرف لے جانا ہے، صفائی ستھرائی (سوچھ بھارت)، ڈیجیٹل انڈیا اور میک ان انڈیا جیسے منصوبوں کا تذکرہ ان کی تقریروں کا مرکز و محور رہا ہے۔

خود انحصاری (Atmanirbhar Bharat):

کتاب کے آخری حصوں میں شامل تقاریر میں 'آتم نربھر بھارت' کا تصور نمایاں ہے۔ یہ وژن دراصل بھارت کو عالمی سطح پر ایک مینوفیکچرنگ ہب بنانے کی طرف اشارہ کرتا ہے۔

سماجی شمولیت (Sabka Saath, Sabka Vikas, Sabka Vishvas):

ان خطابات میں سماج کی آخری صف میں کھڑے شخص کی ترقی پر زور دیا گیا ہے۔ خواتین کی خود مختاری، کسانوں کی فلاح اور نوجوانوں کے لیے روزگار جیسے موضوعات کتاب میں تواتر کے ساتھ ملتے ہیں۔

وزیراعظم اپنی تقاریر میں ہندوستان کی عظیم تاریخ اور مجاہدین آزادی کا ذکر بڑے فخر سے کرتے ہیں۔ کتاب میں شامل ان کے خطبات ہمیں بھگت سنگھ، سبھاش چندر بوس اور مہاتما گاندھی جیسی عظیم شخصیات کی قربانیوں کی یاد دلاتے ہیں۔ 'آزادی کا امرت مہوتسو' کے ذریعہ وہ قوم کو اپنی جڑوں سے جوڑنے کی کوشش کرتے نظر آتے ہیں۔

زیر تبصرہ کتاب 'خطبات مودی: لال قلعہ کی فصیل سے' کا اردو ترجمہ کرتے ہوئے اس بات کو ملحوظ رکھا گیا ہے کہ مودی جی کی تقاریر کا جوش اور ولولہ برقرار رہے۔ اردو زبان کی اپنی ایک مٹھاس اور وقار ہے اور جب اس میں سیاسی اور قومی مسائل و موضوعات پر گفتگو کی جاتی ہے تو وہ زیادہ پُر اثر ہو جاتی ہے۔ کتاب کی زبان سادہ و سلیس ہے تاکہ عام قاری بھی اسے آسانی سے سمجھ سکے۔

کتاب کے آخری ابواب میں 'امرت کال' کا تصور پیش کیا گیا ہے جو آئندہ 25 سالوں میں بھارت کو ایک ترقی یافتہ ملک بنانے کے عزم کا اعادہ کرتا ہے۔ یہ تقاریر محض ماضی کی کامیابیوں کا جشن نہیں ہیں بلکہ مستقبل کے چیلنجز سے نمٹنے کی ایک جامع حکمت عملی بھی ہیں۔ ان تقریروں کی معنویت اور زیر تبصرہ کتاب کی اہمیت و افادیت پر مرکزی وزیر تعلیم جناب دھرمیندر پردھان ان الفاظ میں اظہار خیال کرتے ہیں:

''وزیراعظم کے خطاب میں انتودیہ، غریبوں کی فلاح و بہبود، سوچھ بھارت، 140 کروڑ باشندگان وطن کی امنگوں اور ملک کے لیے متعدد اہم موضوعات کا ذکر ہوتا ہے۔ ایسی کتابیں شہریوں کو ملک کی امنگوں، اہداف اور وزیراعظم کے خیالات سے جوڑنے کا مضبوط وسیلہ ہیں۔''

بطور مجموعی ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ 'خطبات مودی: لال قلعہ کی فصیل سے' قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کی شائع کردہ ایک ایسی دستاویزی کتاب ہے جو سیاست، سماجیات اور تاریخ کے طلبا کے لیے ایک بہترین حوالہ کی حیثیت رکھتی ہے۔ یہ کتاب ہمیں بتاتی ہے کہ کس طرح ایک سیاسی رہنما نے اپنے خیالات کے ذریعے قوم کے اندر امید پیدا کرنے اور اسے ایک بڑے مقصد کے حصول کے لیے متحد کرنے کی کوشش کی ہے۔ ان کی تقریریں 2014 میں امید سے شروع ہوئیں، 2019 میں اعتماد میں تبدیل ہوئیں اور 2025 تک آتے آتے 'ایک ترقی یافتہ بھارت' کے ٹھوس روڈ میپ میں ڈھل گئیں۔ 'خطبات مودی عزت مآب وزیراعظم کے اسی وژن کو یکجا کرنے کی ایک کوشش ہے۔ اگرچہ یہ کتاب ایک سیاسی شخصیت کے خطبات پر مبنی ہے تاہم اس کی اہمیت سیاسی وابستگیوں سے بالاتر ہے۔ یہ نئے بھارت کی تعمیر کی داستان ہے جو ہر اس شخص کو پڑھنا چاہیے جو ملک کی تعمیر و ترقی میں دلچسپی رکھتا ہے۔ اس اہم اور غیر معمولی کتاب کی اشاعت کے لیے ہم قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان اور اس کے نہایت فعال ڈائریکٹر ڈاکٹر شمس اقبال کو مبارک باد پیش کرتے ہیں۔ ہمیں امید بلکہ یقین ہے کہ اردو داں حلقوں میں اس کتاب کی خاطر خواہ پذیرائی ہوگی اور اہل اردو بھی عزت مآب وزیراعظم نریندر مودی کے عظیم تر وژن اور ان کے مشن میں شامل ہو سکیں گے۔

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان نے ادبیات، انسائیکلوپیڈیا لغات، تاریخ، تعلیم و تدریس، زبان و لسانیات، سائنس، تکنیک اور جغرافیہ، سیاست، صحافت، طب و معالجات، فلسفہ، فنونِ لطیفہ، قانون، کتب خانہ داری، معاشیات، تجارت، نفسیات، بچوں کا ادب اور دیگر موضوعات پر بڑی اہم کتابیں شائع کی ھیں۔ کونسل کی تمام مطبوعات درج ذیل پتہ پر حاصل کی جاسکتی ھیں:

شعبۂ فروخت: قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان، ویسٹ بلاک 8، وِنگ 7، آر کے پورم، نئی دہلی۔ 110066

NCPUL, West Block -8, Wing No. 7, R.K. Puram, New Delhi 110066

فون: 011-26109746 فیکس: 011-26108159 E-mail.:ncpulsaleunit@gmail.com, sales@ncpul.in

تحقیق و تنقید

ادب کی تنقیدی تعبیر

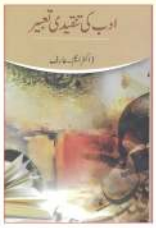

مصنف: ڈاکٹر ایم۔ عارف
صفحات: 147، قیمت: 250، سنہ اشاعت: 2024
ناشر: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، نئی دہلی
مبصر: محمد قمر الزماں قمر، مغربی چمپارن، بہار

’ادب کی تنقیدی تعبیر‘ مختلف مضامین کا مجموعہ ہے جس کے مصنف ڈاکٹر ایم عارف ہیں۔ ڈاکٹر ایم عارف کو مضمون نگاری کا ہنر وراثت میں ملا ہے۔ آپ کے والد محترم جناب ایم۔ عالم ایک مستند اور معتبر مضمون نگار تھے۔ ان کے مضامین کا مجموعہ ’’ادب عکاس حیات‘‘ منظر عام پر آچکا ہے جس کی ادارت کی ذمہ داری ڈاکٹر ایم۔ عارف نے بحسن وخوبی نبھائی اور ایک لائق فرزند ہونے کا حق ادا کردیا۔ زیر غور مجموعہ کے مضامین کا سلسلہ ’’حق گوئی سے شروع ہوتا ہے جس میں مصنف خود کو شاعر، ادیب، ناقد، یا محقق بتانے سے احتراز کرتے ہوئے ادب کا ایک طالب علم اور قاری بتانے میں فخر محسوس کرتا ہے، جو موصوف کی صاف دلی اور انکساری کا مظہر ہے۔ درس وتدریس ایک نیک عمل اور بہترین صدقہ جاریہ ہے یہ صاحب کتاب کا شوق بھی ہے اور پیشہ بھی۔ سچ تو یہ ہے کہ جس کام میں دلچسپی ہوا سے کرنے میں لطف بھی ملتا ہے اور کمال (Perfection) بھی حاصل ہوتا ہے۔ مصنف کا ماننا ہے کہ دنیا کا کوئی ایسا موضوع نہیں ہے جو اچھوتا ہو۔ تقریباً تمام موضوعات پر لکھاریوں نے خامہ فرسائی کی ہے۔ وقت اور حالات کی بنا پر تغیر اور تبدیلی آتی ہے اور آئی بھی ہے۔ گویا نئی بوتل میں پرانی شراب نئے لیبل اور لُک کے ساتھ دستیاب ہے۔ ایسے میں اپنی ایک الگ پہچان بنالینا ایک مشکل ترین عمل ہے۔

’’اردو کی بناوٹ ایک گلدستہ کی طرح‘‘ اس مضمون میں مضمون نگار نے اردو کو انواع واقسام کے پھولوں سے آراستہ ایک گلدستہ سے تعبیر کیا ہے جسے بلا امتیاز مذہب وملت، رنگ ونسل تمام ادبا اور شعرا نے سجایا سنوارا ہے۔ یہ کہنا بالکل غلط ہے کہ اردو کسی خاص فرقے یا مذہب کی زبان ہے۔ اردو سب کی ہے اور سب اردو کے ہیں۔ جو زبان عوام کی ہوا سے مٹا پانا غالباً ناممکن ہے۔ اردو کے شیدائیوں میں سے ایک آنند نرائن ملاّ نے کہا تھا ’’میں اپنا مذہب چھوڑ سکتا ہوں اپنی مادری زبان اردو نہیں چھوڑ سکتا‘‘ (منقول) بابائے اردو مولوی عبدالحق نے یہ تسلیم کیا کہ ’’اردو کی تنظیم اور ترتیب میں اگر ہندو نہ ہوتے تو یہ وجود میں ہی نہیں آسکتی تھی‘‘ اسی طرح بہت سارے غیر مسلم شعرا ادبا اور محبان اردو کے حوالہ جات اور منقولات نے مضمون کو مربوط اور مضبوط بنانے میں اہم رول ادا کیا ہے جو موضوع پر مضمون نگار کی پکڑ کا مظہر ہے۔ ’’اردو میں رجحان ادب‘‘ پر مصنف نے گفتگو کرتے ہوئے یہ بتانے کی کوشش کی ہے کہ سچا ادب کسی رجحان، نظریہ یا تحریک کا محتاج نہیں ہوتا البتہ رجحان ’’نظریہ یا تحریک ادب کا محتاج ضرور ہوتا ہے۔‘‘ اردو نثر نگاری کا گہوارہ۔ فورٹ ولیم کالج ’’ایک معلوماتی مضمون ہے جس سے مصنف کے عمیق مطالعے اور تحقیق کا پتہ چلتا ہے۔‘‘ اردو زبان کے اولین افسانہ نگار۔ سر سید احمد خان ’’میں مختلف ادبا کے ناموں اور حوالہ جات کا ذکر کرتے ہوئے مصنف نے سر سید احمد خان کا افسانہ ’’گزرا ہوا زمانہ‘‘ من وعن پیش کر کے ٹھوس دلائل کے ساتھ یہ ثابت کیا ہے کہ اردو زبان کے اولین افسانہ نگار سر سید احمد خان ہی تھے۔ حالانکہ وہ ایک مفکر اور مصلح قوم تھے تاہم قوم کے نونہالوں کو بیدار کرنے اور انکی بھلائی کے لیے جس خوبصورتی سے انہوں نے اپنی بات افسانے کے توسط سے عوام تک پہنچائی وہ اپنی مثال آپ ہے۔ گزرا ہوا زمانہ کی تاریخ اشاعت اور کہانی کا تانا بانا وانداز بیان سر سید احمد خان کو افسانہ نگاروں کی پہلی صف میں سب سے پہلے کھڑا کرنے کے لیے کافی ہے۔ ’’ابن صفی۔ اصلاحی ادب کے مبلغ اعظم‘‘ کے عنوان سے پیش کردہ مضمون میں ڈاکٹر ایم۔ عارف نے تفصیلی گفتگو کرتے ہوئے ابن صفی کے ناول کا شاندار تجزیہ پیش کیا ہے۔ یہ بات سچ ہے کہ ابن صفی کے انتقال کے بعد ان کے ناول کا نشہ سر چڑھ کر بولنے لگا اور اہل قلم مقالوں، مضامین اور تحقیق کے توسط سے ان کی عظمت کا اعتراف کیا جانے لگا۔

’’سعادت حسن منٹو فحش نگار یا حقیقت نگار‘‘ ایک جامع اور طویل تجزیہ ہے جس میں تجزیہ کار نے منٹو کے ’’کھول دو‘‘، سہائے، ٹوبہ ٹیک سنگھ، اور نیا قانون پر طویل گفتگو کرتے ہوئے ناقدین اور عام قاری کے سامنے بہت سارے سوال کھڑے کیے ہیں نیز ناقدین کے منٹو کے تئیں منفی رویے سے روشناس کرایا ہے ساتھ ہی یہ بتانے کی کوشش کی ہے کہ منٹو ایک حقیقت نگار تھے، ان کی آنکھیں اتنی روشن تھیں کہ اندھیرے میں بھی معاشرے کے جسم پر ابھرے ناسور دیکھ لیتیں اور ہمہ وقت نشتر لگانے کے لیے تیار رہتیں۔ ’’میر امن، غالب اور مولانا ابوالکلام آزاد کی نثر کا موازنہ‘‘ مختلف حالات اور ادوار کے حوالے سے تینوں کی تحریر میں واضح فرق کی نشاندہی کرتے ہوئے طویل گفتگو اور حوالہ جات کے توسط سے قاری کو تینوں اہم شخصیات کے مضامین اور ان کے اسلوب سے روبرو ہونے اور ایک مثبت نتیجے پر پہنچنے میں تعاون کیا ہے۔ میں مصنف کی اس بات سے متفق ہوں کہ غالب کو میر امن پر، مولانا آزاد کو غالب پر، یا غالب کو مولانا آزاد پر ترجیح دینا مناسب نہیں۔ ’’شاعر مشرق علامہ اقبال کی شخصیت وشاعری‘‘ ایک عمدہ مضمون ہے جس میں علامہ اقبال کی ہمہ جہت شخصیت پر ان کے اشعار کے توسط سے بھرپور روشنی ڈالی گئی ہے ’’قاضی عبدالودود ایک دیوقامت محقق‘‘ کے مطالعہ سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ مصنف کا مطالعہ بہت وسیع ہے۔ ’’ادب میں کوئی کام چھوٹا بڑا نہیں ہوتا کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ ایک افسانہ ایک ناول یا ایک شعر لکھ کر کوئی ادب میں اپنی جگہ محفوظ کر لیتا ہے تو کوئی درجنوں کتابوں کے بعد بھی اپنی پہچان نہیں چھوڑتا۔‘‘

’’کلیم الدین احمد کی تنقید نگاری: ایک جائزہ‘‘ میں اہل علم کے مثبت اور منفی دونوں طرح کے بیانات درج کرتے ہوئے کلیم الدین احمد کی تنقیدی بصیرت پر مضمون نگار نے مدلل روشنی ڈالی ہے۔ اور کہا ہے کہ ’’موصوف یہ چاہتے تھے کہ شعر وادب کا معیار بلند ہو اس کی بساط اور زیادہ وسیع وعریض ہو۔‘‘، ’’جدید تنقید کا نقطہ آغاز مقدمہ شعر وشاعری‘‘ میں مولانا الطاف حسین حالی کو اردو تنقید کا بانی، اصلاحی تحریک کا رکن اور ادب کا معلم مانتے ہوئے ’’مقدمہ شعر وشاعری‘‘ کو حالی کا ایک عظیم الشان کارنامہ بتایا ہے۔ ’’ایم۔ عالم حیات وخدمات‘‘ ایک طویل مضمون ہے جس میں مضمون نگار نے تفصیل سے ایم عالم کی زندگی وحالات کا آغاز سے انجام تک ذکر کیا ہے۔ ’’بتیا کی ادبی خدمات؛ ایک مطالعہ‘‘ ایک ایسا مضمون ہے جس میں

بتیا کے تقریباً تمام ادبا و شعرا کا ذکر ان کی تخلیق کی تاریخ اشاعت، رسائل کے نام کے ساتھ شامل کر کے مضمون نگار نے وسیع القلب ہونے کا ثبوت فراہم کیا ہے۔ اخیر میں ''اردو کی درسی کتاب درخشاں۔ایک تجزیہ'' میں تجزیہ کار نے نصاب کے انتخاب میں ہوئی لا پرواہی اور طلبا کے ساتھ ہوئی نا انصافی وزیادتی کی جانب انتخاب میں شامل اراکین وعہدے داران کا دھیان مبذول کرایا ہے۔انتخاب کنندگان کی کوتاہ بینی، اخلاقی پستی اور جانبداری پر زبردست انگشت نمائی کی ہے۔ جس مواد کا ذکر نصاب میں ہے ہی نہیں اس پر سوال پوچھنا انتخاب کنندگان کی صلاحیت اور فرائض کی ادائیگی پر سوالیہ نشان ثبت کرتا ہے۔ مضمون نگار نے نصاب میں در آئی بہت ساری خامیوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے مرتبین سے ایسے نصاب کی توقع جتائی ہے جو طلبہ کے معیار ذہن کے مطابق ہو اور ان کی علمی تعمیر، کردار و اخلاق سازی میں معاون ہو۔امید ہے کہ ادبی حلقے میں اس کتاب کی پزیرائی ہوگی۔ میں ڈاکٹر ایم عارف کو اس کتاب کی اشاعت کے لیے مبارک باد دیتا ہوں۔

بہار کے فارسی اساتذہ

مصنف: محمد رضوان اللہ

صفحات: 384، 500 روپے، سنہ اشاعت: 2025

ناشر: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، نئی دہلی

مبصر: ڈاکٹر محمد مظاہر الحق

پروفیسر رضوان اللہ آروی کا شمار ان اساتذہ میں ہوتا ہے جنھوں نے نہ صرف بچوں کے اذہان کو سنوارا بلکہ اردو اور فارسی ادب کی بھی بے لوث خدمت کی۔ آپ کی سترہ کتابیں شائع ہو چکی ہیں جن کا تعلق تحقیق، تنقید، سفرنامہ، رپورتاژ، تاثرات اور تراجم سے ہے۔ فارسی اساتذہ کی حیات وخدمات پر آپ کی کئی کتابیں منظر عام پر آچکی ہیں۔ مثلاً ''عظیم آباد کے فارسی اساتذہ''، ''عظیم آباد کے فارسی اساتذہ (ضمیمہ)'' اور اب ''بہار کے فارسی اساتذہ''۔

زیر تبصرہ کتاب ''بہار کے فارسی اساتذہ'' میں مصنف نے ان اساتذہ کو جگہ دی ہے جو تدریسی خدمات سے سبکدوش ہو چکے یا مالک حقیقی سے جا ملے۔ مذکورہ کتاب میں بتیس اساتذہ کا ذکر ہے۔ جن کے اسمائے گرامی اس طرح ہیں (1) پروفیسر عبدالمجید (2) پروفیسر اجتبیٰ حسین رضوی (3) پروفیسر سید محمد صدر الدین احمد (4) پروفیسر محمد سلیمان (5) پروفیسر سید شمس الحق (6) پروفیسر متین احمد (7) پروفیسر خواجہ عبدالحسیب (8) پروفیسر محمد ابوالمظفر (9) پروفیسر زبیر احمد قمر (10) پروفیسر عبدالغفار انصاری (11) پروفیسر ارتضیٰ حسین رضوی (12) پروفیسر سید ولی سلفی (13) پروفیسر احمد حسین آرزو (14) پروفیسر شاکر خلیق (15) پروفیسر محمد طیب صدیقی (16) پروفیسر حافظ شبیر احمد حیدری (17) پروفیسر ایم ریاض باری (18) پروفیسر عبدالغفور شمسی (19) پروفیسر محمد ناظر صدیقی (20) پروفیسر عبدالحنان سبحانی (21) پروفیسر بدیع الزماں (22) پروفیسر محمد شہاب الدین (23) پروفیسر انور حسین زاہدی (24) پروفیسر عبدالوحید (25) پروفیسر محمد مقصود عالم (26) پروفیسر عبید محمد انصاری (27) پروفیسر عبدالستار آسی (28) پروفیسر جمال فاطمہ (29) پروفیسر محمد سلمان (30) پروفیسر سید امام الدین فردوسی (31) پروفیسر ظفر کمالی (32) پروفیسر سید شاہ محمد سعد اللہ قادری۔

زیر تبصرہ کتاب میں مصنف نے اساتذہ کی زندگی اور ادبی کارنامے پر جس تفصیل سے روشنی ڈالی ہے اس سے بخوبی اندازہ ہوتا ہے کہ پروفیسر رضوان اللہ آروی اپنے کام میں کس قدر سنجیدہ ہیں۔ پروفیسر عبدالمجید اعلیٰ تعلیم کی حصولیابی کے لیے جب پٹنہ آئے تو ان کی عسرت اور تنگ دستی کا کیا عالم تھا مصنف کی زبانی ملاحظہ ہو:

''رانچی میں ابتدائی تعلیم کے بعد انہوں نے عبدالمجید کو اعلیٰ تعلیم کے حصول کے لیے پٹنہ بھیج دیا۔ جہاں ان کی طالب علمی کا زمانہ نہایت عسرت اور تنگ دستی میں گزرا۔ وہ گھر کے لالٹین کی روشنی میں مطالعہ کیا کرتے تھے اور جب گھر کی بتی گل ہوجاتی تو سڑک پر کھڑے ہوکر سرکاری لالٹین کی روشنی میں پڑھا کرتے تھے۔ اس زمانے میں سڑکوں پر سرکاری لالٹینیں جلا کرتی تھیں۔'' ص 13

بہار کے فارسی اساتذہ کے مطالعہ سے قاری کو یہ جانکاری ملتی ہے کہ پروفیسر عبدالمجید نے دو شادیاں کی تھیں۔ پہلی شادی سے تین اولادیں ہوئیں دو بیٹا اور ایک بیٹی۔ آپ کے فرزند کلاں عبدالحفیظ کو بہار کے پہلے مسلم کیمیکل انجینئر بننے کا شرف حاصل ہوا تھا۔ پہلی اہلیہ کے انتقال کے بعد عبدالمجید کی دوسری شادی کلکتہ میں ہوئی جس سے چار اولادیں ہوئیں۔ تین بیٹے شہاب الدین احمد، رفیع الدین احمد اور صلاح الدین احمد۔ بیٹی رافعہ مجید۔ چاروں اولادیں بیرون ملک مقیم ہیں۔ پروفیسر عبدالمجید کا علمی کارنامہ بھی اچھا خاصہ ہے۔

مواد کی فراہمی میں رضوان اللہ آروی کی محنت مشقت اور جانفشانی صاف جھلکتی ہے۔ آپ نے پروفیسر عبدالمجید کے فرزند جناب محمد صلاح الدین کو ڈھونڈ نکالا جو آسٹریلیا میں مقیم ہیں۔

پروفیسر رضوان اللہ آروی کی مذکورہ جانفشانی اور محنت ''بہار کے فارسی اساتذہ'' کے بیشتر صفحات پر نمایاں ہیں۔ انھوں نے کئی پروفیسر حضرات کے خانوادوں کو ڈھونڈا اور ان سے ان کے سرپرست کے متعلق جانکاری حاصل کی۔ مثلاً

(الف) سید احسن الحق حال مقیم موتیہاری سے ان کے والد بزرگوار پروفیسر سید شمس الحق کی سوانح حیات کے متعلق معلومات حاصل کیں۔

(ب) ڈاکٹر عبدالقادر (الٰہ آباد) سے ان کے والد پروفیسر عبدالغفار انصاری کی سوانحی معلومات حاصل کیں۔

(ت) محبوب احمد نظامی جو دہلی میں سکونت پذیر ہیں ان سے ان کے والد پروفیسر زبیر احمد قمر سے متعلق معلومات حاصل کیے۔

(ث) پروین صدیقی صاحبہ (مظفرپور) سے مصنف نے ان کے والد پروفیسر محمد ناظر صدیقی کے بارے میں اہم معلومات، ان کی تخلیقات کا عکس اور ان کا بایوڈاٹا حاصل کیے۔

(ج) ڈاکٹر اقبال موسیٰ رحمانی (ڈپٹی رجسٹرار پٹنہ ہائی کورٹ) نے اپنے سسر ڈاکٹر سید ولی اللہ سلفی کے متعلق اہم معلومات اور ان کا خود کا مرتب کردہ بایوڈاٹا مصنف کو فراہم کرایا۔

راقم الحروف نے طوالت کے پیش نظر چند افراد کے نام تحریر کئے ہیں مگر

پروفیسر رضوان اللہ آروی کی تحریر بعنوان ''رونق انہیں کے دم سے ہے لیل ونہار کی'' میں ایسے متعدد لوگوں کا ذکر ہے جنھوں نے مصنف کو مواد کی فراہمی میں مدد کی۔

''بہار کے فارسی اساتذہ'' کی طباعت اور کاغذ عمدہ، سرورق دیدہ زیب، صفحات 384، قیمت 500 روپے، سال اشاعت 2025، اس کتاب کو ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس نئی دہلی نے شائع کیا ہے جسے اس کے مختلف برانچوں سے بھی حاصل کیا جاسکتا ہے۔

مختصر یہ کہ پروفیسر رضوان اللہ آروی کی کتاب ''بہار کے فارسی اساتذہ'' ایک اہم اور معلوماتی کتاب ہے جس میں مصنف نے بہار کے متعدد فارسی اساتذہ کی سوانح اور ان کی علمی فتوحات پر سیر حاصل گفتگو کی ہے۔ یہ کتاب تحقیق کرنے والے طلبا وطالبات کے لیے بے حد اہم ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ ملک گیر سطح پر فارسی ادب کی تاریخ لکھنے والوں کے لیے بھی معاون ومددگار ثابت ہوگی۔

ترتیب و تدوین

معروضات حبیب

مرتب/ ناشر: ڈاکٹر محمد معین الدین

صفحات: 360، قیمت: 450، سنہ اشاعت: 2025

مبصر: ڈاکٹر فرقان شاہ، پرنسپل شاہجہاں پبلک اسکول یعقوب پور، عرف آغا پور، تحصیل حسن پور، ضلع امروہہ، یوپی

اردو ادب میں حبیب سیفی کی شخصیت کئی پہلوؤں سے جانی جاتی ہے۔ وہ ناقد ومحقق بھی ہیں اور بہترین شاعر بھی۔ ان کی تحقیقی انتقادیات کی ضامن کتابوں میں، شوکت پردیسی فکر وفن کے آئینے میں، رموز ادب، اور بچوں کے ادب میں سائنس کی عکاسی شامل ہیں۔ ماہر ادب اطفال کے طور پر بھی حبیب سیفی کی شناخت مستحکم ہے۔

''معروضاتِ حبیب'' (حبیب سیفی شخصیت وفن) کے مرتب ڈاکٹر محمد معین الدین نے حبیب سیفی کے تخلیقی ادب کا جائزہ لیتے ہوئے 56 صفحات کا ضخیم مقدمہ لکھا ہے۔ فاضل مرتب نے حبیب سیفی کی سماجی زندگی اور ادبی زندگی کے تعلق سے اپنی بات دلائل کے ساتھ رکھی ہے۔

آٹھ کتابوں پر لکھے طویل مقدمہ میں اردو اکادمی دہلی وقومی اردو کونسل اور فخر الدین علی احمد میموریل کمیٹی لکھنؤ کے مالی تعاون سے شائع تمام کتابوں پر اپنے طریقے سے روشنی ڈالتے ہوئے بتانے کی کوشش کی ہے کہ حبیب سیفی کس طرح سے ہمہ جہت قلمکار بنے اور تخلیقی سفر کے ابتدائی دنوں میں کن کن شخصیات نے ان کی حوصلہ افزائی کی۔

ڈاکٹر محمد معین الدین ذاکر حسین دلّی کالج نئی دہلی کے شعبۂ اردو سے وابستہ ہیں اور درس وتدریس کے فرائض انجام دے رہے ہیں۔ اس سے پہلے آپ کی ایک اور کتاب ''معماران نقد قصیدہ'' کے نام سے شائع ہو چکی ہے۔ عربی وفارسی ادب کے اسرار ورموز اور لسانی قواعد واصول کو بہت استغراق سے اپنے اندر جذب کیا ہے۔

''معروضاتِ حبیب'' (حبیب سیفؔی شخصیت وفن) میں قومی اردو کونسل کے اس اہم پروجیکٹ پر بھی بات کی گئی ہے جسے ''بچوں کے ادب میں سائنس کی عکاسی'' کے عنوان سے حبیب سیفی نے سال 2019 لکھا تھا۔ اس کے علاوہ شعری مجموعہ دیدہ ور، متاعِ خواب، بچوں کے لیے لکھی نظموں کے مجموعہ درخشندہ ستارے، مستقبل کے چاند ستارے، شوکت پردیسی فکر وفن کے آئینے میں اور رموز ادب حصہ اول شامل ہیں۔

کتاب کے آخر میں ضمیمہ کے عنوان سے حبیب سیفؔی کی تخلیقات کے متعلق جن حضرات کی رائے معنی رکھتی ہے ان میں ڈاکٹر آنند موہن زتشی گلزار دہلوی، شمس الرحمٰن فاروقی، کرشن کمار طور، مظہر امام، ظہیر غازی پوری، رفیق شاہین، ڈاکٹر فراز حامدی، الف انصاری، چمن بھٹنا گر، انور سلیم حید ر آباد، ڈاکٹر امجد حسین حافظ کرناٹکی، مختار ٹونکی، ڈاکٹر بانو سرتاج، عبدالاحد ساز، ڈاکٹر محمود شیخ، قیصر واحدی، احمد وصی، کرشن پرویز، خاور نقیب، فیض رتلامی، نذیر فتح پوری وکرشن نندہ قابل ذکر ہیں۔ حبیب سیفی نے بڑوں کے لیے لکھے گئے کلام سے شعروادب میں وہ مقام بنایا جس کی مثال تازہ غزل کے حوالوں میں پیش کی جاتی ہے۔

کتاب میں احرار رشیدی کا مضمون طنز ومزاح کی روایت کا حصہ حبیب سیفی کا کلام، ڈاکٹر آفتاب عالم کا مضمون حبیب سیفی طنز اور مزاح، علامہ راز صابری مرحوم کا مضمون حبیب سیفی کی طنز ومزاح کی سیف شامل ہے۔ حبیب سیفی نے بچوں کے لیے لکھی نظموں میں صرف روایتی موضوعات ہی نہیں پیش کیے بلکہ سائنس وٹیکنالوجی پر لکھی نظموں میں معنی خیزی کے ساتھ اختصار کی خوبی بھی دیکھنے کو ملتی ہے۔ اسی لیے تین دہائی پہلے ان کی حوصلہ افزائی کرنے والوں میں افتخار امام صدیقی، حماد انجم ایڈوکیٹ، رفیق شاہین، آفاق فاخری، ڈاکٹر تابش مہدی، اختر شاہ جہان پوری، پروفیسر مقبول احمد مقبول، ڈاکٹر شمس کمال انجم، ڈاکٹر عبید الغفار، ماسٹر فریاد علی ڈاکٹر سید اسد رضا، عاقل زیاد، قاضی رئیس، شہاب الدین ثاقب ودیگر شامل ہیں۔

بچوں کی نظموں کے متعلق مرتب کا ماننا ہے جب جب بچوں کی نظموں کے تعلق سے گفتگو کی جائے گی حبیب سیفی کا نام ضرور شامل کیا جائے گا۔ ڈاکٹر محمد معین الدین کا پُر فکر اور پُر مغز طویل مقدمہ ہر سطح پر قاری کی تسلی وتشفی کا ضامن ہے۔ حبیب سیفؔی کی شخصیت وفن کے تعلق سے کتاب میں معلومات افزا جانکاریاں دے کر مرتب نے کتب بینی کا حق ادا کیا ہے۔ زیرتبصرہ کتاب حبیب سیفؔی کی شخصیت اور فن کے 30 سالہ ادبی سفر کا احاطہ کرتی ہے، اس کی اشاعت میں اردو اکادمی لکھنؤ کا مالی تعاون شامل ہے۔

اردو اور ہندوستانی زبانیں

مرتب: ڈاکٹر محمد نہال افروز

صفحات: 557، قیمت: 650 روپے، سن اشاعت

مبصر: ڈاکٹر اطہر حسین

مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی، حیدرآباد تلنگانا 500032

اردو زبان وادب کے حوالے سے جو افراد خاموشی اور مستقل مزاجی سے کام کر رہے ہیں ان میں ڈاکٹر محمد نہال افروز کا نام یقیناً اہم ہے۔ ڈاکٹر محمد نہال افروز ایک جواں سال ادیب، افسانہ نگار، مترجم اور محقق ہیں جنہوں نے کم وقت میں اردو دنیا میں اپنی ایک الگ شناخت قائم کی ہے۔ ان کا تعلق الہ آباد سے ہے اور انہوں نے اردو ادب میں مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی حیدرآباد سے پی ایچ ڈی کی ہے۔ اس وقت وہ جامعہ میں مرکز برائے فاصلاتی و آن لائن تعلیم میں بحیثیت اسسٹنٹ پروفیسر (کنٹریکچول) خدمات انجام دے رہے ہیں۔ نہال افروز کی تحریریں مختلف ادبی رسائل اور سوشل میڈیا پلیٹ فارمز پر باقاعدگی سے شائع ہوتی رہتی ہیں۔ ان کے افسانے زندگی کے حقیقی تجربات، سماجی مشاہدات اور انسانی رویّوں کو سادہ مگر موثر انداز میں پیش کرتے ہیں۔ ڈاکٹر نہال افروز قلم کو محض اظہار کا وسیلہ نہیں بلکہ علمی خدمت کا ذریعہ سمجھتے ہیں۔ ان کی تحریریں چاہے افسانوی ہوں، تراجم ہوں یا تحقیقی مضامین، سب میں ایک فکری تسلسل، لسانی شائستگی اور بیانیہ سنجیدگی ملتی ہے۔ ان کی نئی کتاب ''اردو اور ہندوستانی زبانیں (لسانی وادبی ارتباط)'' کا شمار ان کی سنجیدہ اور بامقصد علمی کوششوں میں کیا جانا چاہیے۔ نہال افروز ان نوجوان لکھنے والوں میں شامل ہیں جو اردو ادب کے مستقبل کی سمت کا تعین خاموشی مگر گہرائی سے کر رہے ہیں۔

زیر تبصرہ کتاب ''اردو اور ہندوستانی زبانیں: لسانی وادبی ارتباط'' ان کی اسی علمی وتحقیقی وابستگی کا ایک قابلِ قدر مظہر ہے، جس نے مجھے بحیثیت قاری نہ صرف متاثر کیا بلکہ اردو زبان کے تعلق سے میرے فہم وشعور میں بھی اضافہ کیا۔ یہ کتاب ایک ایسی کاوش ہے جو صرف ادبی ضرورت نہیں بلکہ ایک لسانی وتہذیبی دستاویز کی حیثیت رکھتی ہے۔ مذکورہ کتاب کوئی عام موضوعات پر لکھے گئے مضامین کا مجموعہ نہیں بلکہ ایک مربوط اور منظم انداز میں ہندوستانی زبانوں اور اردو کے باہمی تعلق، لسانی اور ادبی اشتراک واثرات کا بھرپور مطالعہ ہے۔ کتاب میں شامل چالیس مضامین، جن میں سے ہر ایک تحقیقی ذوق، علمی وسعت اور لسانی شعور کا حامل ہے۔ اٹھائیس ہندوستانی زبانوں کے ساتھ اردو کے لسانی، نحوی، صوتی، اور ادبی وتہذیبی اشتراک کو اجاگر کرتے ہیں۔ واضح رہے کہ یہ مضامین مختلف رسائل وجرائد میں پہلے شائع ہو چکے تھے اور کچھ غیر مطبوعہ بھی تھے جسے ڈاکٹر نہال افروز نے جمع کر کے نہایت سلیقے سے پیش کیا ہے۔ مرتب نے مضامین کے ماخذ کی بھی نشاندہی کی ہے۔ کتاب میں جن زبانوں کے ساتھ اردو کے تعلقات کو موضوع بنایا گیا ہے ان میں سنسکرت، ہندی، برج، میتھلی، بھوجپوری، آسامی، اڑیا، پنجابی، سنتھالی، چھتیس گڑھی، ہریانوی، راجستھانی، مراٹھی، گجراتی، سندھی، گوجری، تلگو، تمل، دکنی، کشمیری، نیپالی وغیرہ شامل ہیں۔ ان مضامین میں اردو کے ان زبانوں کے ساتھ لغوی، نحوی، صوتیاتی، ادبی، تہذیبی اور ثقافتی اشتراک کو مختلف پہلوؤں سے اجاگر کیا گیا ہے۔ یہ ایک نہایت اہم پہلو ہے کیونکہ عمومی طور پر اردو کے تعلق کو فارسی، عربی اور ترکی زبانوں سے جوڑ کر دیکھا جاتا ہے جبکہ حقیقت یہ ہے کہ اردو زبان کی جڑیں ہندوستانی تہذیب، زبانوں اور علاقائی اثرات میں پیوست ہیں۔ اس کتاب نے اس حقیقت کو مدلل اور مستند انداز میں پیش کر کے ایک فکری سمت فراہم کی ہے۔ کتاب میں شامل مضامین اردو زبان وادب کے جید اساتذہ، محققین اور لسانیات کے ماہرین کے تحریر کردہ ہیں جن میں گوپی چند نارنگ، شیخ عبدالغنی، مرزا خلیل احمد بیگ، وزیر آغا، فضل امام رضوی، شرف الدین اصلاحی، غلام ربانی، کرامت علی، فیروز احمد، پروفیسر محمد انصار اللہ جیسے معتبر نام شامل ہیں۔ ان مصنفین کے انتخاب سے ہی کتاب کی علمی سطح اور معیاری حیثیت کا اندازہ ہو جاتا ہے۔

کتاب میں مرتب کا اپنا مضمون ''اردو اور ہندی کا لسانی تنازع'' کے عنوان سے شامل ہے۔ نہایت اہم اور فکری طور پر متوازن تحریر ہے۔ اس مضمون میں ڈاکٹر نہال افروز نے دونوں زبانوں کے لسانی، ادبی اور تہذیبی اشتراک کو بیان کرنے کے ساتھ ساتھ ان کے درمیان مصنوعی طور پر پیدا کیے گئے سیاسی ونظریاتی اختلافات کو بھی مدلل انداز میں بے نقاب کیا ہے۔ یہ مضمون اس بات پر اصرار کرتا ہے کہ اردو اور ہندی دو بہنیں ہیں، جنہوں نے صدیوں تک ایک ہی گود میں پرورش پائی ہے۔ ان کا جدا ہونا کوئی فطری عمل نہیں بلکہ ایک تاریخی سازش کا نتیجہ ہے۔ یہ مضمون نہ صرف لسانیات کے طالب علموں بلکہ ادبی وسیاسی تاریخ سے دلچسپی رکھنے والوں کے لیے بھی مطالعہ طلب ہے۔

کتاب کا مقدمہ جو تقریباً پچاس صفحات پر محیط ہے، ایک ایسا جامع اور مبسوط تحریری خاکہ ہے جو اردو زبان کی تاریخی، لسانی، تہذیبی اور ادبی شناخت کو ایک ہمہ گیر تناظر میں پیش کرتا ہے۔ ڈاکٹر نہال افروز نے اس مقدمے میں محض کتاب کی ترتیب، ساخت، نوعیت اور مضامین کا تعارف ہی نہیں دیا بلکہ ان تمام موضوعات کو ایک تحقیقی ربط میں پرو دیا ہے۔ یہ مقدمہ اردو زبان کے وجودی سوالات کا ایک مدلل جواب ہے۔ وہ اردو کے ارتقائی مراحل، اس کے جغرافیائی اور تہذیبی سفر اور مختلف ہندوستانی زبانوں سے اس کے روابط کو لسانیاتی اصولوں اور تاریخی حوالوں کے ساتھ مربوط کرتے ہیں۔ انھوں نے نہ صرف مضامین کے انتخاب پر اپنی رائے دی ہے بلکہ اس بات پر بھی زور دیا ہے کہ یہ کتاب اردو زبان کے بارے میں پائی جانے والی کئی غلط فہمیوں اور تعصّبات کا ازالہ کرتی ہے۔ مقدمے کے علاوہ کتاب میں پروفیسر سید عین الحسن (شیخ الجامعہ مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی حیدرآباد) اور پروفیسر خطیب سید مصطفیٰ کے ابتدائی تاثرات بھی شامل ہیں۔ فلیپ پر موجود مرزا خلیل احمد بیگ کی مختصر لیکن جامع رائے کتاب کی علمی سند کے طور پر لی جا سکتی ہے۔

''اردو اور ہندوستانی زبانیں'' دراصل ایک ایسا علمی وتہذیبی موضوع ہے جو اردو کو اس کے اصل لسانی ماحول میں رکھ کر دیکھنے کی دعوت دیتا ہے۔ اردو زبان کے بارے میں ایک طویل عرصے تک ایک خاص بیانیہ پیش کیا جاتا رہا کہ یہ فارسی وعربی کے سنگم سے پیدا ہوئی، لیکن اس کتاب میں شامل مضامین اس بات کو واضح کرتے ہیں کہ اردو کی بنیاد دراصل ہندوستان کی مختلف علاقائی زبانوں کے اشتراک سے پڑی۔ بطور قاری جب میں نے اس کتاب کا مطالعہ کیا تو اندازہ ہوا کہ ان میں زبان کی روح، تہذیب، معاشرت اور ادبی رچاؤ کو خوبصورتی سے بیان کیا گیا ہے۔

کتاب میں کئی ایسے مضامین شامل ہیں جو صرف لسانی تعلق پر نہیں بلکہ ادبی میل جول، ترجمہ، مشترکہ شعری روایت، اور عوامی زبانوں کے اثرات جیسے موضوعات پر بھی مبنی ہیں۔ چند مضامین ایسے بھی ہیں جو تحقیقی نوعیت سے کمزور ہیں جبکہ بعض مضامین میں حواشی وحوالے کا کوئی خاص اہتمام نہیں کیا گیا ہے۔ جس کی وضاحت خود مرتب نے بھی کی ہے اور ان مضامین کو شامل کرنے وجہ یہ لکھی ہے کہ ہندوستان کی سطح پر تمام ادبی زبانوں کا احاطہ کیا جاسکے۔ میری رائے میں یہ کتاب اردو ادب کے ان طلبہ اور محققین کے لیے خاص طور پر مفید ہے جو زبانوں کے باہمی رشتوں پر تحقیق کر رہے ہیں۔ یہ نہ صرف حوالہ جاتی اہمیت رکھتی ہے بلکہ ریسرچ کے نئے دروازے کھولتی ہے۔ اس کے علاوہ اردو زبان کے ارتقائی سفر، اس کے لسانی میل جول اور ہندوستانی زبانوں کے ساتھ اس کے ادبی تعلق کو سمجھنے کے لیے ایک ماخذ کی حیثیت رکھتی ہے۔

کتاب کی اشاعت ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس دہلی سے ہوئی ہے اور اسے فخر الدین علی احمد میموریل کمیٹی کے مالی تعاون سے شائع کیا گیا ہے، جو اس کی علمی اہمیت اور سنجیدہ ادبی حیثیت کی علامت ہے۔ سرورق، کتابت، طباعت اور اندرونی ترتیب میں وقار اور سلیقہ نمایاں ہے جو کتاب کی پیشہ ورانہ تیاری کا مظہر ہے۔ فلیپ پر مرزا خلیل احمد بیگ کی مختصر مگر جامع رائے اس کتاب کو علمی توثیق فراہم کرتی ہے۔

خود نوشت

یہ نصف صدی کا قصہ ہے

مصنف: عارف عزیز

مرتب: ڈاکٹر مرضیہ عارف

صفحات: 448، قیمت: 1000 روپے، سن اشاعت: 2025

ناشر: عزیز پبلی کیشن

مبصر: اقبال مسعود

عارف عزیز اُردو کے مشاق صحافی و ادیب ہیں، اُن کے تحریر کردہ خاکے، تنقیدی مضامین اور سفرناموں پر مشتمل 16 کتب شائع ہوچکی ہیں، نئی تصنیف 'یہ نصف صدی کا قصہ ہے' ابھی آئی ہے۔ اُنھوں نے جامعہ ملیہ اسلامیہ نئی دہلی اور ماکھن لال چترویدی جرنلزم یونیورسٹی بھوپال کے تحقیقی پروجیکٹوں پر کام کرکے 'رابندرناتھ ٹیگور فکروفن کے ہزار رنگ' اور 'اُردو صحافت کے 60 سال' کتابیں بھی مرتب کی ہیں۔

پیش نظر آٹو بایوگرافی میں وسطِ ہند کے اہم صحافتی مرکز بھوپال کی صحافت کے کوائف کے ساتھ خود اُن کے صحافتی تجربات و خدمات کا بیان رنگین تصاویر سے مزین ہے، واضح رہے کہ اردو زبان میں متعدد اہم خودنوشت موجود ہیں، جن میں جوش ملیح آبادی کی ''یادوں کی برات''، اختر حسین رائے پوری کی ''گرد راہ''، رشید احمد صدیقی کی ''آشفتہ بیانی میری''، مولانا عبدالماجد دریابادی کی ''آپ بیتی'' اور مولانا ابوالحسن علی ندویؒ کی ''کاروان زندگی'' ان مشہور ومعروف خودنوشتوں کا ذکر اس لیے بھی ضروری ہے کہ یہ مذکورہ صاحبِ قلم افراد کی فکر اور انداز تحریر کا جیتا جاگتا ثبوت ہیں، ان کی تحریریں شخصیت کا آئینہ بھی ہیں اور دستاویز بھی۔ عارف عزیز صاحب کی خودنوشت کی خوبی ان کی صاف زبان، واقعات کا تسلسل، زندگی کے حقائق کی ترتیب وار مدلل اور جمالیاتی انداز میں پیش کش ہے۔ اس میں عارف عزیز ہی نہیں ایک زندہ وتابندہ تاریخی شہر بھوپال بھی سانس لے رہا ہے، یہ اس شہر اور ساتھ ہی ہندوستان جنت نشان کی گزشتہ نصف صدی کی داستان ہے، جس کے صفحات پر ثقافت، تاریخ، سیاست اور واقعات کا ذکر کسی فلم کے منظرنامے کی طرح ہماری نظروں کے سامنے ہوجاتا ہے۔ اس نصف صدی کے قصے میں ایک دنیا سمائی ہوئی ہے۔ بقول ان کی بیٹی ڈاکٹر مرضیہ عارف کے کہ نصف صدی کے اردو اخبارات کا ہی ذکر نہیں، پچاس سال کے اہم واقعات کی تاریخ بھی سمٹ آئی ہے، مثال کے طور پر بھوپال گیس المیہ کی تفصیلات، بھوپال میونسپل کارپوریشن میں اردو کو ثانوی زبان بنانے کی مہم، ارجن سنگھ اور دگو جے سنگھ حکومتوں کے نمایاں کام، مشاہیر سے بھوپال کے رشتوں کی یادیں، مدھیہ پردیش ودھان سبھا کے 68 سال، کچھ بات ہے کہ ہستی مٹتی نہیں ہماری نہرِ زبیدہ کی تاریخ اور بھوپال سے اِس کا تعلق، دارالمصنّفین اعظم گڑھ بھوپال سے سو سالہ رشتہ کے تناظر میں، ممبئی، پنجاب، جھابوا، آسام، بھٹکل، اورنگ آباد، اجنتا ایلو یرا، ایودھیا لکھنؤ کی سیاحت، شربت جہاد، اشتہارات کی بدلتی دنیا، 80 سیمیناروں کی روداد، بنا کا گیت مالا، صحافت وادب کی مایۂ ناز ہستیاں علامہ سیّد سلیمان ندوی، جگر مرادآبادی، مولانا علی میاں، قاضی وجدی الحسینی، مولانا عمران خاں ندوی ازہری، ظ۔انصاری، ابنِ صفی، قوی دسنوی اور آفاق احمد کی شخصیات، یہ ایسے موضوعات اور شخصیات ہیں جو اپنے اندر بڑے چشم کشا پہلو رکھتے ہیں اور جن کا بیان کرکے عارف عزیز نے ماضی کو نظروں کے سامنے مجسم کردیا ہے۔ 'معارف' کے ایڈیٹر مولانا عمیر الصدیق ندوی نے کتاب کا مقدمہ ہی نہیں لکھا چار سو صفحات کا عطر چار صفحات میں کشید کردیا ہے۔

عارف عزیز کی ''یہ نصف صدی کا قصہ ہے' اردو کی خودنوشتوں میں ایک منفرد اضافہ ہے، ایک پیغامِ محبت ہے۔ اِس میں انھوں نے اپنی بات کو جامع اور مدلل کرنے کے لیے اپنے مضامین کے حوالے بھی درج کیے ہیں، جس سے واقعہ کی تفصیل، پس منظر اور پیش منظر اُجاگر ہوجاتا ہے۔ یہ طریقہ کار دوسرے خودنوشت نگاروں کے یہاں بھی ملتا ہے، خصوصیت سے آپ بیتی میں مولانا عبدالماجد دریابادی اور مولانا علی میاں ندوی نے اس کا موثر استعمال کیا ہے۔ غرض عارف عزیز کا یہ کارنامہ جو 448 صفحات پر پھیلا ہوا ہے باذوق قارئین کے لیے ایک تحفہ ہے، جس میں انسانی ذات کی مختلف کیفیات فطرت اور اعلیٰ فکر جگہ جگہ جلوہ افروز ہے۔ خودنوشت کے مطالعہ سے صاحبِ خودنوشت عارف عزیز کی عرق ریزی اور تحقیق سے شغف کا نہ صرف اندازہ ہوتا ہے بلکہ پورے عہد کی ایک تصویر سامنے آجاتی ہے، ساتھ ہی اُن کے اُسلوب کی انفرادیت اور تحریر کی برجستگی کا قائل ہونا پڑتا ہے۔ کتاب اہتمام کے ساتھ مرتب اور شائع ہوئی ہے۔ 75 تصاویر اِس کتاب میں شائع ہوئی ہیں، جو مصنف کی ہمہ رنگی اور وجاہت کے اظہار کے لیے کافی ہیں، خودنوشت کی ابواب بندی ہوجاتی تو اِس کی افادیت مزید بڑھ جاتی، اُمید ہے کہ ادبی حلقوں میں اِس کی خاطر خواہ پذیرائی ہوگی۔

خاکے

گرم دم جستجو

مصنف: ڈاکٹر شکیل احمد
ناشر: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، نئی دہلی
صفحات: 224، قیمت: 350 روپے، اشاعت: 2025
مبصر: ڈاکٹر رفیق احمد

دیار فضا ابن فیضی کے نامور قلم کار اور مئو شہر ہنرواں نامی کتاب کے مصنف محترم ڈاکٹر شکیل احمد کی علمی و ادبی شخصیت محتاج تعارف نہیں آپ کی ایک درجن سے زائد کتابیں شائع ہو کر اہل علم سے خراج تحسین حاصل کر چکی ہیں۔

زیر تبصرہ کتاب محترم ڈاکٹر شکیل احمد کے لکھے ہوئے ان خاکوں کا مجموعہ ہے جن میں نامور اہلِ قلم اور دانشوران اردو شامل ہیں کتاب کا تعارف مصنف کے الفاظ میں یوں ہے:

''گرم دم جستجو کے نام سے خاکوں پر مشتمل یہ تیسری کتاب آپ کی خدمت میں پیش ہے اس میں جن 25 شخصیات پر خامہ فرسائی کی گئی ہے ان میں میرے بزرگ کرم فرماؤں کے ساتھ احباب اور ہم عصر حضرات بھی شامل ہیں اس میں وہ چند تاثراتی اور تعزیتی تحریریں بھی شامل ہیں جو کسی خاص موقع پر تحریر کی گئیں پھر خاکے کی صورت میں اس کتاب میں شامل کی گئیں، آپ کو 'گرم دم جستجو' کا وصف ہر ایک کی شخصیت میں نظر آئے گا۔''

زیر نظر کتاب کے مطالعہ سے محسوس ہوتا ہے کہ ڈاکٹر شکیل احمد کو خاکہ نما سوانحی مضامین لکھنے پر قدرت کاملہ حاصل ہے مصنف نے جس شخصیت کا خاکہ لکھا ہے اس کی زندگی کے اکثر علمی گوشوں کی جانب بڑی حق بیانی سے کام لیا ہے اس کتاب میں نامور علمی و ادبی شخصیات پر جو 25 خاکے شامل ہیں ان میں خاص طور سے مولانا اسیر ادروی، مولانا ضیاء الدین اصلاحی، پروفیسر احمد سجاد، ڈاکٹر اشفاق احمد اعظمی، پروفیسر عتیق احمد صدیقی، پروفیسر عبدالحق، پروفیسر فضل امام رضوی، پروفیسر ظفر احمد صدیقی، ڈاکٹر غلام حسین، مولانا قمر الزماں مبارک پوری، ڈاکٹر ایم نسیم اعظمی اور ڈاکٹر افاق فاخری وغیرہ کے نام قابل ذکر ہیں۔

خاکہ نما سوانحی اور تاثراتی مضامین کی اس کتاب میں جن دانشوران اردو اور اہل قلم حضرات کے خاکے لکھے گئے ہیں ان میں خاکہ نگاری کے اسلوب کے ساتھ ہی سوانح نگاری کا اسلوب بھی نظر آتا ہے جو ڈاکٹر شکیل احمد کی نثر نگاری کے اسلوب کی امتیازی شناخت اور خوبی ہے۔

اردو ادب میں خاکہ نگاری کی صنف کو بڑی اہمیت اور مقبولیت حاصل ہے نعت گوئی کی طرح خاکہ نگاری کا فن بھی بہت محتاط رویہ چاہتا ہے اس پس منظر میں جب ہم شکیل صاحب کے لکھے ہوئے خاکوں کا مطالعہ کرتے ہیں تو بخوبی اندازہ ہوتا ہے کہ ان کے یہاں خاکہ نگاری کے اسلوب میں کافی جدت و ندرت پائی جاتی ہے 'گرم دم جستجو' نامی اس کتاب کا اسلوب سادہ اور رواں ہے جو مصنف کی سادہ مزاجی کا عکس بھی پیش کرتا ہے۔ تمام خاکوں میں اسلوب اور طرز ادا کی یکسانیت پائی جاتی ہے۔ ان خاکوں میں مبالغہ آرائی سے پرہیز کیا گیا ہے اور ہر متعلقہ شخصیت کے علمی و ادبی نقوش کو سادگی و سلاست کے ساتھ پیش کیا گیا ہے جو خاکہ نگاری کی اہم خوبیوں میں شامل ہے۔

عصر حاضر کی نامور علمی شخصیت پروفیسر عبدالحق صاحب کے بارے میں مصنف لکھتے ہیں:

''اوسط قد، گورا رنگ، کشادہ پیشانی، مسکراتا روشن چہرہ، آواز میں کھنک قدرے غنائیت آمیز بولنے کی رفتار عام لوگوں سے قدرے رواں، نفاست پسندی آپ کے لباس سے عیاں، تدریس کے ساتھ تحقیق سے آپ کا ہمیشہ مضبوط رشتہ رہا ہے، آپ کی شہرت ماہر اقبالیات کی حیثیت سے پوری اردو دنیا میں ہے۔''

پروفیسر فضل امام رضوی صاحب کے متعلق لکھتے ہیں:

''لمبا قد، گونج دار آواز، صاف رنگ، چہرے پر مخصوص داڑھی، کشادہ پیشانی، دانشوری کی غماز روشن آنکھیں، مسکراتا روشن چہرہ، حسب موقع بالیدار ٹوپی، لمبے قد وقامت سے متناسب پینٹ، بشرٹ یا کوٹ پینٹ، پھرتیلے اور تیز قدم چلنے والے، تحقیق اور تنقید، تبصرے اور ترجمے اور تقریر و خطابت کے علاوہ مشاعروں کے اسٹیج سے بھی آپ کا تعلق رہا ہے فضا ابن فیضی صاحب سے جس قدر آپ کو لگاؤ تھا اس کا اظہار برملا نجی مجلسوں میں کرتے تھے۔''

مختصر یہ کہ زیر تبصرہ کتاب اپنے نمائندہ اسلوب اور طرز ادا کی دلکشی کے اعتبار سے بڑی اہمیت کی حامل ہے اس کتاب میں جو خاکے شامل ہیں ان کے مطالعہ سے معلومات میں اضافہ کے ساتھ ہی متعلقہ ہر ادبی شخصیت کے علمی نقوش بھی نظروں کے سامنے آجاتے ہیں۔ یہی اس کتاب کی سب سے نمایاں خوبی اور انفرادی شان بھی ہے۔

شاعری

کرنوں کا سفر

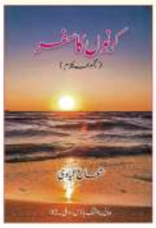

مصنف: شعاع گیاوی
صفحات: 210، 200 روپے، سنہ اشاعت: 2025
ناشر: حالی پبلشنگ ہاؤس، دہلی۔92
مبصر: سائرہ عظیم
B322، گلی نمبر 5، منڈاولی فاضل پور، دہلی۔92

شعاع گیاوی کا شعری مجموعہ ''کرنوں کا سفر'' 210 صفحات پر مشتمل ہے۔ اس میں نظمیں، غزلیں اور دو قطعات موجود ہیں۔ کتاب میں حبیب سیفی اور ڈاکٹر آفتاب عالم کا اظہاریہ ہے۔ حالانکہ ادبی حلقوں میں محترمہ شعاع گیاوی نے اپنی پہچان بنالی ہے۔ یہ اپنی شعری تخلیقات پڑھوانے کا گُر جانتی ہیں۔ ان کا قاری ان کی شعری تخلیقات سے بہت متاثر ہے۔ اپنی شاعری میں ادب کے اپنے گہرے مشاہدے پیش کرتی ہیں کہ ان کا قاری حیران رہ جاتا ہے۔ وہ نفسیاتی پیچ وخم سے کردار کا اندروں وا کرتی ہیں۔ اس کتاب میں موضوعات کے اعتبار سے شاعری میں انفرادیت دیکھنے کو ملتی ہے۔ اس کتاب کی شاعرہ کسی تعارف کی محتاج نہیں ہے، ان

کے نام سے اردو ادب کا قاری بخوبی واقف ہے۔

ڈاکٹر آفتاب عالم شعاع گیاوی کی شاعری پر اظہار خیال کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

''کسی بھی شاعرہ کے تجربات و محسوسات جس قدر حقیقی ہوں گے ان کی جڑیں زندگی میں جتنی گہری ہوں گی، شاعرہ کا ان سے رشتہ جتنا فطری ہوگا اسی اعتبار سے وہ فن پارے کی تخلیقی شرائط کو پورا کرنے کے قابل ہوگا، یہ خیال شاعری کے تعلق سے اس عظیم ناقد کا ہے جسے ہم اور اہل علم خلیل الرحمٰن اعظمی کے نام سے جانتے ہیں ''کرنوں کا سفر'' کا مطالعہ کیا تو پایا کہ اس مجموعہ کی نظموں اور غزلوں میں نہایت سادگی اور دلکشی پائی جاتی ہے۔ آپ کے معمولی سے معمولی شعر میں بھی ادبی چاشنی دیکھنے کو ملتی ہے نو بہ نو تبدیلیوں کی نبض شناسی کرنے میں معروف ہوتے جارہے ادیبوں اور نقادوں نے بھی آپ کے متعلق اپنی رائے قائم کی ہے اور قابل ستائش خیالات کا اظہار کیا ہے۔ اگر کوئی یکسوئی سے اس کی ورق گردانی کرے گا تو نور اور سرور اس شاعری کا مطالعہ کرتے ہوئے محسوس ہوگا۔''

شعاع گیاوی نے اپنے اظہار کی قوت اور سچائی سے اکثر مقامات پر اپنے کلام یعنی اس شعری مجموعہ ''کرنوں کا سفر'' میں غیر معمولی جاذبیت اور عصری صداقت سموئی ہے۔ شاعرانہ جذبات اپنی نزاکتوں، لطافتوں، رنگوں کے ساتھ نہ صرف عکس ریز ہوتے ہیں بلکہ تاریخی صداقت کی طرح ٹھوس ہوگئے ہیں۔ تمام شاعرانہ مفروضوں سے آزاد ہوکر شعاع گیاوی نے زمینی سچائیوں سے خود کو جڑے رکھنے کی کامیاب کوشش کی ہے۔

محترمہ شعاع گیاوی اپنی شاعری کے بارے میں لکھتی ہیں۔

''میرے ذہن میں کبھی بھی یہ شعری سرمایہ چھپنے کا خیال نہیں آیا تھا۔ بس ذہن کو ایک تحریک ملی اور اشعار صفحہ قرطاس سے بیاض کی شکل اختیار کر گئے، پھر ردّی کی ٹوکری میں بھلا کیسے منتقل ہو سکتے تھے۔ میرے شریک سفر محمد علاء الدین خاں نے میری منزل قریب سے قریب تر ہونے کا اشارہ اپنی محبت کے ساتھ دیا، میں مشکور ہوں میرے بڑھتے قدموں کو روکنے کی کبھی کوشش نہیں کی بلکہ قدم قدم پر میرا نہ صرف ساتھ دیا بلکہ حوصلہ بڑھایا اور ستائش کرتے رہے۔ آج میں جہاں ہوں اس میں میرے سارے اپنوں کی محبت کا اہم رول ہے۔ ان کی محبتیں اور دعائیں شامل ہیں۔ ان تمام لوگوں کا شکریہ ادا کرنا چاہتی ہوں جنھوں نے میرے تخلیقی اظہار کے جذبے کی قدر کی اور مجھے قوت گویائی کے لیے مقبول بنانے میں تعاون کیا۔

اس مجموعہ کی شاعرہ شعاع گیاوی کا تعلق صوبہ بہار کے گیا شہر ''بھدیہ'' سے ہے۔

شعاع گیاوی کی نظمیہ اور غزلیہ شاعری بہر حال اپنا ایک وژن اور اپنا ایک رنگ و آہنگ رکھتی ہے۔ شاعرہ پیار و محبت کی عظمت اور اپنی شاعری کی انفرادیت کا شعور بھی رکھتی ہے۔ انھیں معاشرہ کے ان افراد کی پہچان بھی ہے جن کی زبان اور لباس اچھے ہوتے ہیں مگر خیال نہیں۔

ادب نثر میں لکھا جائے یا نظم میں بہر صورت وہ ادبی و شعری نظریے اور اظہار و بیان کی مقصدیت سے خالی نہیں ہوسکتا۔ اس لحاظ سے ہم دیکھتے ہیں کہ زیر نظر مجموعہ کی شاعرہ نے اپنی فکر کو اپنے قطعات میں بیان کیے ہیں۔

تم کہاں سے آئے ہو اور کہاں جانا ہے
زندگی کی راہوں میں دھول ہی اڑانا ہے
آتے جاتے رہنا ہے زندگی بہانا ہے
آج ہم یہاں ہیں تو کل کہاں ٹھکانا ہے

اس مجموعے کی نظمیں اور غزلیں موضوعات و مضامین کی بوقلمونیت کے سبب اپنی جانب متوجہ کیے بغیر نہیں رہتیں۔ ان کے مجموعے میں متعدد اشعار ایسے ہیں جن میں شاعرہ نے خودی و خودداری اور راہ وفا کے خطرات اور بعض عصری نفسیاتی احوال بھی بخوبی آئینہ کر دیے ہیں۔

شعاع گیاوی کے زیر نظر مجموعہ کی نظموں غزلوں نیز قطعات میں پیامی شاعری کا رنگ و آہنگ بھی نہایت دلکش اور پیارا ہے اور اس میں خاص فکری و علمی اعتدال پسندی کا مزاج نمایاں ہے۔ یہاں شاعرہ نے اپنی شاعری کے توسط سے واضح طور پر رجائیت کا پیغام دیا ہے۔ ان کی شاعری میں آفاقی صداقت کا بیان ہے۔ شاعرہ نے صرف مقولہ صفت اور گرہ بند اشعار کی وساطت سے ہی اپنا ہنر اجاگر نہیں کیا ہے بلکہ آمد کی شان کے ساتھ صناعات سخن کے عمدہ نمونے بھی پیش کیے ہیں اور سہل ممتنع کی شان سے بھی اپنی شاعری کی ترجیح کی ہے۔

زیر نظر مجموعے کی غزلوں میں طنزیہ اشعار کی بھی کمی نہیں ہے۔ شاعرہ نے محبت کے نام پر زبانی جمع خرچ کرنے والوں، دولت، منصب اور شہرت کے پیچھے بھاگنے والوں، بدعہدی و بدزبانی کرنے والوں پر اچھا خاصا طنز کیا ہے۔

شعاع گیاوی ایک وسیع المطالعہ، وسیع النظر اور صاحب طرز شاعرہ ہیں۔ اپنے تخلیقی عمل کو برقرار رکھتے ہوئے اپنی عمر کی ڈھلان پر پہنچ کر بھی وہ اس درجہ فعال ہیں۔ ان کے طرز اظہار اور لہجے میں شگفتگی، تازگی اور ندرت قائم ہے۔ امید ہے کہ زیر نظر مجموعہ ادبی دنیا میں مقبول ہوگا۔ قیمت معقول ہے۔ صوری و معنوی ہر اعتبار سے مجموعہ دل کش و دیدہ زیب ہے۔

غزل نامہ

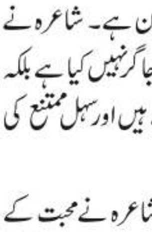

مصنف: سہیل کاکوروی
صفحات: 100، قیمت: 100 روپے، سن اشاعت: 2025
ناشر: نعمانی پریس
مبصر: پروفیسر ذوالنورین علوی
معرفت نیشنل ٹریکٹر، سٹی ہوٹل لالباغ لکھنؤ، گولہ گنج لکھنؤ

جناب سہیل کاکوروی صاحب نے شاعری میں کارنامے انجام؟ دیے ہیں وہ نثر بھی اتنی ہی پر اثر لکھتے ہیں جتنی اثر انگیزی انکی شاعری میں ہوتی ہے وہ اردو ہندی انگریزی میں تو مستقل لکھتے ہیں لیکن انکی شاعری کی فارسی میں بھی کتاب نغمہ تار رگ جاں کے نام سے موجود ہے غزلوں کے ان دو مجموعے بعنوان ' گلگشت ' اور ' نگاہ ' منظر عام پر آ چکے ہیں ان کی پہلی کتاب دیوناگری میں افسانوی مجموعہ بعنوان ' لو ' ہے

سہیل کاکوروی کی شاعری عکاس ہے انکی غزل سے وابستگی کی لیکن انہوں نے ایک تبدیلی کے ساتھ شاعری میں ایک نئے انداز میں قدم رکھا اور آم جیسے پھل پسند خاص و عام پھل پر پوری کتاب آن نامہ لکھی جسکو کسی پھل پر شاعری میں پہلی کتاب مان کر لنکا بک آف ریکارڈ میں درج کر لیا گیا یہ مثنوی کے طرز پر ہے اسکے بعد گل کو

ردیف بنا کر تحریر اور تقریر قافیوں میں تین سو شعر کہ کر گل نامہ بنایا جسمیں تین سو اشعار ہیں قریب ایک سال قبل انہوں نے اپنی منظوم سوانح سہیل نامہ تحریر کیا جسکو محققین نے ہندوستان میں پہلی منظوم سوانح تسلیم نامہ کے حوالے سے یہ انکی تیسری کتاب تھی

زیر نظر کتاب غزل نامہ کی اعتبار سے منفرد ہے غزل کے پیش نظر بحر کو ردیف بنایا اور قوافی کے بحر پر غزل پھر قافیہ ردیف بنا ہے عشق دل دماغ غزل کے پیہم آنے والے موضوعات ہیں جن پر غزلیں ہیں اسکے علاوہ ان کی مہارت کی گواہی وہ غزل دے رہی ہے جہاں انہوں نے ردیف کو ہی ردیف بنایا اور سیر حاصل غزلوں سے کتاب کو مزین کیا ان عناصر اربعہ پر غزلوں کے بعد غزل ردیف بنی ہے اور مختلف قوافی کے ساتھ ردیف غزل ہی ہے اور قابل ذکر یہ ہے کسی بھی ردیف کے ساتھ اتصال قافیہ کے درمیان کو لفظ کہیں نہیں آیا ہے

سہیل کاکوروی کی کتاب 'غزل نامہ' پر آپ کے فراہم کردہ خاکے کی روشنی میں ایک جامع اور ادبی تبصرہ پیشِ خدمت ہے، جوان کی فنی انفرادیت اور لسانی مہارت کو اجاگر کرتا ہے:

تبصرہ: سہیل کاکوروی اور ان کا فنی شاہکار 'غزل نامہ'

سہیل کاکوروی اردو ادب کی ان ہمہ جہت شخصیات میں سے ہیں جنھوں نے نہ صرف نظم و نثر پر یکساں قدرت کا ثبوت دیا، بلکہ لسانی سرحدوں کو عبور کرتے ہوئے اردو، ہندی، انگریزی اور فارسی میں بھی اپنے فن کے جوہر دکھائے۔ ان کی تخلیقی جولانیوں کا سفر 'نغمہ تار رگِ جاں' (فارسی) سے شروع ہو کر 'گلگشت' اور 'نگاہ' جیسے غزلوں کے مجموعوں تک پھیلا ہوا ہے۔ تاہم، ان کی حالیہ کتاب 'غزل نامہ' ان کے شعری سفر کا ایک ایسا سنگ میل ہے جو انہیں معاصرین میں ممتاز کرتا ہے۔ سہیل کاکوروی نے اپنے احباب اور محبین کے ناموں کے ساتھ کم سے ایک شعر کہا ہے لیکن ہر صورت ردیف غزل ہی ہے ہے

فنی جدت اور 'ناموں' کا تسلسل

سہیل کاکوروی کی یہ خصوصیت رہی ہے کہ انہوں نے روایتی اصناف میں نئے تجربات کیے۔ جہاں انہوں نے 'آم نامہ' لکھ کر لنکا بک آف ریکارڈ میں جگہ بنائی اور 'گل نامہ' میں تین سو اشعار کے ذریعے گل و بلبل کے استعارے کو نئی وسعت دی، وہیں 'غزل نامہ' ان کی فنی پختگی کا عروج ہے۔ یہ کتاب اس سلسلے کی تیسری کڑی ہے جوان کی 'نامہ نگاری' (منظوم سوانح 'سہیل نامہ' کے بعد) میں ایک منفرد اضافہ ہے۔

'غزل نامہ' کی انفرادیت: بحر اور ردیف کا امتزاج

اس کتاب کی سب سے بڑی خوبی اس کا تکنیکی نظام ہے۔ سہیل کاکوروی نے یہاں غزل کے فن کے ساتھ ایک عالمانہ تجربہ کیا ہے:

بحر بطور ردیف: انہوں نے غزل کے فنی لوازمات (بحر) کو ہی ردیف کے طور پر استعمال کیا، جوان کی عروضی مہارت کا بین ثبوت ہے۔

ردیف 'غزل' کا استعمال: کتاب کا ایک بڑا حصہ ان غزلوں پر مشتمل ہے جہاں لفظ 'غزل' خود ردیف بن کر ابھرا ہے۔ یہ محض قافیہ پیمائی نہیں بلکہ غزل کے فن سے ان کی گہری وابستگی اور عشق کا اظہار ہے۔

تکنیکی پختگی: کتاب کی ایک حیران کن خوبی، جیسا کہ خاکے میں ذکر ہے، یہ ہے کہ ردیف اور قافیہ کے درمیان کسی اضافی لفظ کا سہارا نہیں لیا گیا (اتصالِ قافیہ و ردیف)۔ یہ ایک نہایت مشکل فن ہے جس پر سہیل صاحب نے پوری کتاب میں گرفت برقرار رکھی ہے۔

موضوعات کا تنوع

'غزل نامہ' صرف فنی تجربہ نہیں ہے بلکہ اس میں انسانی جذبات کی عکاسی بھی بھرپور ہے۔

عناصرِ اربعہ: مٹی، پانی، ہوا اور آگ جیسے بنیادی عناصر پر غزلیں کہہ کر انہوں نے کائناتی سچائیوں کو غزل کے پیرائے میں ڈھالا ہے۔

عشق، دل اور دماغ: روایتی موضوعات ہونے کے باوجود انہوں نے عشق اور عقل کی کشمکش کو نئے استعاروں کے ساتھ پیش کیا ہے۔

سہیل کاکوروی کی 'غزل نامہ' اردو غزل کے کینوس پر ایک ایسا نقش ہے جو محققین اور عروض کے ماہرین کے لیے مطالعے کی نئی راہیں کھولتا ہے۔ یہ کتاب ثابت کرتی ہے کہ غزل صرف جذبات کا نام نہیں بلکہ یہ ایک ایسا ریاضیاتی فن بھی ہے جسے اگر سہیل کاکوروی جیسا قادر الکلام شاعر برتے، تو وہ اسے 'غزل نامہ' جیسا کارنامہ بنا سکتا۔

ماہنامہ 'اردو دنیا' کا نیا سلسلہ

جن کتابوں نے متاثر کیا

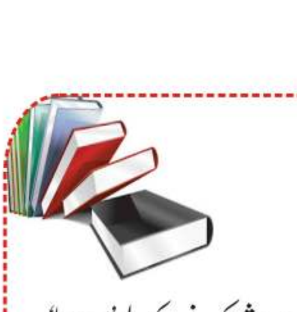

ہزاروں کتابوں میں چند ہی کتابیں ایسی ہوتی ہیں جو آپ کے ذہن و دل کی دنیا بدل دیتی ہیں۔ ایسی کتابوں کی قوت، اہمیت و معنویت کو قارئین سے شیئر کرنے کے لیے 'اردو دنیا' میں ایک نیا سلسلہ شروع کیا گیا ہے جس میں مختلف اصناف پر مشتمل نئی اور پرانی کتابوں کے بارے میں صاحبانِ علم و ہنر یہ بتائیں گے کہ کن کتابوں نے انھیں متاثر کیا ہے۔ صاحبانِ ذوق کتاب کے اسلوب، موضوع اور دیگر تلازمات کے علاوہ یہ بھی بتائیں گے کہ یہ کتابیں کیوں پڑھنی چاہئیں۔ آپ نے ابھی تک جتنی کتابیں پڑھی ہیں ان میں سے چند کا انتخاب کیجیے اور اپنے مطالعاتی سفر میں ان افراد کو بھی شامل کیجیے جن تک شاید ان کتابوں کی رسائی نہیں ہو پاتی ہے۔ منتخب کتابوں کے تعلق سے اپنے منطقی و معروضی خیالات اور تاثرات ہمیں لکھ بھیجیے۔

ماہنامہ اردو دنیا کے کالم زبان اور زمینی صورتِ حال کے لیے سوال نامہ

ماہنامہ 'اردو دنیا' میں مشاہیر ادب کے انٹرویوز شائع کیے جاتے تھے، یہ ایک مقبول کالم تھا۔ یہ کالم ہنوز جاری ہے۔ بس اس کی شکل وصورت ذرا سی تبدیل کردی گئی ہے تاکہ اردو کے تعلق سے غیر ضروری مباحث کے بجائے قارئین اردو زبان کی حقیقی صورتِ حال سے آگاہ ہوسکیں۔

- زبانوں کی موت کی وجوہات کیا ہیں؟
- زبانوں کو زندہ رکھنے کے لیے کون سا طریقہ کار اختیار کیا جانا چاہیے؟
- زبان کا تہذیب و ثقافت سے کیسا رشتہ ہے؟
- کیا زبانوں کی موت سے انسانی وراثت کے تحفظ کا مسئلہ بھی جڑا ہوا ہے؟
- کیا کسی زبان میں خواندگی، سائنسی، سماجی مواد کی کمی سے زبان پر منفی اثرات پڑتے ہیں؟
- موجودہ حالات میں اردو زبان کو کس طرح کے خطرات لاحق ہیں؟
- اردو کا مستقبل کیا ہے؟
- زبان کی سطح پر جو بگاڑ پیدا ہو رہا ہے اس کو روکنے کے لیے کون سی ترکیبیں استعمال کی جاسکتی ہیں؟
- کیا اردو کے ادارے، تنظیمیں، زبان سے زیادہ ادب پر توجہ دے رہے ہیں اور زبان سے متعلق کتابوں کی اشاعت تقریباً رک سی گئی ہے؟
- کیا کلاسیکیت، جدیدیت وغیرہ پر گفتگو سے زبان کو کوئی فائدہ پہنچ سکتا ہے؟
- آپ کے علاقے میں کتنے اردو میڈیم اسکول ہیں اور ان میں اساتذہ کی کتنی تعداد ہے؟
- آپ کے علاقے میں کتنی لائبریریاں ہیں اور وہاں کون سے اخبارات اور رسائل آتے ہیں؟
- آپ کے علاقے میں کتنی اردو تنظیمیں، ادارے اور انجمنیں ہیں اور وہ کس نہج پر اردو کے فروغ کے لیے کام کر رہے ہیں؟
- آپ کے علاقے میں اردو سے جڑی ہوئی کتنی شخصیات ہیں جن کی خدمات کا اعتراف علاقائی، قومی سطح پر نہیں کیا گیا ہے؟
- آپ مقامی سطح پر اردو کے فروغ کے لیے کیا کوششیں کر رہے ہیں؟
- آپ کے ذہن میں فروغ اردو کے لیے کیا تجاویز اور مشورے ہیں؟
- اردو رسم الخط کی بقا کے لیے کیا کوششیں کی جاسکتی ہیں؟
- دوسری علاقائی زبانوں میں اردو کے فروغ کی کیا صورتیں ہوسکتی ہیں؟
- کیا آپ کے اہل خانہ اردو زبان لکھنا پڑھنا اور بولنا جانتے ہیں؟
- آپ کے بعد کیا آپ کے گھر میں اردو زندہ رہے گی؟
- غیر اردو حلقے میں فروغ اردو کے لیے کیا حکمت عملی اختیار کی جانی چاہیے؟
- آپ کے علاقے میں کتنے کالجز یا یونیورسٹیز ہیں جن میں اردو کی تعلیم دی جاتی ہے اور وہاں اردو پڑھنے والوں کی تعداد کتنی ہے؟
- ملکی سطح پر غیر سرکاری تنظیموں سے اردو کی ترویج و اشاعت کے سلسلے میں کس طرح سے مدد لی جاسکتی ہے؟
- سینٹرل اسکولوں اور نوودے ودیالیہ میں اردو کی تعلیم کا کوئی معقول انتظام ہے؟

ماہنامہ 'اردو دنیا' میں اسی سوالنامے کی روشنی میں ان لوگوں کے انٹرویوز شائع کیے جائیں گے جو اردو زبان و ادب سے جڑے ہوئے ہیں اور اردو کی خدمت کا بے پناہ جذبہ رکھتے ہیں مگر انھیں اپنے خیالات کے اظہار کا موقع نہیں ملتا۔ یہ سوالنامہ ہر اس فرد کے لیے ہے جو اردو کاز اور مشن سے جڑا ہوا ہے۔ اس سوالنامے کے ذریعے ہمیں اردو زبان کے تعلق سے حقیقی صورتِ حال کا علم ہوگا اور اسی کی روشنی میں فروغ اردو کے لیے ایک روڈ میپ تیار کیا جائے گا۔ اپنے جوابات کے ساتھ سوانحی کوائف مع تصویر درج ذیل ای میل آئی ڈی پر بھیجیں: editor@ncpul.in ➢ urduduniyancpul@yahoo.co.in ➢

قومی اردو کونسل کی سرگرمیاں

’خطبات مودی: لال قلعہ کی فصیل سے‘ قومی کونسل کے اشاعتی مشن کا ایک اہم کارنامہ: عزت مآب وزیر تعلیم شری دھرمیندر پردھان

’خطبات مودی: لال قلعہ کی فصیل سے‘ ایک تاریخی دستاویز: ڈاکٹر شمس اقبال

عزت مآب وزیر اعظم شری نریندر مودی کی تقاریر کا مجموعہ ’’خطبات مودی: لال قلعہ کی فصیل سے‘‘ کی تقریب اجرا

دہلی/ قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی سے شائع ہونے والی اہم کتاب ’’خطبات مودی: لال قلعہ کی فصیل سے‘‘ کا عزت مآب وزیر تعلیم شری دھرمیندر پردھان جی کے ہاتھوں شاشتری بھون، دہلی میں اجرا عمل میں آیا۔ یہ کتاب دراصل 2014 سے 2025 تک یوم آزادی کے موقع پر لال قلعہ کی فصیل سے عزت مآب

وزیر اعظم شری نریندر مودی جی کے ذریعے دیے گئے خطبات کا مجموعہ ہے۔ اس موقع پر قومی کونسل کے ڈائرکٹر ڈاکٹر شمس اقبال نے استقبالیہ کلمات پیش کرتے ہوئے کہا کہ رسم اجرا کے اس موقع پر عزت مآب وزیر تعلیم کا دل سے استقبال کرتا ہوں اور شکرگزار ہوں کہ انھوں نے اس اہم کتاب کی رسم اجرا کے لیے اپنا بیش قیمتی وقت دے کر ہماری حوصلہ افزائی کی۔ اس کے ساتھ ساتھ ہم عزت مآب وزیر اعظم شری نریندر مودی جی کے بھی شکرگزار ہیں جن کی قیادت اور وژن نے اردو زبان کو قومی ترقی کے بیانیے سے جوڑنے کا موقع فراہم کیا۔ قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کی یہ کاوش اردو کے مستقبل کو روشن بنانے اور وکست بھارت کے خواب کو پورا کرنے کی ایک اہم کوشش ہے‘‘۔

رسم اجرا کی اس تقریب میں سامعین کو خطاب کرتے ہوئے عزت مآب وزیر تعلیم نے کہا کہ قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کتاب کلچر کو مقبول عام بنانے میں بھی نہایت فعال کردار ادا کر رہی ہے، اسی ضمن میں کونسل نے اگست 2025 میں سرینگر اور نومبر 2025 میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں نہایت کامیاب کتاب میلوں کا انعقاد کیا ہے۔‘‘ انھوں نے ’’خطبات مودی‘‘ کی اشاعت کو قومی کونسل کی اشاعتی سریز کی ایک اہم کڑی قرار دیتے ہوئے کہا کہ ’’عزت مآب وزیر اعظم نے ’سب کا ساتھ سب کا وکاس اور سب کا وشواس‘ کے جس منتر کے ساتھ حکومتی فرائض کو انجام دیا ہے، اس کا ڈاکیومنٹیشن ہمیں ان کے خطبات میں ملتا ہے۔ میک ان انڈیا، ڈیجیٹل انڈیا، اجولا اسکیم، جن اوسدھی یوجنا، آیوس مان بھارت یوحنا، سوچھ بھارت مشن اور سکنیہ یوجنا سے لے کر آتم نربھر اور وکست بھارت تک کی سبھی اسکیموں کا خاکہ اگر ہم سمجھنا چاہیں تو عزت مآب وزیر اعظم کے ان خطبات سے بخوبی سمجھ سکتے ہیں۔ عزت

مآب وزیراعظم شری نریندر مودی جی کے یہ خطبات ہمیں ہندوستانی شہری کے طور پر اپنی ذمہ داریوں کا احساس دلاتے ہیں اور ملک کی تعمیر میں اپنے فرائض کو انجام دینے کی ترغیب دیتے ہیں''۔

انھوں نے ان خطبات کی اہمیت وافادیت پر مزید روشنی ڈالتے ہوئے کہا کہ ''یہ خطبات پچھلے 12 سالوں میں عالمی سطح پر نمایاں ہونے والے نئے اور طاقتور ہندوستان کو ظاہر کرتے ہیں۔ ملک کی حفاظت کے لیے اندرونی اور بیرونی سطح پر اٹھائے گئے مضبوط اقدامات کی جھلک بھی ان میں نمایاں نظر آتی ہے۔ آج ہندوستان ہر شعبے میں آگے بڑھ رہا ہے اور ہر دن ترقی کی نئی بلندیوں کو چھو رہا ہے۔ اس کی اصل وجہ عزت مآب وزیراعظم شری نریندر مودی جی کا وہ وژن ہے، جس کی بنیاد ہے ''نیشن فرسٹ''۔

عزت مآب وزیر تعلیم نے ڈائرکٹر قومی اردو کونسل کو ہدایت دیتے ہوئے کہا کہ یہ کتاب ملک کی ہر لائبریری میں پہنچنی چاہئے تاکہ زیادہ سے زیادہ لوگ اسے پڑھ سکیں اور وکست بھارت سے متعلق سماج میں وسیع پیمانے پر تبادلہ؟ خیال ہو سکے۔ بھارت کی وراثت، ثقافت، طرز زندگی اور ہماری خوشحال علمی روایت سے جڑے موضوعات پر اردو زبان میں کتابوں کی اشاعت بھی وسیع پیمانے پر کرنے کی ذمہ داری این سی پی یو ایل کو لینی چاہئے۔

عزت مآب وزیر تعلیم نے قومی اردو کونسل کے اس اہم کارنامے پر خوشی کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ ''مجھے بے حد خوشی ہے کہ قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان نے ان خطبات کو اردو میں شائع کیا ہے۔ میں کونسل کے ڈائرکٹر ڈاکٹر شمس اقبال کو اس اہم کتاب کی اشاعت کے لیے مبارکباد دیتا ہوں۔ مجھے امید ہے کہ اس کتاب کی اشاعت سے ہندوستان کی تعمیر وترقی کے لیے وزیراعظم شری نریندر مودی جی کا وژن زیادہ سے زیادہ اردو قارئین تک پہنچے گا اور وہ مودی جی کے 12 سال کی مدت کار میں کیے گئے شاندار ترقی کے کام کاج، ملک کی فلاح کے لیے شروع کی گئیں اسکیموں اور قوم کے تحفظ وخودمختاری کے لیے اٹھائے گئے اہم اقدامات سے واقف ہوں گے۔''

رسم اجرا کی اس تقریب میں ڈاکٹر ونیت جوشی (سکریٹری، شعبہ اعلیٰ تعلیم، وزارت تعلیم، حکومت ہند)، محترمہ منمون کور (جوائنٹ سکریٹری، وزارت تعلیم، حکومت ہند)، شری چامو کرشن شاستری (چیئرمین بھارتیہ بھاشا سمتی، نئی دہلی)، پروفیسر نعیمہ خاتون (وائس چانسلر، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ)، پروفیسر شاہد اختر (سابق وائس چیئرمین، این سی پی یو ایل وممبر این سی ایم ای آئی، نئی دہلی) کے علاوہ بڑی تعداد میں وزارت تعلیم کے اعلیٰ افسران موجود رہے۔

Subscription Form "Urdu Duniya"

سالانہ خریداری فارم

میں 'اردو دنیا' کا/کی سالانہ خریدار بننا چاہتا/چاہتی ہوں۔

240 روپے کا ڈرافٹ/منی آرڈر............................ بتاریخ............................ بنام National Council for Promotion of Urdu Language منسلک ہے۔

میں نے زرِتعاون سالانہ -/240 روپے A/C: 90092010045326، IFSC: CNRB0019009 میں جمع کروا دیا ہے۔

آپ 'اردو دنیا' ایک سال کے لیے اس پتے پر بھجوائیں:

نام : ....

....

پتہ : ....

....

اس فارم کو درج ذیل پتے پر بھیج دیں:

دستخط

Sales Department: NCPUL, West Block 8, Wing7, RK Puram, New Delhi - 110066

فون: 011-26109746 فیکس: 011-26108159, E-mail.: magazines@ncpul.in

ماہنامہ اردو دنیا میں 'خبرنامہ' کے تحت علمی، ادبی، ثقافتی اور تعلیمی سرگرمیوں سے متعلق خبریں شائع کی جاتی ہیں۔ ان خبروں سے ہماری ادبی و ثقافتی سرگرمیوں، تنوع اور زبان و ادب کی سمت و رفتار کا اندازہ ہوتا ہے۔ یہ خبرنامہ ہندوستان بھر سے شائع ہونے والے مختلف اردو اخبارات کے تراشوں سے ترتیب دیا جاتا ہے۔ کوشش کے باوجود بہت سی اہم خبریں ہم تک موصول ہونے سے رہ جاتی ہیں۔ اس لیے منتظمین سے گزارش ہے کہ وہ اہم علمی، ادبی و ثقافتی تقریبات اور وفیات سے متعلق خبریں درجہ ذیل ای میل editor@ncpul.in | urdudunyancpul@yahoo.co.in پر ارسال کرنے کی زحمت کریں۔ (ادارہ)

زبان، ادب اور تعلیم سے متعلق خبریں

دھلی

ہندوستان، دنیا میں اشاعتی صنعت کا تیسرا سب سے بڑا مرکز

نئی دھلی: دنیا کے سب سے بڑے عالمی کتاب میلوں میں سے ایک نئی دہلی عالمی کتاب میلہ کے 53ویں ایڈیشن کا آج نئی دہلی کے بھارت منڈپم میں افتتاح ہوا۔ نو روزہ میگا ایونٹ کا اہتمام نیشنل بک ٹرسٹ (این بی ٹی) انڈیا، وزارت تعلیم اور انڈیا ٹریڈ پروموشن آرگنائزیشن (آئی ٹی پی او) کے تعاون سے کیا گیا ہے۔ پہلی بار 10 سے 18 جنوری تک تمام شائقین کے لیے میلے میں داخلہ مفت ہے۔ 35 سے زیادہ ممالک کے ایک ہزار سے زیادہ پبلشرز، 600 سے زیادہ تقریبات، ایک ہزار سے زیادہ مقررین اور 2 ملین سے زیادہ شائقین شرکت کر رہے ہیں۔ اس میلے کا افتتاح مرکزی وزیر تعلیم دھرمیندر پردھان نے کیا۔ اس موقع پر ہندوستان میں قطر کے سفیر محمد حسن جابر الجابر، عبدالرحمٰن بن حمد بن جاسم بن حمد الثانی، اسپین کے وزیر ثقافت ارنسٹ ارتاسون ڈومیٹیک، نیشنل بک ٹرسٹ کے چیئرمین پروفیسر ملند سدھاکر مراٹھے، انڈیا ٹریڈ پروموشن آرگنائزیشن کے مینجنگ ڈائرکٹر نیرج کھروال، آئی پی او کے ایگزیکٹو ڈائریکٹر پریم جیت لال وغیرہ نے شرکت کی۔ اجتماع سے خطاب کرتے ہوئے مرکزی وزیر تعلیم دھرمیندر پردھان نے بھگود گیتا کا حوالہ دیتے ہوئے کہا کہ اس دنیا میں علم سے بہتر کوئی چیز نہیں ہے۔ انھوں نے کہا کہ کتابیں علم کی روایت کو آگے بڑھاتی ہیں، نسلوں کو جوڑتی ہیں، تہذیبی یادداشت کو محفوظ رکھتی ہیں اور معاشرے کی رہنمائی کرتی ہیں۔ آج ہندوستان دنیا کا تیسرا سب سے بڑا اشاعتی مرکز بن گیا ہے، جو ہماری لسانی، عالمی اور ہندوستان کی خودمختاری کی عکاسی کرتا ہے۔ انھوں نے مستقبل کو سمجھنے کے لیے ماضی کا مطالعہ کرنے کی ضرورت پر زور دیا۔ قطر کے وزیر ثقافت عبدالرحمٰن بن حمد بن جاسم بن حمد الثانی نے کہا کہ قطر کی شرکت دونوں ممالک کے درمیان گہرے تعلقات کی عکاسی کرتی ہے۔ پروفیسر ملند سدھاکر مراٹھے نے کہا کہ یہ میلہ تین اہم سوالات کے جوابات دینے کی کوشش کرتا ہے۔ کیا پڑھنا ہے، کیوں پڑھنا ہے اور کیسے پڑھنا ہے نیز اس کا مقصد خاص طور پر نوجوانوں میں ایک پائیدار اسٹڈی کی ثقافت کو فروغ دینا ہے۔ انھوں نے ہندوستان، قطر اور اسپین کے قومی نعروں میں موجود مشترکہ اقدار کو بھی اجاگر کیا۔

ساہتیہ اکادمی نے 'آمنے سامنے' اور 'کویتا پاٹھ' کا انعقاد کیا

نئی دھلی: کتاب میلے کے پہلے دن، مصنفہ وندنا یادو کی کتاب 'فوجی بیویوں کی کہانی اور مصائب' پربھات پرکاشن کے ایک پروگرام میں ریلیز ہوئی۔ یہ کتاب فوجی خاندانوں خصوصاً فوجی بیویوں کی جدوجہد، قربانیوں اور جذبے کو اجاگر کرتی ہے۔ مصنف نے کہا

''فوجی بننا ایک متوسط طبقے کا فیصلہ ہے، جہاں حب الوطنی سب سے اہم ہے۔ یہ کتاب سچی کہانیوں پر روشنی ڈالتی ہے۔ وزیر تعلیم نے کہا کہ یہ نمائش ملک کے فوجیوں کو وقف ہے اور سردار ولبھ بھائی پٹیل کی قربانی اور وندے ماترم کے اعزاز کی یاد میں ہے۔ ٹیکنالوجی اور مصنوعی ذہانت اسکولی تعلیم اور ہندوستانی زبانوں کے لیے نئے مواقع کھول رہی ہے۔ قومی تعلیمی پالیسی نے پورے تعلیمی نظام کو بدل کر رکھ دیا ہے۔ دھرمیندر پردھان نے کتاب میلے کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ یہ وزیر اعظم نریندر مودی کے پڑھنے کے کلچر کو ایک عوامی تحریک میں تبدیل کرنے کی سمت میں ایک اہم واقعہ ہے۔ ساہتیہ اکادمی نے ہفتہ کو ہال نمبر 2 میں رائٹرز فورم میں دو پروگرام ''آمنے - سامنے'' اور ''کویتا پاٹھ'' کا انعقاد کیا۔ ساہتیہ اکادمی ایوارڈ یافتہ ہندی مصنفہ انامیکا اور معروف آسامی مصنفہ انورادھا شرما پوجا رینام پروگرام میں شریک ہوئیں۔ دونوں مصنفین نے اپنے تخلیقی عمل کو سامعین کے ساتھ شیئر کیا اور اپنی تخلیقات بھی سنائیں۔ انامیکا نے کہا اپنے بارے میں بات کرنا آسان نہیں ہے، خاص طور پر دیہی پس منظر سے تعلق رکھنے والی خاتون کے لیے۔ اسے عورت کی فطرت سے جوڑتے ہوئے کہا کہ شاعری اشاروں سے بولتی ہے۔

روزنامہ 'ہمارا سماج' دہلی، 12 جنوری 2026

مصطفیٰ اکیول کی کتاب پر فکری نشست

نئی دھلی: نیشنل بک ٹرسٹ کے زیراہتمام ورلڈ بک فیئر 2026 کے دوران اتوار کی شام پرگتی میدان میں واقع آتھرز کارنر پر 'اسلام اور جدیدیت' کے موضوع پر ایک فکری و علمی نشست کا انعقاد کیا گیا۔ اس موقع پر معروف ترک نژاد مفکر مصطفیٰ اکیول کی شہرۂ آفاق کتاب 'ری اوپننگ مسلم مائنڈس' کے اردو ایڈیشن 'مسلم اذہان کی تشکیل نو' کی باقاعدہ رونمائی بھی عمل میں آئی۔ اس کتاب کا اردو ترجمہ ڈاکٹر جلیس اختر نصیری نے کیا ہے، جبکہ اسے خسرو فاؤنڈیشن نے شائع کیا ہے۔ اردو ایڈیشن کی اشاعت کا مقصد برصغیر اور دیگر اردو داں حلقوں میں ان فکری مباحث کو عام کرنا ہے تاکہ طلبہ، محققین اور عام قارئین جدید فکری سوالات کو براہ راست سمجھ سکیں اور علمی مکالمے میں شریک ہوسکیں۔ تقریب کی نظامت خسرو فاؤنڈیشن کے کنوینر ڈاکٹر حفیظ الرحمٰن نے کی۔ کلیدی خطبہ مہمان خصوصی پروفیسر ڈاکٹر افشار عالم، وائس چانسلر جامعہ ہمدرد نے پیش کیا۔ اپنے خطاب میں انھوں نے اسلام کے فکری ارتقا، علمی روایت کی وسعت اور جدید تقاضوں کے ساتھ بامعنی مکالمے کی ضرورت پر زور دیا۔ خسرو فاؤنڈیشن کے ڈائریکٹر ڈاکٹر شانتنو مکھرجی نے استقبالیہ خطاب میں فاؤنڈیشن کی علمی سرگرمیوں، معیاری ترجمہ جاتی منصوبوں اور عالمی سطح کی فکری کتب کو اردو قارئین تک پہنچانے کے عزم پر روشنی ڈالی۔ اظہارِ تشکر اور اختتامی کلمات سراج الدین قریشی نے ادا کیے۔ تقریب کے دوران اسلام اور جدیدیت کے مختلف پہلوؤں پر ایک پینل مباحثہ بھی منعقد ہوا جس میں موجودہ دور کے فکری چیلنجز، مسلم معاشروں کو درپیش مسائل اور مستقبل کے امکانات پر سنجیدہ گفتگو کی گئی۔ مقررین نے مصطفیٰ اکیول کی کتاب میں پیش کیے گئے خیالات کو بنیاد بنا کر عقل، مکالمے اور فکری آزادی کی اہمیت پر اظہارِ خیال کیا۔ شام سات بجے منعقد ہونے والی اس نشست میں قارئین، محققین، اساتذہ اور دانشوروں کی بڑی تعداد نے شرکت کی۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 13 جنوری 2026

نئی دہلی رائٹس ٹیبل کا آغاز

نئی دھلی: نئی دہلی عالمی کتاب میلہ 2026 کے تحت ایک اہم تجارتی اقدام کے طور پر نئی دہلی رائٹس ٹیبل کا پیر کے روز بھارت منڈپم میں آغاز ہوا۔ اس اقدام کا مقصد عالمی سطح پر اشاعتی تجارت اور حقوق اشاعت

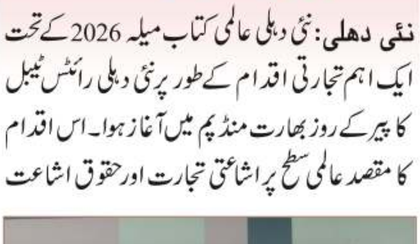

کے تبادلے میں ہندوستان کے کردار کو مزید مستحکم کرنا ہے۔ نئی دہلی رائٹس ٹیبل کا اہتمام نیشنل بک ٹرسٹ (این بی ٹی) انڈیا نے وزارتِ تعلیم کے تحت کیا ہے۔ نئی دہلی رائٹس ٹیبل کو مکمل طور پر بزنس ٹو بزنس پلیٹ فارم کے طور پر ترتیب دیا گیا ہے، جہاں ہندوستان اور بیرون ملک کے ناشرین مختلف زبانوں میں کتابوں کے تراجم اور تقسیم کے حقوق سے متعلق مذاکرات کر رہے ہیں۔ رواں برس اس پلیٹ فارم میں 85 ناشرین شریک ہیں، جن میں تقریباً 40 غیر ملکی ناشرین شامل ہیں۔ 12 اور 13 جنوری کے دوران 600 سے زائد پہلے سے طے شدہ ملاقاتیں منعقد کی جارہی ہیں۔ تقریب کا افتتاح فرینکفرٹ بک فیئر کی نائب صدر (بزنس ڈیولپمنٹ) کلاڈیا کائزر نے کیا۔ افتتاحی نشست میں نیشنل بک ٹرسٹ کے ڈائرکٹر یوراج ملک نے ان کا خیرمقدم کیا۔ اس موقع پر اظہارِ خیال کرتے ہوئے این بی ٹی کے چیئرمین پروفیسر ملند سدھاکر مراٹھے نے کہا کہ فرینکفرٹ بک فیئر نے بی ٹو بی اور بی ٹو سی ماڈلز کو موثر انداز میں یکجا کیا ہے اور نیشنل بک ٹرسٹ بھی ہندوستان اور دنیا کے درمیان معیاری ادب کے تبادلے کو فروغ دینے کے لیے سرگرم ہے۔ کلاڈیا کائزر نے کہا کہ ہندوستان اور فرینکفرٹ بک فیئر کے تعلقات کئی دہائیوں پر محیط ہیں اور ہندوستان 1980 کی دہائی میں اس میلے میں مہمانِ خصوصی بننے والا پہلا ایشیائی ملک تھا۔ انھوں نے نئی دہلی عالمی کتب میلہ کے بڑھتے ہوئے وقار کی تعریف کی اور میلے کو عوام کے لیے مفت رکھنے کے فیصلے کا خیرمقدم کیا۔ نیشنل بک ٹرسٹ کے ڈائریکٹر یوراج ملک نے بین الاقوامی اشاعتی اشتراک کی اہمیت پر زور دیتے ہوئے کہا کہ محض تعداد کی بجائے معیاری مواد پر توجہ دینا وقت کی ضرورت ہے۔ انھوں نے کولمبیا کے بوگوٹا انٹرنیشنل بک فیئر میں ہندوستان کے مہمانِ خصوصی پویلین میں شرکت کی دعوت بھی دی، جہاں ہندوستان اپنی کثیرلسانی اور علمی روایات کو عالمی سطح پر پیش کرے گا۔ انھوں نے بتایا کہ نئی دہلی عالمی کتاب میلہ 2026 کا موضوع ''ہندوستانی فوجی تاریخ'' ہے، جو عالمی سطح پر اپنی نوعیت کا ایک منفرد تجربہ ہوگا۔ اس موقع پر این بی ٹی کے چیف ایڈیٹر اور جوائنٹ ڈائرکٹر کمار وکرم نے نیشنل بک ٹرسٹ کے نئے مالی امدادی پروگرام کی تفصیلات پیش کیں، جس کے تحت ہندوستانی کتابوں کے غیر ملکی زبانوں میں ترجمے کے لیے ناشرین کو مالی معاونت فراہم کی جائے گی۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 13 جنوری 2026

ادب اطفال میں اخلاقی اور روحانی تربیت پر توجہ ضروری

نئی دھلی: انسٹی ٹیوٹ آف اسٹڈی اینڈ ریسرچ دہلی کے زیراہتمام بچوں کے لیے لکھنے والوں، پبلشرز اور کونسلرز کی ایک یک روزہ ورکشاپ منعقد ہوئی، جس

میں ڈیجیٹل دور میں بچوں کے ادب کو نئی فکری سمت دینے اور اخلاقی، دینی اور روحانی اقدار کو مضبوط بنانے پر غور کیا گیا۔ ورکشاپ کا عنوان ''اگلی نسل میں فکری، اخلاقی اور روحانی نشوونما'' تھا، جس میں بچوں کے مصنفین، ناشرین، مصورین، کونسلرز، ماہرین نفسیات، اساتذہ اور میڈیا کنٹینٹ تخلیق کاروں نے شرکت کی۔ ورکشاپ سے خطاب کرتے ہوئے جماعت اسلامی ہند کے نائب امیر ایس امین الحسن نے بچوں کی نفسیاتی اور اخلاقی بنیادوں پر تفصیلی روشنی ڈالی۔ انھوں نے کہا کہ بچوں کے لیے ادب کو عمر کے تین مراحل میں تقسیم کر کے تیار کیا جانا چاہیے تاکہ ہر مرحلے کی ذہنی اور نفسیاتی ضرورتوں کو بہتر طور پر پورا کیا جاسکے۔ ان کے مطابق پہلا مرحلہ صفر سے پانچ سال، دوسرا پانچ سے بارہ سال اور تیسرا بارہ سے اٹھارہ سال تک کے بچوں پر مشتمل ہے اور ہر مرحلے کے لیے الگ نوعیت کا ادب ہونا چاہیے۔ انھوں نے کہا کہ بچوں کے لیے تحریر میں جذباتی ربط، سچائی، عمر کے مطابق اسلوب، فن، ایڈونچر اور ہلکا پھلکا مزاح ہونا چاہیے تاکہ بچے تحریر سے جڑ سکیں۔ ساتھ ہی اس بات پر بھی زور دیا کہ کہانی کے اختتام پر بچوں کے مسائل کا انسانی اور عملی حل پیش کیا جانا چاہیے۔ ان کے مطابق بچوں کو تنہائی پسندی سے نکالنے کے لیے محض نصیحت کارگر نہیں ہوتی، بلکہ کہانیوں کے ذریعے ان کے نقصانات کو اجاگر کرنا زیادہ مؤثر ثابت ہوتا ہے۔ انھوں نے قرآنی قصص کے اسالیب اپنانے اور اقدار کو کہانیوں کا لازمی حصہ بنانے پر زور دیا۔ پروگرام کے اختتام پر شرکا میں اسناد تقسیم کی گئیں۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 14 جنوری 2026

عربی لغات کے موضوع پر علمی لیکچر

نئی دہلی: جواہر لعل نہرو یونیورسٹی کے اسکول آف لینگویج اینڈ لٹریچر کے تحت قائم مرکز برائے مطالعۂ عربی و افریقہ کی جانب سے عربی لغات کے موضوع پر ایک

علمی لیکچر کا انعقاد کیا گیا، جس کا عنوان 'عربی زبان کا معاجم: بنیادیں اور اطلاق' تھا۔ اس موقع پر سعودی عرب سے تعلق رکھنے والے ممتاز ماہر لغت شیخ ڈاکٹر محمد بن سلیمان المفدی نے مہمان خصوصی کی حیثیت سے خطاب کیا۔ وہ آفاق المعرفہ پبلشرز اینڈ ڈسٹری بیوٹرز کے جنرل سپروائزر ہیں اور عربی لغت نویسی کے میدان میں ان کی متعدد تصانیف شائع ہو چکی ہیں۔ واضح رہے کہ وہ اس سے قبل بھی جامعہ میں علمی لیکچر دے چکے ہیں۔

پروگرام کا آغاز رضوان الرحمٰن نے مہمانوں کے استقبال سے کیا، جب کہ ڈاکٹر عبیدالرحمٰن نے مہمان لیکچرر کا مختصر تعارف پیش کیا۔ صدر اسکول آف لینگویج اینڈ لٹریچر کے قائم مقام پروفیسر اخلاق آہن نے اپنے خطاب میں ہند۔عرب تہذیبی روابط اور عرب تہذیب کے عالمی علمی کردار پر روشنی ڈالی۔

اپنے لیکچر میں ڈاکٹر المفدی نے معجم اور قاموس کے فرق کو واضح کرتے ہوئے قدیم و جدید عربی لغات کا حوالہ دیا۔ انھوں نے بتایا کہ عربی لغات عام طور پر حروف معجم اور حروف ابجدیہ کے اصول پر مرتب کی جاتی ہیں۔ انھوں نے عربی زبان کی لسانی خود کفالت پر زور دیتے ہوئے کہا کہ جدید عربی لغات میں غیر ملکی الفاظ کی شرح نہایت کم ہے، جبکہ دیگر عالمی زبانوں میں یہ تناسب کہیں زیادہ ہے۔ انھوں نے مزید کہا کہ عربی زبان ماضی، حال اور مستقبل کے درمیان مضبوط ربط رکھتی ہے جس کی وجہ سے قدیم متون کی تفہیم آج بھی ممکن ہے۔ لیکچر کے بعد سوال و جواب کا سیشن منعقد ہوا جس میں حاضرین کے سوالات کے جوابات دیے گئے۔ اس علمی نشست کی صدارت پروفیسر شفیق احمد خان سابق صدر شعبہ عربی جامعہ ملیہ اسلامیہ نے کی جبکہ نظامت ڈاکٹر محمد اجمل نے۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 15، جنوری، 2026

لسانی تبادلے کی اہمیت پر زور

نئی دہلی: عربی زبان کے عالمی دن کے موقع پر شعبہ عربی، دہلی یونیورسٹی کے زیر اہتمام دو روزہ مسابقاتی و ثقافتی پروگرام منعقد کیا گیا جس کے تحت 5 مسابقاتی پروگرام اور ایک عربی ڈرامہ پیش کیا گیا۔ اس دو روزہ پروگرام کے دوران یونیورسٹی انتظامیہ کے سینئر ذمہ داران اور مختلف یونیورسٹیوں کے عربی کے اساتذہ

نے عربی زبان کی دھک اور اس کی مہک کو محسوس کرتے ہوئے شعبہ کی تعلیمی سرگرمیوں کو خوب سراہا۔ پروگرام کے پہلے دن شعبہ عربی دہلی یونیورسٹی، ذاکر حسین کالج، سینٹ اسٹیفن کالج، جامعہ ملیہ اسلامیہ، جواہر لعل نہرو یونیورسٹی، اندرا گاندھی نیشنل اوپن یونیورسٹی اور علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے طلبہ و طالبات کے مابین جونیئر اور سینئر زمروں میں تقریری مقابلے، خطاطی، عربی بیت بازی اور عربی نغمات کے مسابقے منعقد کیے گئے۔ ان مسابقاتی پروگراموں میں جواہر لعل نہرو یونیورسٹی سے پروفیسر رضوان الرحمٰن اور پروفیسر اشفاق احمد، جامعہ ملیہ اسلامیہ سے پروفیسر نسیم اختر اور پروفیسر فوزان احمد، اگنو سے پروفیسر محمد سلیم اور دہلی یونیورسٹی سے پروفیسر نعیم الحسن، ڈاکٹر مجیب اختر اور ڈاکٹر محمد اکرم نے بطور حکم (ججز) فرائض انجام دیے۔ ججز نے طلبہ کی کارکردگی، عربی زبان سے ان کی وابستگی اور ہندوستانی تہذیب کو عربی زبان کے ذریعے عالمی سطح پر پیش کرنے کے جذبے کو سراہا۔ قابل ذکر ہے کہ ان مسابقاتی پروگراموں میں بڑی تعداد میں شعبہ عربی دہلی یونیورسٹی کے پارٹ ٹائم کورسیز سرٹیفکیٹ، ڈپلومہ اور ایڈوانس ڈپلومہ سے وابستہ طلبہ و طالبات نے شرکت کی اور نمایاں پوزیشن حاصل کیں۔ کامیاب طلبہ کو نقد انعامات اور مولانا محمد یوسف اصلاحی، مولانا سید محمد عبادت، پروفیسر ولی اختر ندوی اور پروفیسر نثار احمد فاروقی کے نام سے موسوم تحسینی اسناد سے نوازا گیا۔ پہلے دن کے سیشن کی نظامت پروگرام کے کنوینر ڈاکٹر اصغر محمود نے کی جبکہ اظہار تشکر شعبہ کے استاد ڈاکٹر محمد اکرم نے کیا۔ دوسرے دن تقریب تقسیم انعامات سے قبل شعبہ عربی کے صدر پروفیسر سید حسنین اختر نے افتتاحی گفتگو میں عربی زبان کی لسانی و ثقافتی روایت پر روشنی ڈالتے ہوئے کہا کہ ان پروگراموں کا بنیادی مقصد طلبہ کو ایک ایسا پلیٹ فارم فراہم کرنا ہے جہاں وہ اپنی خوابیدہ صلاحیتوں کو بروئے کار لاسکیں۔ ڈین کلچر کونسل، دہلی یونیورسٹی پروفیسر رویندر سنگھ نے صدارتی خطاب میں

شعبہ عربی کی ثقافتی و ادبی سرگرمیوں اور پروگرام میں پیش کی گئی تقریروں کے موضوعات کی ستائش کی۔ مہمان خصوصی پروفیسر نیرا اگنی مترا نے شعبہ عربی کو مبارکباددی۔

روزنامہ 'صحافت' دہلی، 15 جنوری 2026

ہندی اور ہندوستانی زبان کے رول پر زور

نئی دہلی: کمیشن برائے سائنسی وتکنیکی اصطلاحات (سی ایس ٹی ٹی) وزارت تعلیم کے زیراہتمام اور شعبہ سیاسیات، جامعہ ملیہ اسلامیہ کے اشتراک سے 'سوشل سائنسیز کے لیے آموزگاروں کی فرہنگ' کی تیاری کے

سلسلے میں منعقدہ 5 روزہ ورکشاپ منعقد ہوا۔ اختتامی خطبہ شیخ الجامعہ، جامعہ ملیہ اسلامیہ پروفیسر مظہر آصف نے دیا۔ انھوں نے اپنی تقریر میں نوآبادیاتی ذہنیت سے آزاد ہونے کی بات کی۔ انھوں نے کہا کہ جدیدیت کے خام تصور کا لوگوں کے ذہنوں پر برا اثر ہوا ہے۔ اس لیے ہندوستانی نظام علوم (آئی کے ایس) کو ترجیحی صورت میں اپنا کراسے فی الفور درست کرنے کی ضرورت ہے۔ انھوں نے سیاسی اصطلاحات کے ہندی اور دیگر جدید ہندوستانی زبانوں میں ترجمے کے عمل کو سراہا اور ورکشاپ میں موجود لوگوں کے تئیں نیک خواہشات کا اظہار کیا۔ دیگر ہندوستانی زبانوں میں سوشل سائنسز کی اصطلاحات کے ترجمے کے موضوع مزید اظہار خیال کرتے ہوئے پروفیسر مظہر آصف نے کہا کہ تکنیکی اور سائنسی اصطلاحات کا صرف ترجمہ کرنے سے، ترجمہ کی روح کے ساتھ انصاف نہیں ہوسکتا۔ شیڈول آٹھ زبانوں یا دیگر زبان میں اصطلاحات کے ترجمے کے عمل کے دوران متعلقہ زبان کے جغرافیہ، تاریخ اور تہذیب و ثقافت کو پیش نظر رکھنا ناگزیر ہے۔ بطور پیشہ ور مترجم انھیں خاصا تجربہ ہے اور ہندوستانی اور خارجی زبانوں میں ایک ممتاز ماہر لسانیات کی حیثیت سے انھوں نے کمیٹی کے اراکین کو مستند و معیاری ترجمے کی تحدیدات کو ذہن نشیں رکھنے کا مشورہ دیا خواہ وہ زبان ہندوستان میں بولی جاتی ہو یا لکھی جاتی ہو۔ ورکشاپ کے کوآرڈی نیٹر پروفیسر نوید جمال نے خطبہ استقبالیہ پیش کیا۔ ہندوستانی زبان کی روح کو بیدار کرنے کے سلسلے میں ہندی، ہندوستانی اور بھارتیندو ہریش چندر کے نظریے کو فروغ دینے کے سلسلے میں انھوں نے گاندھی کے نظریے کے رول پر زور دیا۔ ڈاکٹر شہزاد احمد انصاری، اسسٹنٹ ڈائرکٹر نے کمیشن برائے سائنسی وتکنیکی اصطلاحات (سی ایس ٹی ٹی) کا مختصر تعارف سامعین کے سامنے رکھا۔ مہمان مقرر ڈاکٹر سروج کمار داس نے خطاب کیا۔ انھوں نے اپنے خطبے میں بھارتیندو ہریش چندر کے نظریے پر زور دیا۔

روزنامہ 'صحافت' دہلی، 16 جنوری 2026

محمد علی جوہر اور آنند موہن زتشی کی برسی

نئی دہلی: عظیم مجاہد آزادی، صحافی اور شاعر مولانا محمد علی جوہر کی برسی کے موقع پر انھیں خراج عقیدت پیش کرنے کے لیے انجمن تعمیر اردو (گلزار دہلوی کی یاد میں) کے زیراہتمام جامعہ نگر کے تسمیہ آڈیٹوریم

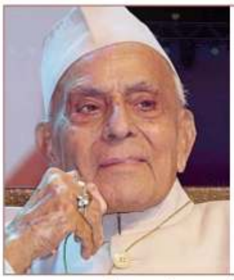

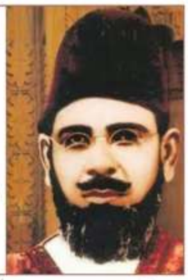

میں 'ایک شام مولانا محمد علی جوہر کے نام' کے عنوان سے ایک پروگرام منعقد کیا گیا۔ پروگرام کی صدارت تسمیہ ایجوکیشن اینڈ ویلفیئر سوسائٹی کے صدر ڈاکٹر سید فاروق نے کی۔ پدم شری پروفیسر اخترالواسع اور خواجہ محمد شاہد بطور خصوصی مہمان موجود تھے۔ مولانا محمد علی جوہر کو خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے پروفیسر اخترالواسع نے کہا کہ مولانا کی شخصیت آج بھی بے مثال ہے اور ملک کی آزادی کے لیے انھوں نے جو قربانیاں دیں، انھیں کبھی فراموش نہیں کیا جاسکتا۔ خواجہ محمد شاہد نے تحریک آزادی میں مولانا کے کردار کو سراہتے ہوئے ان کی والدہ بی اماں کے کردار کی بھی تعریف کی اور انھیں تحریک آزادی کی ایک عظیم خاتون قرار دیا، جنھوں نے ہمیشہ اپنے بیٹوں یعنی علی برادران کی حوصلہ افزائی کی۔ پروگرام کے صدر ڈاکٹر سید فاروق نے مولانا محمد علی جوہر کی شخصیت کو بے نظیر قرار دیا اور انجمن تعمیر اردو کو مبارکباد دیتے ہوئے کہا کہ اپنے محسنوں کو یاد رکھنا ہم سب کے لیے نہایت ضروری ہے۔ اس کے بعد ایک شعری و ادبی نشست کا انعقاد ہوا، جس کی نظامت انجمن کے جنرل سکریٹری رؤف رامش نے کی۔ جن شعرا نے اپنا کلام پیش کیا، ان میں ابوابوالفیض سہریاوی، فصیح اکمل، قاری فضل الرحمٰن انجم، ڈاکٹر سجاد سید، عرفان اعظمی، شاہد انور، سرندر شجر، معین قریشی، خرم نور، فرمان چودھری، ڈاکٹر افروز طالب، ہاشمت بھاردواج، ماریا عثمانی، اسرار رازی، اسلم جاوید اور رؤف رامش سمیت دیگر شعرا شامل تھے۔

روزنامہ 'ہمارا سماج' دہلی، 6 جنوری 2026

محمد رفیع کی یاد میں پروگرام

نئی دہلی: ہندوستانی فلمی موسیقی کے سنہرے دور کے عظیم گلوکار محمد رفیع کی یاد میں ہارمونی ہیلتھ اینڈ

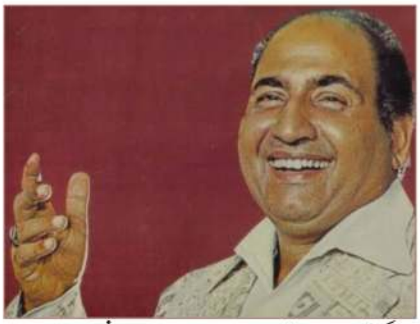

ایجوکیشن فاؤنڈیشن کے زیراہتمام 'یاد رفیع' کے عنوان سے سماجی ہم آہنگی سے بھرپور پروگرام لودھی روڈ واقع انڈیا اسلامک کلچرل سینٹر میں منعقد ہوا۔ یہ تقریب نہ صرف موسیقی کے شائقین کے لیے یادگار ثابت ہوئی بلکہ قومی یکجہتی اور بھائی چارے کا مضبوط پیغام بھی دیا گیا۔ پروگرام کی صدارت فیس گروپ کے چیئرمین ڈاکٹر مشتاق انصاری نے کی، جبکہ دہلی پولیس کے ایڈیشن کمشنر راجندر سنگھ ساگر مہمان خصوصی کی حیثیت سے موجود تھے۔ فاؤنڈیشن کی صدر شبانہ عظیم اور فیس گروپ کے منیجر ڈاکٹر بلال انصاری کی قیادت میں منعقد اس تقریب میں کئی ممتاز شخصیات نے بطور وی آئی پی مہمان شرکت کی۔ اس شام کی خاص بات بالی ووڈ کی معروف پلے بیک سنگر ریکھا راج اور اروشی اروڑا کی شاندار پرفارمنس رہی۔ دونوں فنکاراؤں نے محمد رفیع کے لازوال نغمات کو اپنی سریلی آواز میں پیش

کر کے سامعین کو مسحور کیا۔ تقریب کے دوران سماج اور مختلف شعبہ ہائے زندگی میں نمایاں خدمات انجام دینے والی شخصیات کو نیشنل ہارمونی یونٹی ایوارڈ 2026 سے نوازا گیا۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 7 جنوری 2026

اترپردیش

مجموعہ اقلیم سخن کا اجرا

لکھنؤ: ادارۂ وارث کعبہ کی جانب سے مولائے کائنات حضرت علی علیہ السلام کے یوم ولادت کے پرمسرت موقع پر کل ہند محفل مقاصدہ کا انعقاد کیا گیا،

جس میں مقامی شعرائے کرام کے علاوہ مختلف شہروں سے تشریف لائے ہوئے شعرائے کرام نے منظوم نذرانۂ عقیدت پیش کیا۔ محفل میں جناب حسن یعقوب صاحب نے جرار اکبرآبادی کی شخصیت اور ان کے فن پر بصیرت افروز تقریر کی اور جرار اکبرآبادی کی گل پوشی کی گئی۔ حسن یعقوب صاحب نے بتایا کہ جرار اکبرآبادی کا پہلا مجموعۂ کلام 1974 میں شائع ہوا تھا۔ اس کے بعد ان کے پانچ مجموعے اور منظر عام پر آئے۔ اقلیم سخن ان کا ساتواں مجموعہ ہے۔ محفل میں عالی جناب یوسف صائح نے جرار صاحب کو بطور تحفہ شال اُڑھائی اور غنچۂ مظلومیہ لکھنؤ نے ان کی خدمت میں سپاس نامہ پیش کیا۔ اس کے بعد علما اور شعرا حضرات نے جرار اکبرآبادی کو تہہ دل سے مبارکباد دی۔ یہ اطلاع انجمن غنچۂ مظلومیہ کے صاحب بیاض آل رضا نے دی ہے۔

روزنامہ 'صحافت' دہلی، 7 جنوری 2026

یوم تاسیس پر ثقافتی پروگرام

سنبھل: فیض گرلز انٹر کالج کی سالانہ تقریب میں طالبات نے ثقافتی پروگرام پیش کیے۔ پروگرام کی ابتدا میں مقررین نے تعلیم کی اہمیت پر اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ تعلیم کے بغیر انسان کسی بھی

میدان میں اپنے مقصد کی حصولیابی میں کامیاب نہیں ہوسکتا بالخصوص لڑکیوں کی تعلیم و تربیت پر والدین کو توجہ دینی چاہیے کیوں کہ لڑکی اگر تعلیم یافتہ ہے تو وہ اپنی نسل کو تعلیم سے آراستہ کرتی ہے جو والدین بچیوں کی تعلیم کو نظر انداز کرتے ہیں یا پھر انھیں اہمیت نہیں دیتے انھیں اس طرف اپنی توجہ مبذول کرنی چاہیے۔ انھوں نے کہا کہ غفور سلامی نے سرائے ترین میں لڑکیوں کی تعلیم کو سنجیدگی سے لیا اور ان کے لیے ایک کالج کا اہتمام کیا جو اپنی خدمات انجام دے رہا ہے۔ اس سالانہ تقریب میں سنبھل شہر کی ممتاز و معروف شخصیت ادیب و شاعر سید حسین افسر نے اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ غفور سلامی نہایت شریف اور ملنسار انسان تھے۔ انھوں نے لڑکیوں کے لیے جو کام کیا ہے وہ اپنی نوعیت کا منفرد کام ہے جس کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ عبدالغفور سلامی ڈے پر طلبہ نے ثقافتی پروگرام پیش کیے، ماہرین تعلیم نے انھیں یاد کیا۔

پروگرام کے مہمان خصوصی ایم جی ایم کالج کے پرنسپل پروفیسر یوگیندر سنگھ نے طلبہ سے خطاب کرتے ہوئے کہا کہ تعلیم کے ساتھ ساتھ ثقافتی سرگرمیاں طلبہ کی ہمہ جہت ترقی کے لیے ضروری ہیں۔ انھوں نے اسکول کی ترقی اور نظم و ضبط کی تعریف کی۔ اس موقع پر طلبہ نے قوالی، حب الوطنی کے گیتوں اور ایکشن گیتوں کی شاندار پرفارمنس دی۔ اس پروقار تقریب کے اختتام پر مہمان خصوصی نے نمایاں پوزیشن حاصل کرنے والے طلبہ کو انعامات سے نوازا۔ منیجر کلیم اشرف نے تمام مہمانوں کا شکریہ ادا کیا۔ آخر میں پرنسپل جہاں آرا تبسم نے اظہار تشکر پیش کیا۔ پروگرام کی نظامت عالیہ اور رشدہ نے کی اور صدارت سید حسین افسر نے کی۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 15 جنوری، 2026

مصنوعی ذہانت: معیشت کی مستقبل اساس بنیاد

لکھنؤ: خواجہ معین الدین چشتی لینگویج یونیورسٹی کے مولانا ابوالکلام آزاد اکادمی بلڈنگ کے اٹل ہال میں ''بلڈنگ دی فیوچر: اسٹارٹ اپ سپورٹ اینڈ اے آئی انوویشن'' کے عنوان سے ایک اہم پروگرام کا انعقاد کیا گیا۔ اس پروگرام کے بنیادی مقاصد اور اس کے موضوع کی اہمیت اور معنی خیزیت پر گفتگو کرتے ہوئے پروفیسر تنویر خدیجہ نے کہا کہ آج کا دور تیز رفتار تکنیکی

تبدیلیوں، ڈیجیٹل انقلاب اور علم مبنی معیشت کا دور ہے، جہاں اسٹارٹ اپ کلچر اور مصنوعی ذہانت نہ صرف معاشی ترقی بلکہ سماجی تبدیلی کا بھی اہم ذریعہ بن چکے ہیں۔ اس لیے طلبہ کو اس بدلتی ہوئی علم کی دنیا سے واقف ہونا بہت ضروری ہے اور یہی ضرورت اس پروگرام کے انعقاد کا بنیادی سبب ہے۔ نرپن بھٹ نے اپنے صدارتی خطاب میں کہا کہ آج کے بدلتے ہوئے عالمی منظرنامے میں یونیورسٹیوں کا کردار محض نصابی تعلیم تک محدود نہیں رہا بلکہ اب تعلیمی اداروں پر یہ ذمہ داری عائد ہوتی ہے کہ وہ طلبہ کو اختراع، تحقیق، ٹیکنالوجی اور عملی مہارتوں سے ہم آہنگ کریں۔ پروگرام کے اہم مقرر مسٹر وسو کرشنا نے مصنوعی ذہانت، مشین لرننگ اور اسٹارٹ اپ سپورٹ سسٹم پر تفصیلی گفتگو کرتے ہوئے کہا کہ مصنوعی ذہانت محض ایک جدید ٹیکنالوجی نہیں بلکہ مستقبل کی معیشت کی ریڑھ کی ہڈی ہے، جو عالمی سطح پر کام کرنے کے طریقوں، کاروباری ماڈلز اور فیصلہ سازی کے نظام کو یکسر تبدیل کر رہی ہے۔ انہوں نے کہا کہ آج کے دور میں اے آئی اور مشین لرننگ کے بغیر کسی بھی صنعت یا ادارے کی ترقی کا تصور ممکن نہیں رہا۔ اس موقع پر ع پروفیسر سید حیدر علی نے بھی موضوع کے تعلق سے اظہار خیال کیا۔

روزنامہ 'صحافت' دہلی، 9 جنوری 2026

ڈاکٹر معراج الدین احمد میموریل لیکچر کا اہتمام

میرٹھ: ''مذہب ہمیں ایک دوسرے سے نفرت کرنا نہیں سکھاتا'' علامہ اقبال کی نظم کی ایک سطر ہے جو قومی اتحاد کا پیغام دیتی ہے۔ علامہ اقبال کی شاعری میں قومی یکجہتی اور ہندوستان کی خوبصورتی کو بہتر انداز میں دکھایا

گیا ہے۔ اسی طرح ابن خلدون اپنی کتاب ''مقدمہ ابن خلدون'' میں سماجی انصاف اور مساوات کے اہم تصورات پیش کرتا ہے۔ بہتر سماجی اقدار کے لیے ہم اس کتاب سے بہت فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔ یہ باتیں معروف اسکالر پروفیسر ابوسفیان اصلاحی نے کہیں، جو چودھری چرن سنگھ یونیورسٹی کے شعبہ اردو اور سیف فاؤنڈیشن کے اشتراک سے منعقدہ پہلے ڈاکٹر معراج الدین احمد میموریل لیکچر ''سماجی انصاف اور مساوات'' میں کلیدی خطبہ دے رہے تھے۔ انھوں نے مزید کہا کہ ہندوستان کے بارے میں سرسید کے الفاظ ان کے اس بیان سے بھی عیاں ہیں: ہندوستان دو آنکھوں والی خوبصورت دلہن کی طرح ہے۔ اس نے ایک آنکھ کو ہندو اور دوسری کو مسلمان قرار دیا۔ معراج صاحب کو ادب کے ساتھ ساتھ انسانیت سے بھی پیار تھا۔ پروگرام کا آغاز مولانا انیس الرحمٰن قاسمی کی تلاوت کلام پاک سے ہوا۔ اس کے بعد تمام مہمانوں کا پھولوں سے استقبال کیا گیا۔ تقریب کی صدارت پروفیسر اسلم جمشید پوری نے کی۔ کلیدی خطبہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے پروفیسر ابوسفیان اصلاحی نے دیا۔ خطبہ استقبالیہ ڈاکٹر شاداب علیم اور عامرہ احمد نے پیش کیا جبکہ پروگرام کی نظامت ڈاکٹر آفاق احمد خان نے کی اور کلمات تشکر بدر محمود نے ادا کیے۔ پروگرام کے دوران ڈاکٹر معراج الدین احمد پر مبنی ایک مختصر فلم بھی دکھائی گئی۔

روزنامہ 'ہمارا سماج' دہلی، 11 جنوری 2026

نور دیوبندی کی کتابوں کا اجرا

دیوبند: اللہ تعالیٰ نے انسان کو بڑی خصوصیات اور کمالات سے نوازا ہے، پھر ان میں جو اہل حق، اہل دل اور اہل تجربہ ہوتے ہیں اللہ تعالیٰ ان سے علمی خدمات

لینے کے لیے انھیں مزید نعمتوں سے سرفراز کرتے ہیں۔ ان خیالات کا اظہار جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی کے پروفیسر ڈاکٹر اولیس صدیقی نے نور دیوبندی کی مرتب کردہ عقل کی کنجی، اسلاف کے سنہرے اقوال، دلکش نظمیں اور پھلجھڑیاں کتابوں کے اجرا کے موقع پر کیا۔ انھوں نے کہا کہ نور دیوبندی نے بڑوں کے اقوال کو بڑی محنت سے یکجا کیا ہے اور افادۂ عام کے لیے ان کو کتابی شکل میں شائع کیا ہے۔ یقیناً یہ نسل نو کے لیے بہترین تحفہ ہے۔ پروگرام سے خطاب کرتے ہوئے شاعر افضل منگلوری نے کہا رب کائنات نے انسان کی ہدایت کے لیے لاتعداد طریقے اختیار کیے ہیں جن میں علما کے اقوال ہیں۔ انھوں نے کہا کہ ماضی کے دریچوں سے ہی مستقبل کے راستوں کو روشنی ملتی ہے۔ انھوں نے دل کش نظموں کی ترتیب پر خوشی کا اظہار کیا۔ اس موقع پر نور دیوبندی نے مہمانوں کا شکریہ ادا کیا۔

روزنامہ 'صحافت' دہلی 11 جنوری 2026

بہار

مخمور سعیدی پر ادبی نشست

بھاگل پور: انجمن باغ و بہار، بھاگل پور کے زیر اہتمام مخمور سعیدی کے یوم پیدائش پر فیض احمد کی صدارت میں ایک ادبی نشست کا انعقاد کیا گیا۔ اس موقع پر انجمن کے جنرل سکریٹری ڈاکٹر محمد پرویز نے کہا کہ

ساہتیہ اکادمی ایوارڈ یافتہ مخمور سعیدی جدید اردو شاعری کی سب سے ممتاز اور معتبر آواز ہے۔ وہ ہندو پاک کے صف اول کے شاعر ہونے کے علاوہ نثر نگار اور نقاد مدیر بھی تھے۔ ان کی شاعری میں ہندوستانی تہذیب وروایت کا عنصر ملتا ہے۔ والد کا نام احمد خاں نازش تھا جو شاعر بھی تھے۔ 31 دسمبر 1934 ٹونک، راجستھان میں پیدا ہوئے اور وفات مارچ 2010 ٹونک میں۔ انھوں نے آگرہ یونیورسٹی سے ایم اے کیا۔ ان کی شعری تصانیف میں گفتنی، سیہ سفید، آواز کا جسم، سب رنگ، واحد متکلم، آتے جاتے لمحوں کی صدا، بانس کے جنگلوں سے گزرتی ہوا، دیوار ودر کے درمیان، عمر گزشتہ کا حساب، راستا اور میں، پیڑ گرتا ہوا (ہندی رسم الخط میں) اور نثری تصانیف میں بازید (مضامین)، ساحر لدھیانوی ایک مطالعہ، بسمل سعیدی، شخص وشاعر، شیرازہ، گلدستہ، فراق گورکھپوری، اردو تھیٹر: کل اور آج، 1857 کی کہانی مرزا غالب کی زبانی، اردو کے ہندو مثنوی نگار، داغ دہلوی، شیخ ابراہیم ذوق مونوگراف وغیرہ اہم ہیں۔ انھیں کئی ایوارڈ بھی ملے، بیگم اختر غزل ایوارڈ، غالب ایوارڈ، ساہتیہ اکادمی ایوارڈ (راستہ اور میں کے لیے وغیرہ اہم ہیں۔ محمد نصر عالم، کاشف نعیم، اکمل نشاط، محمد چاند، صبیحہ کوثر نے اپنے اپنے خیالات کا اظہار کیا۔

روزنامہ 'ہمارا سماج' دہلی، 1 جنوری 2026

جمیل مظہری پر پروگرام

بھاگل پور: انجمن باغ و بہار، بھاگل پور کے زیر اہتمام محمد فیض انصاری کی صدارت میں جمیل مظہری کے یوم پیدائش پر ایک ادبی نشست منعقد کی گئی۔ اس موقع پر انجمن کے جنرل سکریٹری ڈاکٹر محمد پرویز نے

جمیل مظہری کے حیات وفن پر روشنی ڈالتے ہوئے کہا کہ اردو ادب کی تاریخ میں جمیل مظہری کا خاص مقام ہے۔ وہ بیک وقت غزل گو، نظم نگار، مثنوی نگار، رباعی گو، نغمہ نگار، مرثیہ گو، قصیدہ گو، سلام گو، افسانہ نگار، ناولٹ نگار، انشائیہ نگار، صحافی، مدیر وغیرہ تھے۔ ان کی تخلیقات اپنے دامن میں موضوع کی رنگا رنگی کو سمیٹے ہوئے ہے۔ ان کے یہاں مرثیہ صرف ماتم ہی نہیں بلکہ اصلاح قوم کا ایک ذریعہ اور ایک وسیلہ ہے۔ ان کا اصل نام میر کاظم علی قلمی نام جمیل مظہری اور تخلص جمیل تھا ان کی پیدائش 1 جنوری 1905 کو مغل پورہ عظیم آباد میں ہوئی اور وفات جولائی 1980 میں۔ کلکتہ یونیورسٹی سے فارسی میں ایم۔اے کیا۔ انھوں نے ابتدا میں اپنے والد سے شاعری میں اصلاح لی اور کلکتہ جانے کے بعد رضا علی وحشت کو استاد بنایا۔ انھوں نے اپنی ادبی زندگی کا آغاز صحافت سے کیا اور روزنامہ الہند کلکتہ میں مدیر

ہوئے۔ روز نامہ عصر جدید سے منسلک ہو گئے۔ ان کی پہلی تخلیق 'حور کا خیر مقدم' جو ایک طویل نظم ہے ماہنامہ حور کلکتہ ستمبر 1923 میں شائع ہوئی۔ وہ 1950 سے 1960 تک پٹنہ یونیورسٹی میں پروفیسر رہے۔ ان کی تصانیف میں فکر جمیل، نقش جمیل، وجدان جمیل، عرفان جمیل، مثنوی آب وسراب، عکس جمیل، آثار جمیل، شکست وفتح (طویل مختصر افسانہ) وغیرہ اہم ہیں۔ ان کی مشہور نظموں میں بھوک لگی ہے بھوک، ڈرو خدا سے ڈرو، حسینوں کی عید، عشق ناتمام، یہ کیا ہوا تم کو، دوشیزہ، بنگالہ، کہتے ہیں اسی کو کیا محبت، مزدور کی بانسری سے، جشن آزادی، بھارت ماتا، شاعر کی تمنا، فاصلے، اردو زبان، بلندی کے مسافر، اعتراف، مسافر، کنگال نہ بن، غریبوں کی عید، آدمی کہاں جائے، فسانۂ آدم وغیرہ اہم ہیں۔ اس موقع پر نشست میں شامل محمد فیض انصاری، صبیحہ کوثر، کاشف نعیم، اکمل نشاط، محمد نصر عالم وغیرہ نے جمیل مظہری کے حیات وفن پر اپنے اپنے خیالات کا اظہار کیا۔

روز نامہ 'ہمارا سماج'، دہلی، 2 جنوری 2026

شاد عظیم آبادی کی حیثیت اردو ادب میں باغ وبہار کی ہے

بھاگل پور: انجمن باغ وبہار، برہ پورہ، بھاگل پور کے زیر اہتمام مدھے پورہ میں پروفیسر محمد احسان (صدر شعبۂ اردو بی۔این۔منڈل یونیورسٹی) کی

صدارت میں شاد عظیم آبادی کے یوم وفات پر ایک ادبی تعزیتی نشست کا انعقاد کیا گیا۔ اس موقع پر انجمن کے جنرل سکریٹری ڈاکٹر محمد پرویز نے شاد عظیم آبادی کی حیات وادبی کارنامے کی روشنی میں کہا کہ کھلونے سے کھیلنے والا شاعر خان بہادر شاد عظیم آبادی اردو ادب کی تاریخ کا ایک روشن مینار ہے۔ جب ہم میر، سودا، غالب، مومن کا ذکر کرتے ہیں تو شاد عظیم آبادی کا بھی ذکر کرتے ہیں۔ وہ بیک وقت غزل گو، قصیدہ گو، مرثیہ نگار، مثنوی نگار، رباعی گو، قطعہ گو، سوانح نگار، ناقد، مکتوب نگار، ناول نگار اور محقق تھے۔ ان کی غزلیں سادگی، ترنم، شیرینی، کیف وسرور اور تازگی کی عمدہ مثال ہے۔ انھوں نے لگ بھگ بارہ سو غزلیں، سات سو کے قریب رباعیات اور 48 مرثیے لکھے۔ ان کی تصانیف کی تعداد لگ بھگ ساٹھ ہے۔ اس موقع پر پروفیسر محمد احسان نے کہا کہ شاعری کی کوئی صنف ایسی نہیں جس کو شاد عظیم آبادی نے اظہار خیال کا ذریعہ نہیں بنایا ہو لیکن ان کی شخصیت کا اصل جوہر جو ہر غزلوں میں کھلتا ہے، انھوں نے شاد عظیم آبادی کے چند مشہور اشعار بھی سنائے۔ ڈاکٹر شبنم پروین نے کہا کہ شاد عظیم آبادی اپنے آپ میں ایک دبستان تھے۔ ڈاکٹر نور اشرف نے کہا شاد عظیم آبادی کی شاعری میں سوز وگداز کا عنصر بہت زیادہ ہے۔ ان کے علاوہ ماہرین نے ان کی حیات وفن سے متعلق اپنے اپنے خیالات کا اظہار کیا۔

روز نامہ 'ہمارا سماج'، دہلی، 8 جنوری 2026

حیدرآباد

اردو یونیورسٹی میں سہ روزہ فلم فیسٹول کا آغاز

فلم فیسٹول کا مقصد دنیا کی مختلف تہذیبوں اور خود ہمارے ملک کی مختلف ریاستوں کو قریب لانا، ان کے بارے میں جاننا اور ان کا احترام کرنا ہے۔ ان

خیالات کا اظہار ڈائرکٹر کلچر سنیما فلم فیسٹول (C2F2) و Kids Cinema جناب پروین نگڈا نے کیا۔ وہ آج مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی میں انسٹرکشنل میڈیا کے تعاون سے منعقدہ خصوصی فلم فیسٹول میں بحیثیت مہمان اعزازی خطاب کر رہے تھے۔ فیسٹول کے افتتاحی اجلاس میں مانو ماڈل اسکول، فلک نما، حیدرآباد کے طلبہ کو خصوصی طور پر مدعو کیا گیا تھا۔ جناب پروین نگڈا نے بتایا کہ اس طرح کے فلم فیسٹول کا خیال انھیں لاک ڈاؤن کے دوران آیا تھا۔ انھوں نے بچوں کے سنیما کو فروغ دینے اور فلم کے ذریعے ثقافتی تبادلے کو فروغ دینے اور فلم کے لیے اردو یونیورسٹی کے عزم کی تعریف کی۔ انھوں نے نوجوان سامعین کو معیاری بین الاقوامی سنیما فراہم کرنے کی اہمیت کو اجاگر کیا جو تخلیقی صلاحیتوں اور عالمی بیداری کی حوصلہ افزائی کرتا ہے۔ رجسٹرار مانو پروفیسر اشتیاق احمد نے فلم فیسٹول پر اظہار خیال کرتے ہوئے کہا کہ فلم پر مبنی تعلیم طلبہ میں تخیل، ہمدردی اور تنقیدی سوچ کو پروان چڑھانے میں اہم کردار ادا کرتی ہے۔

ڈائرکٹر انسٹرکشنل میڈیا سنٹر رضوان احمد نے میڈیا، تعلیم اور تخلیقی صلاحیتوں کو مربوط کرنے میں IMC کے وژن اور مسلسل کوششوں کو اجاگر کیا۔ انھوں نے ایک علمی اور تدریسی ذریعے کے طور پر سنیما کی بڑھتی ہوئی اہمیت پر زور دیتے ہوئے کہا کہ فلمیں نہ صرف تفریح فراہم کرتی ہے بلکہ طالبان علم کے عالمی نظریے کو حساس اور وسیع کرتی ہے۔ اس موقع پر یونیورسٹی کے کیلنڈر 2026 کا رسم اجرا عمل میں آیا۔

روز نامہ 'ہمارا سماج'، دہلی، 2 جنوری 2026

دو روزہ قومی کانفرنس

مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی (MANUU) کالج آف ٹیچر ایجوکیشن، نوح کے زیر اہتمام "قومی تعلیمی پالیسی 2020 اور کثیر لسانیت: اساتذہ کی تعلیم

میں معیاری اصلاحی تبدیلی" کے موضوع پر منعقدہ دو روزہ قومی کانفرنس 7 تا 8 نومبر نہایت کامیابی کے ساتھ اختتام پذیر ہوئی۔ یہ کانفرنس نوح جیسے تعلیمی طور پر ترقی پذیر خطے میں ایک علمی سنگِ میل کی حیثیت رکھتی ہے، جس میں ملک کی مختلف یونیورسٹیوں سے ممتاز ماہرینِ تعلیم، اساتذہ، محققین اور طلبہ نے بھرپور شرکت کی۔ افتتاحی اجلاس کا آغاز 7 نومبر کو ہوا جس کے مہمانِ خصوصی پروفیسر ایم۔ افشار عالم، وائس چانسلر، جامعہ ہمدرد نئی دہلی تھے۔ انہوں نے اپنے پرمغز خطاب میں کہا کہ "ہندوستان زبانوں کا گہوارہ ہے اور اسی تنوع میں قومی وحدت کی روح پوشیدہ ہے۔" انہوں نے طلبہ کو مشورہ دیا کہ وہ ٹکنالوجی کو استاد کے متبادل کے طور پر نہیں بلکہ ایک مؤثر معاون کے طور پر استعمال کریں۔

ان کے مطابق قومی تعلیمی پالیسی 2020 کی کامیابی ایک جامع نصاب، مضبوط تعلیمی نظام اور کمیونٹی سے گہرے اشتراک کے بغیر ممکن نہیں۔ اجلاس کی صدارت پروفیسر سید عین الحسن، وائس چانسلر، MANUU نے کی۔ انہوں نے اپنے صدارتی کلمات میں کہا کہ ''تعلیم کا مقصد محض علمی حصول نہیں بلکہ اس کا عملی اطلاق ہے۔'' انہوں نے کثیر لسانیت کے تناظر میں ہندوستان کی قدیم اور کلاسیکی زبانوں کی اہمیت پر روشنی ڈالتے ہوئے بتایا کہ زبان صرف اظہار کا ذریعہ نہیں بلکہ تہذیبی ورثے اور فکری وسعت کا نشان ہے۔ مہمانانِ اعزازی میں ڈاکٹر اختر پرویز (یونیورسٹی لائبریرین، جامعہ ہمدرد) اور پروفیسر ونجا ایم (ڈین، اسکول آف ایجوکیشن اینڈ ٹریننگ، MANUU) نے بھی اہم نکات پیش کیے۔ پروفیسر ونجا ایم نے کہا کہ مانو کے طلبہ فطری طور پر ملٹی لنگول ہیں اور آج مصنوعی ذہانت زبانوں کی تفہیم میں نئی راہیں ہموار کر رہی ہے۔ استقبالیہ کلمات کانفرنس کے کنوینز اور کالج کے پرنسپل پروفیسر ریاض احمد نے پیش کیے، جنہوں نے اس کانفرنس کو نوح کی علمی تاریخ کا اہم باب قرار دیا۔ پروفیسر انصارالحسن نے کانفرنس کی تفصیلات بیان کیں، جن کے مطابق 140 شرکاء نے مقالے پیش کرنے کے لیے رجسٹریشن کرایا اور بڑی تعداد میں اسپاٹ رجسٹریشن بھی موصول ہوئے۔ نظامت کے فرائض ڈاکٹر محمد طارق نے انجام دیے جبکہ شکریہ کی رسم محترمہ روچیکا کیم نے ادا کی۔

دوسرے دن کا آغاز پینل ڈسکشن سے ہوا، جس کی صدارت پروفیسر ریاض احمد نے کی۔ انہوں نے کثیر لسانیت کو تعلیمی ہم آہنگی اور قومی تعلیمی پالیسی کی اصل روح قرار دیا۔ ان کے مطابق زبان شخصیت سازی کا بنیادی ذریعہ ہے۔ پروفیسر جسیم احمد (جامعہ ملیہ اسلامیہ) نے'' Language Across Curriculum'' پر گفتگو کرتے ہوئے کہا کہ زبان تمام مضامین کی بنیاد ہے اور "انٹر جائز ڈ ٹیکسٹ" کے ذریعے طلبہ کی تنقیدی اور تخلیقی صلاحیتوں کو فروغ دیا جا سکتا ہے۔ انہوں نے کہا کہ "تعلیم میں اصلاحات تب ہی کامیاب ہوں گی جب طلبہ اپنی خواہش اور علمی لیاقت و دلچسپی سے تعلیمی اداروں کا انتخاب کریں، نہ کہ مجبوری کے تحت۔" پروفیسر الطاف انجم (کشمیر یونیورسٹی) نے کہا کہ زبان تہذیبی شناخت ہے اور زبان کی قدر کیے بغیر ترقی ممکن نہیں۔ ڈاکٹر آفاق ندیم خان (جامعہ ملیہ اسلامیہ) نے تدریس میں زبان کے صحیح استعمال اور سیاق وسباق کی اہمیت پر تفصیلی روشنی ڈالی۔

مقالہ پیشی کے سیشن کی صدارت پروفیسر بلال رفیق شاہ (سی ٹی ای سری نگر) نے کی، جنہوں نے مقالات پر مدلل تبصرہ کرتے ہوئے کہا کہ "زبان کامیابی کا زینہ ہے اور ہر فرد کو نئی زبانیں سیکھنے کا شوق ہمیشہ برقرار رکھنا چاہیے" شریک صدر ڈاکٹر جرار احمد (مانو، حیدرآباد) نے ITEP کے طلبہ کی پیشہ ورانہ سمتوں پر گفتگو کرتے ہوئے کہا کہ انہیں تعلیم کے شعبے میں نئے مواقع تلاش کرتے ہوئے اپنی صلاحیتوں کو بہتر انداز میں منوانے کی ضرورت ہے۔

اختتامی اجلاس کے مہمانِ خصوصی پروفیسر اعجاز مسیح نے ہندوستانی آئین میں زبانوں کے تذکرے، بولیوں کے ارتقا اور ٹکنالوجی کے کردار پر سیر حاصل گفتگو کی۔ انہوں نے کہا کہ ہر ہندوستانی کو کثیر لسان ہونا چاہیے تاکہ وہ مختلف تہذیبوں کو بہتر طور پر سمجھ سکے۔

اختتامی اجلاس کی صدارت پروفیسر ونجا ایم نے کی، جنہوں نے اپنے صدارتی خطبے میں کہا کہ زبانوں کی کثرت کمزوری نہیں بلکہ ''علم، ثقافت اور ہم آہنگی کی علامت ہے''۔ انہوں نے سی ٹی ای نوح کے تعلیمی کردار کو سراہتے ہوئے کہا کہ یہ ادارہ میوات میں علمی روشنی پھیلانے میں نمایاں کردار ادا کر رہا ہے۔ انہوں نے اعلان کیا کہ کانفرنس میں پیش کیے گئے بہترین تحقیقی مقالات کو شائع کیا جائے گا تاکہ علمی دنیا ان سے استفادہ کر سکے۔ اپنے خطاب کے اختتام پر گیت "کبھی الوداع نہ کہنا" کے بول پیش کر کے محفل کو گرمجوشی سے بھر دیا۔ اختتامی اجلاس کے تعارفی کلمات پیش کرتے ہوئے پروفیسر ریاض احمد نے کہا کہ کثیر لسانیت طلبہ کی ذہنی اور ثقافتی وسعت کو بڑھاتی ہے، اور سماجی ہم آہنگی کا ذریعہ بنتی ہے۔ کانفرنس کے دوران آف لائن سرگرمیوں کے ساتھ ساتھ 8 آن لائن سیشنز کا بھی اہتمام کیا گیا، جن میں ملک کے مختلف حصوں سے وابستہ ممتاز ماہرینِ تعلیم اور محققین نے ورچوئل طور پر شرکت کی۔ کانفرنس کے دونوں دن آن لائن پلیٹ فارم کے ذریعے نہایت اچھے، معیاری اور تحقیقی اہمیت کے حامل مقالات پیش کیے گئے، جنہوں نے شرکاء کے علمی افق کو مزید وسعت بخشی۔ آن لائن مقالہ نگاران نے کثیر لسانیت، قومی تعلیمی پالیسی 2020، تدریسی جدت اور اساتذہ کی پیشہ ورانہ تربیت جیسے اہم موضوعات پر جامع اور مدلل گفتگو کی۔ ان سیشنز میں نہ صرف سوال و جواب کا مؤثر سلسلہ رہا بلکہ آن لائن اور آف لائن شرکاء کے درمیان علمی تبادلہ؟ خیال بھی دیکھنے میں آیا، جس سے کانفرنس کا دائرہ؟ اثر وسیع ہوا اور یہ اجلاس ایک ہمہ جہت اور کامیاب علمی سرگرمی کے طور پر سامنے آیا۔ اختتام پر بتایا گیا کہ کانفرنس کے دوران 120 تحقیقی مقالات پیش کیے گئے۔ شرکاء میں اسناد تقسیم کی گئیں۔ کانفرنس کی تفصیلی رپورٹ پروفیسر انصارالحسن نے پیش کی جبکہ شکریہ کے کلمات ڈاکٹر انل کمار نے ادا کیے۔ نظامت کے فرائض ڈاکٹر روبینہ خان نے انجام دیے۔ اس دوروز کانفرنس میں ماہرین، مندوبین، شہر اور اطراف کے معززین و معلمین کے علاوہ طلبہ اور ریسرچ اسکالرس کی بڑی تعداد موجود رہی۔

یہ دوروزہ قومی کانفرنس علمی مباحث، تحقیقی پیشکشوں اور کثیر لسانیت کے تناظر میں قومی تعلیمی پالیسی 2020 کے عملی تقاضوں کی طرف ایک اہم پیش رفت ثابت ہوئی۔ یہ نہ صرف نوح کے تعلیمی منظرنامے میں ایک خوش آئند اضافہ ہے، بلکہ MANUU کے اس عزم کی بھی عکاس ہے کہ علم، زبان اور تحقیق کے ذریعے ملک کے ہر حصے میں تعلیمی بیداری کو فروغ دیا جائے۔

کرناٹک

مجلس شعروادب گلبرگہ

گلبرگہ۔ مجلس شعروادب گلبرگہ کے زیراہتمام ڈاکٹر سید شاہ حسن نظامی سرمست برادر سجادہ نشین بارگاہ حضرت صوفی سرمستؒ سگر شریف موصوف محکمہ صحت گلبرگہ سینئر صحافی عزیزاللہ سرمست ایڈیٹر روزنامہ بہمنی نیوز گلبرگہ کے اعزاز میں آج بروز اتوار 4 جنوری 11.30 بجے دن حضرت خواجہ بندہ نوازؒ ایوان اردو انجمن ترقی اردو گلبرگہ میں تہنیتی تقریب کا نہایت کامیاب انعقاد عمل میں آیا۔ انجینئر ڈاکٹر سید سخی سرمست اعزازی صدر مجلس شعور ادب گلبرگہنے تہنیتی تقریب کی صدارت کی جبکہ حضرت سید شاہ خلیل اللہ حسینی برادر سجادہ نشین بارگاہ جلالیہ گلسرم شریف نے نگرانی فرمائی۔ انجینئر قاضی عبدالحیط صدرادارہ ادب اسلامی ہند گلبرگہ سید نثار احمد وزیر موظف

تحصیلدار گلبرگہ محمد منہاج الدین موظف ایڈمنسٹریٹو آفیسر گورنمنٹ جنرل اسپتال گلبرگہ نے مہمانان خصوصی کی حیثیت سے شرکت کی۔ سید نثار احمد وزیر نے اظہار خیال کرتے ہوئے ڈاکٹر سید شاہ حسن نظامی سرمست کی خدمات کو بھرپور خراج تحسین پیش کیا۔ انجینئر قاضی عبدالمحیط نے کہا کہ سید شاہ حسن نظامی سرمست کی خاموش خدمات کو سراہتے ہوئے انھیں اعزازی ڈاکٹریٹ دی گئی ہے یقیناً یہ بہت بڑا اعزاز ہے۔ محمد منہاج الدین نے سید شاہ حسن نظامی سرمست سے اپنے 45 سالہ دیرینہ روابط کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ حسن نظامی سرمست نے ہمیشہ ناانصافی کے خلاف آواز بلند کی اور حصول انصاف کے لیے انھوں نے ضلع کی عدالت سے سپریم کورٹ تک قانونی جدوجہد کی۔ سینئر صحافی عزیز اللہ سرمست نے کہا کہ سید شاہ حسن نظامی سرمست کو اعزازی ڈاکٹریٹ کا حاصل ہونا یقیناً خانوادہ حضرت صوفی سرمستؒ کے لیے بہت بڑے اعزاز کی بات ہے۔ سید شاہ حسن نظامی سرمست نے اپنی ملازمت کے دوران پیش آئے کئی یادگار واقعات کا ذکر کیا۔ انجینئر ڈاکٹر سید سخی سرمست نے صدارتی تقریر میں کہا کہ ان کے برادر اکبر سید شاہ حسن نظامی سرمست نے سرکاری خدمات کے ساتھ ساتھ انسانی فلاح وبہبود اور امداد کے شعبوں میں بھی مثالی خدمات انجام دی ہیں۔

روزنامہ 'ہمارا سماج'، دہلی، 6 جنوری 2026

رسم اجرا

جمال صابری کے شعری مجموعے 'جمالیات' کی رسم اجرا

نئی دہلی: انڈیا اسلامک کلچرل سنٹر نئی دہلی میں شاعر جمال صابری مرحوم کے شعری مجموعے 'جمالیات' کی رسم اجرا انجام پائی۔ اس تقریب کی صدارت سابق مرکزی وزیر، کانگریس کے سینئر لیڈر اور اسلامک کلچرل سنٹر کے چیئرمین سلمان خورشید نے کی جبکہ مہمان

خصوصی کی حیثیت سے خواجہ محمد شاہد، پروفیسر خالد محمود، پروفیسر شہپر رسول، پروفیسر فاروق بخشی، چندر بھان خیال اور مہر عالم نے شرکت کی۔ نظامت معروف براڈ کاسٹر پرویز عالم (بی بی سی) نے کی۔ پروفیسر خالد محمود نے کہا کہ جمال صابری ایک کہنہ مشق اور جہاں دیدہ شاعر تھے۔ انھوں نے ادب کی بیشتر اصناف میں معیار کی یکساں بلندی کے ساتھ اشعار کہے ہیں۔ غزل گوئی ان کا خاص میدان تھا، ان کے اشعار میں ماضی کی گونج اور آج کی آواز کو بخوبی محسوس کیا جاسکتا ہے۔

روزنامہ 'انقلاب'، دہلی، 11 جنوری 2026

4 نئی کتابوں کا اجرا

نئی دہلی: عالمی کتاب میلہ 2026 کے موقع پر پرگتی میدان میں واقع ایم آر پبلی کیشنز، نئی دہلی کے اسٹال پر آج تقریب رسم رونمائی منعقد ہوئی، جس میں اردو زبان وادب سے متعلق 4 نئی کتابوں کو منظر عام پر لایا

گیا۔ اس موقع پر محقق اور افسانہ نگار ڈاکٹر مرزا حامد بیگ کی تحقیقی کتاب 'انارکلی کی حقیقت اور دوسری تحریریں'، پروفیسر مظہر احمد کی مرتبہ تصنیف 'مرزا فرحت اللہ بیگ کے تین اہم مضامین'، ڈاکٹر محمد شاہد (ڈی لٹ، ہندی) کی تحقیقی کاوش 'ہندی صوفی کاویہ پر قرآن مجید کا پربھاؤ' (ہندی) اور افسانہ نگار واسکالر رابعہ الربا کا افسانوی مجموعہ 'جگنوؤں کے دیس میں' کی رسم اجرا عمل میں آئی۔ کتابوں کی رسم رونمائی پدم شری پروفیسر اختر الواسع، پروفیسر ریاض عمر، پروفیسر ارتضیٰ کریم، پروفیسر فاروق بخشی، پروفیسر احمد محفوظ، پروفیسر اخلاق آہن، معصوم مرادآبادی، دانش اقبال اور دیگر معزز شخصیات کے ہاتھوں انجام پائی۔ اس موقع پر اظہار خیال کرتے ہوئے پروفیسر اختر الواسع نے ایم آر پبلی کیشنز کے بانی عبدالصمد دہلوی کی ادبی واشاعتی خدمات کو سراہتے ہوئے ادارے کے 27 سالہ کامیاب سفر پر مبارکباد پیش کی۔ مقررین نے اس بات کی بھی نشاندہی کی کہ ایم آر پبلی کیشنز کی مطبوعہ کتابیں ہندوستان اور بیرون ملک کی متعدد لائبریریوں میں موجود ہیں، جن سے اساتذہ اور طلبہ بھرپور استفادہ کررہے ہیں۔ اس موقع پر اردو قارئین سے اپیل کی گئی کہ وہ عالمی کتاب میلے میں قومی اردو کونسل، اردو اکادمی دہلی اور ایم آر پبلی کیشنز کے اسٹالز سے زیادہ سے زیادہ اردو کتابیں خرید کر اردو دوستی کا عملی ثبوت دیں۔ اس تقریب میں دہلی یونیورسٹی، جامعہ ملیہ اسلامیہ، جواہر لال نہرو یونیورسٹی اور دہلی سے باہر کی مختلف یونیورسٹیوں کے اساتذہ نے بھی شرکت کی۔

روزنامہ 'انقلاب'، دہلی، 12 جنوری 2026

وفیات

پرواز رحمانی کے انتقال پر تعزیتی نشست

مرادآباد: امیر حلقہ جماعت اسلامی ہند یوپی مغرب، ضمیر الحسن خان فلاحی نے معروف صحافی جناب پرواز رحمانی کے انتقال پر گہرے رنج وغم کا اظہار کیا۔

اپنے تعزیتی پیغام میں انھوں نے کہا کہ پرواز رحمانی صاحب کا انتقال نہ صرف صحافت کے شعبے میں بلکہ مجموعی طور پر ملک وملت کے لیے ایک بڑا نقصان ہے۔ سہ روزہ دعوت کے مدیر کی حیثیت سے پرواز صاحب کی خدمات مثالی صحافت کا اعلیٰ نمونہ ہیں۔ صحافتی دیانت، فکری گہرائی ومتانت، جرأت وبے باکی اور اخلاص ودردمندی کی اعلیٰ قدروں کو اپنی اصول پسند صحافت میں انھوں نے جس طرح برتا وہ ہمیشہ صحافیوں کے لیے ایک نمونہ ہوگا۔ خاص طور پر سہ روزہ دعوت میں خبر ونظر کے کالم کے تحت شائع ہونے والے آپ کے مختصر مضامین نے اخبار کی مقبولیت اور تاثیر کے اضافے میں کلیدی رول ادا کیا۔ اپنی ان خوبیوں کے ذریعے انھوں نے بلند پایہ صحافیوں کی ایک پوری نسل کی تربیت کی۔ انھوں نے کہا کہ ہم مرحوم کے اہل خانہ، ساتھیوں اور قارئین سے دلی تعزیت کا اظہار کرتے ہیں۔

روزنامہ 'صحافت'، دہلی، 07 جنوری 2026

ڈاکٹر منظور عالم کا انتقال

نئی دہلی: ہندوستان کی معروف شخصیت اور مشہور ادارہ انسٹی ٹیوٹ آف آبجیکٹیو اسٹڈیز (آئی او ایس) کے بانی سرپرست اور سابق چیئرمین ڈاکٹر منظور عالم کو آج بعد نماز مغرب سیکڑوں سوگواروں کی موجودگی میں شاہین باغ قبرستان میں سپردخاک کردیا گیا۔

اس موقع پر جماعت اسلامی کے سید سعادت اللہ حسینی، جامعہ ہمدرد کے وائس چانسلر ڈاکٹر افشار عالم، سابق سفارت کار اور کانگریسی لیڈر میم افضل، ڈاکٹر قاسم رسول الیاس موجود تھے۔ ڈاکٹر منظور عالم کا آج علی الصبح دہلی کے ایک پرائیوٹ اسپتال میں انتقال ہوگیا۔ ان کی عمر تقریباً 80 برس تھی۔ ان کے بڑے بیٹے محمد عالم کے مطابق پسماندگان میں 5 بیٹے، 2 بیٹیاں اور اہلیہ ہیں۔ انھوں نے ملت کے مسائل حل کرنے کے لیے قاضی مجاہدالاسلام کے ساتھ ملی کونسل بھی قائم کی تھی جو اس وقت نمایاں مسلم تنظیموں میں سے ایک تھی۔ اس تنظیم کے توسط سے متعدد پروگرام کا انعقاد کیا گیا اور مسلمانوں میں سیاسی بیداری پیدا کرنے کی کوشش کی گئی۔ اس کے علاوہ انھوں نے 1986 میں سعودی عرب سے واپسی کے بعد مشہور آئی او ایس قائم کی، جس نے قلیل عرصے میں ملکی اور بین الاقوامی سطح پر شہرت حاصل کی۔ اس تنظیم نے تحقیق کے میدان میں نمایاں خدمات انجام دی ہیں اور اس کی متعدد مطبوعات سے رہنمائی حاصل کی جاسکتی ہے۔ ڈاکٹر منظور عالم نے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے تعلیم حاصل کی تھی اور وہیں سے انہوں نے معاشیات میں ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کی تھی۔ اس کے بعد سعودی عرب میں ایسوسی ایٹ پروفیسر کے علاوہ متعدد شعبوں میں خدمات انجام دیں۔ ان کے انتقال پر ملک کی متعدد تنظیمیں اور شخصیات نے گہرے رنج وغم کا اظہار کیا ہے۔ ڈاکٹر محمد منظور عالم کی پیدائش 9 اکتوبر 1945 کو بہار کے ضلع مدھوبنی کے ایک پسماندہ گاؤں رانی پور میں ہوئی تھی۔ ڈاکٹر منظور عالم نے اپنی پوری زندگی قوم وملت کی فلاح و بہبود اور سماجی اصلاح کے لیے وقف کر رکھی تھی۔ تعلیم، معاشیات اور علم وتحقیق کے میدان میں ان کی گراں قدر خدمات کو وسیع پیمانے پر تسلیم کیا جاتا ہے، جب کہ ان کی فکری وعلمی وراثت آنے والی نسلوں کے لیے مشعل راہ بنی رہے گی۔

روزنامہ 'صحافت' دہلی، 14 جنوری 2026

احمد وصی صاحب اسلوب نثر نگار اور سنجیدہ ادیب تھے

سیتاپور: معروف شاعر، فلمی نغمہ نگار اور ادیب احمد وصی کا اچانک انتقال ہوگیا۔ انھیں ایک دن قبل بخار آیا تھا جس کے بعد انھیں اسپتال میں داخل کیا گیا جہاں ان کی حالت بگڑتی چلی گئی اور آخر کار انھوں نے داعی اجل کو لبیک کہہ دیا۔

بزم اردو کے صدر اور سینئر شاعر مست حفیظ رحمانی نے احمد وصی کی اچانک رحلت پر گہرے رنج وغم کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ اردو ادب کے لیے یہ ایک سنجیدہ اور ناقابل تلافی نقصان ہے۔ احمد وصی ایک حساس شاعر، صاحب اسلوب نثر نگار اور سنجیدہ ادبی مزاج کے حامل ادیب تھے جنھوں نے اپنی تخلیقات کے ذریعے اردو زبان و ادب کو فکری گہرائی اور جمالیاتی وقار عطا کیا۔ وہ جذبات کی نمائش کے بجائے احساس کی تہذیب پر یقین رکھتے تھے، جس کی وجہ سے ان کا کلام دیرپا اثر رکھتا ہے۔ غزل ہو یا نظم انھوں نے روایت سے وابستگی رکھتے ہوئے جدید حسیت کو کامیابی سے سمویا۔ بزم کے نائب صدر مشہور فکشن نگار اور صحافی سہیل وحید نے اپنے جذبات کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ احمد وصی کا کردار محض تخلیق کار تک محدود نہیں تھا بلکہ وہ ایک سنجیدہ قاری، ناقد اور ادب دوست شخصیت بھی تھے۔ انھوں نے نئے لکھنے والوں کی حوصلہ افزائی کی اور ادبی اقدار کے تحفظ میں ہمیشہ متوازن اور باوقار رویہ اختیار کیا۔ ان کی تحریروں میں زبان کی شستگی اور بیان کی صفائی اردو کے کلاسیکی مزاج کی یاد دلاتی ہے۔ بزم کے کنوینر خوشتر رحمانی نے بھی احمد وصی کی رحلت پر افسوس اور رنج والم کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ اردو ادب ایک ایسی آواز سے محروم ہوگیا ہے جو شور کے بجائے سکوت میں بات کرتی تھی اور جس کی پہچان گہرائی، سنجیدگی اور فکری دیانت تھی۔ اگرچہ احمد وصی جسمانی طور پر اب ہم سب کے ساتھ موجود نہیں رہے، مگر ان کا ادبی سرمایہ اردو ادب میں ہمیشہ زندہ رہے گا اور آنے والی نسلوں کے لیے رہنمائی کا ذریعہ بنتا رہے گا۔ احمد وصی کو خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے ان کے لیے دعائے مغفرت کی گئی۔

روزنامہ 'آگ' لکھنؤ، 15 جنوری 2026

علامہ شمیم قریشی ابروی کا انتقال

دیوبند: شاعر شمیم قریشی ابروی کا منگلور میں واقع ان کی رہائش گاہ پر 93 سال کی عمر میں انتقال ہوگیا۔ ان کے انتقال کی خبر عام ہوتے ہی علاقہ میں غم کی لہر دوڑ گئی اور مرحوم کے گھر رشتہ داروں اور متعلقین

کا تانتا لگ گیا، شمیم قریشی اپنے زمانے کے مشہور و معروف شاعر ابر احسنی گنوری کے آخری شاگرد تھے، موصوف کے بیٹے محمد سرور نے بتایا کہ ان کے والد محترم مرحوم شمیم قریشی پروفیسر عنوان چشتی کے قریبی دوستوں میں تھے۔ والد مرحوم کی غزل قطعہ حمد ونعت کے علاوہ منقبت پر دسترس حاصل تھی۔ پروفیسر تنویر چشتی، سید وجاہت شاہ، کوثر کیرانوی، الف ناظم، عمران عظیم اور ساگر کھتولوی نے مشترکہ طور پر ان کے انتقال کو ادبی حلقوں کا بڑا نقصان بتاتے ہوئے کہا کہ مرحوم بڑی خوبیوں کے مالک تھے، اللہ تعالی نے انھیں بیک وقت بہت سارے کمالات سے سرفراز فرمایا تھا، وہ نہایت ذمہ دار انسان اور ادب نواز ہونے کے ساتھ ساتھ دینی شخصیت کے مالک انسان بھی تھے، اللہ تعالی ان کو جوار رحمت میں اعلیٰ مقام عطا فرمائے، ان کے درجات بلند فرمائے اور ان کے تمام پسماندگان کو صبر کی دولت سے مالا مال فرمائے۔ غالب رسول، دانش، قدسیہ انجم، تنویر گوہر، مولانا شمیم صابری، سید علی، حیدر زیدی، قاضی نظام الدین، محی الدین انصاری، ودود انصاری، ثمر انصاری، عبدالصمد انصاری، امجد عثمانی، ابرار منگلوری، سلیم فاروقی اور انجم افغانی نے بھی شمیم قریشی ابروی کے انتقال کو اردو ادب کا ناقابل تلافی نقصان قرار دیا ہے۔

روزنامہ 'اودھ نامہ' لکھنؤ 10 جنوری 2026

عالمی کتاب میلہ، نئی دہلی میں قومی اردو کونسل کے اسٹال پر منعقد ہونے والے پروگرام کے شرکا

उर्दू दुनिया, फरवरी–2026, वर्ष:28, अंक:02
URDU DUNIYA Monthly, February-2026, Vol.28, Issue:02
National Council for Promotion of Urdu Language
Ministry of Education, Department of Higher Education, Government of India

RNI NO. 70323/99
ISSN 2249 - 0639
Date of Publication:24/01/2026
Date of Dispatch : 25 & 26 of advance month
Total Pages:100

سوچھ بھارت
ایک قدم صفائی کی جانب

اردو زبان میں علم و آگہی کا معتبر ادبی جریدہ

قومی اردو کونسل کی منفرد پیشکش

اردو زبان و ادب سے متعلق اہم تنقیدی و تحقیقی موضوعات پر فکرانگیز اور تلاش و جستجو کو صحیح سمت دینے والے مواد کے ساتھ ہر تین ماہ بعد منظرِ عام پر آنے والا نہایت سنجیدہ علمی مجلّہ خود بھی پڑھیں اور دوسروں کو بھی پڑھنے کا مشورہ دیں!

ہندستانی خریداروں کے لیے سالانہ قیمت: 100 روپے، فی شمارہ: 25 روپے

بنام NCPUL اکاؤنٹ نمبر: A/C: 90092010045326، IFSC: CNRB0019009 میں جمع کریں۔

شعبۂ فروخت: قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان، ویسٹ بلاک 8، وِنگ 7، آر کے پورم، نئی دہلی–110066
فون: 011-26109746، فیکس: 011-26108159، E-mail : sales@ncpul.in

شاخ : 110-7-22، تھرڈ فلور، ساجد یار جنگ کمپلکس بلاک نمبر 5-1، پتھرگٹی، حیدرآباد-500002 فون: 24415194 - 040

(قومی اردو کونسل کی ویب سائٹ، http://www.urducouncil.nic.in پر بھی دستیاب)

Printed and Published by Dr. Md Shams Equbal, Director NCPUL, on behalf of National Council for Promotion of Urdu Language, and printed at Salasar Imaging Systems, A-97, Sector-58 Noida-201301(UP)
And Published at Farogh-E-Urdu Bhawan FC-33/9 institutional Area Jasola New Delhi-110025
LPC DELHI,DELHI PSO,DELHI RMS,DELHI-6